مقالاتِ جامعی

جلد پنجم

مرتبہ

ڈاکٹر محمد علی جنید

کرف

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش

کرف™:۲۰۲۱:kurf©2021
جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش۔
عنوان کتاب:مقالات جامعی:جلد پنجم۔
نوع:نقد و مقالات۔
قسم:برقیہ۔
مرتبہ، پیشکش و تہذیب:ڈاکٹر محمد علی جنید۔
صاحب نقد و تحریر:سید خالد جامعی۔
کلید:اسلام، کفر، اختلاف امت، دہشت گردی، بروشسکی زبان، کرونا، شاہ نواز فاروقی۔ اوریا مقبول جان، طارق جان، پیر نور قادری، قبلہ ایاز۔ ڈاکٹرمحمد علی جنید، سید خالد جامعی، مغربیت، جدیدیت، تکفیر، کرف، مقالات جامعی۔

یہ کتاب غیر تجارتی بنیادوں پرآن لاین مفت پیش کی جارہی ہے، قارئین، مطالعہ و حوالے اور متعلقہ تحقیق کے لئے غیر تجارتی پرنٹ آوٹ لینے کے مجاز تصور کئے جائینگے، مگر کاروباری بنیاد پر طباعت کے لئے ادارہ کی اجازت مطلوب ہوگی۔

کرف

www.facebook.com/kurf.ku
www.facebook.com/groups/kurfku
www.facebook.com/dr.majunaid
www.kurfku.blogspot.com

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش

عدد	فہرست	صفحہ عدد
۱	تمہید	۱
	حصہ اول:	۶
۲	مقالہ اول: بروشسکی زبان اور لغت	۷
۳	حوالہ جات	۶۳
۴	مقالہ دویم:دہشت گردی تاریخ اور تحقیق کی روشنی میں:	۶۶
۵	حوالہ جات:[1]	۱۸۰
۶	ضمیہ	۲۰۱
۷	مقالہ سویم:اختلاف امت کیسے ختم ہو؟	۲۰۴
۸	اُمت کا مسلک:اہل قبلہ میں کوئی کافر نہیں ۔	۲۲۱
	حصہ دویم:	۲۴۵
۹	مقالہ چھارم: وفاقی وزیر پیر نور الحق،قبلہ ایاز اور دیگر علما عوام کو کرونا سے ڈراتے رہے۔	۲۴۶
۱۰	مقالہ پنجم:نعاقب شاہ نواز فاروقی اول:پاکستانی مذہبی سیاسی جماعتوں کی جمہوری جدوجہد لاحاصل ہے؟ایک سوال:نقد:	۲۵۱
۱۱	مقالہ ششم:تعاقب شاہ نواز فاروقی:دویم:شاہ نواز فاروقی سے چند مذید سوالات:	۲۵۲
۱۲	مقالہ ہفتم:شاہ نواز فاروقی،اوریا مقبول جان،طارق جان اور افغان طالبان سے چند اہم ترین سوالات:	۲۸۲

---

[1] Bibliography.

تمہید

تمام تعریف اس رب العالمین کے لئے جس کے سوا کائینات میں کل ذی حیات اور غیر ذی حیات اشیا اسکی بلواسطہ یا بلاواسطہ مخلوقات ہیں، وہی اس کائینات کا موجد، مالک، خالق، اور منتظم حقیقی ہے۔ یہ خاکسار عرصہ سے جامعہ کراچی دار التحقیق کے لئے مکتبہ جامعہ کراچی کے افکار، نظریات، تحقیقات و تنقیدات پر مفتکتب پیش کرتاچلا آرہا ہے، جن میں اس ناچیز کے مدون کردہ مقالات جامعی سب سے زیادہ معروف اور مطالعہ کیا جانے والا سلسلہ الذہب ثابت ہوا ہے۔

اس سلسلہ کی ترتیب و تالیف کے ضمن میں مجھے جتنی مشکلات پیش آئی ہیں اسکا شاید قاریین کو صحیح طرح سے اندازہ کرنا آسان نہیں ہے، اول تو میں جابجا یہ امر بیان کرچکا ہوں کہ اس سلسلہ میں شامل تحریریں متنوع پس منظر کی حامل ہوتی ہیں، پھر انکو الگ الگ ترتیبی بنیاد سے منسلک کرکے چننا اس پر مستزاد، جو ایک سب سے بڑی مشکل درپیش رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اس سلسلے میں شامل تحریروں کے صرف پی۔ڈی۔ایف دستیاب ہوتے ہیں اور انکا اوردو ان پیج اور ایم۔ایس ورڈ میں کوئی فارمیٹ موجود نہیں ہوتا ہے، نا ہی فراہم کیا جاتا ہے، لہذا ان کو ای بک میں پیش کرنا بلخصوص جبکہ خود صاحب تحریر کی فراہم کردہ تحریروں میں الاینمنٹ، فارمیٹینگ، فونٹ کو سرے سے اہمیت نا دی گئی ہو انکو ایک یکجا باقاعدہ کتاب کی صورت میں تناسب سے پیش کرنا کافی مشکل عمل بن جاتا ہے۔

ہمارے پاس اس کا علاج سوائے پکچر فارمیٹنگ کے سوا کچھ نہیں بچتا ہے، کئی لوگوں نے کنورٹروں سے کنورٹ کرنے کا مشورہ دیا ہے، یا او۔سی۔آر کنورژن کے بھی موشرے دئے ہیں۔ مگر ایسی کوششوں میں یہ امر دیکھا گیا ہے کہ الٹا اسے نقصان ہی پہنچتا ہے، تحریر آگے پیچھے، یا کمپیوٹر لینگوچ میں کنورٹ ہوجاتی ہیں، درست کام کرنے والے سافٹ ویر عموما پیڈ سافٹ ویئر ہوتے ہیں، جو ہمیں مفت دستیاب نہیں ہوتے ہیں، چناچہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زبان کیا ہوا کرتی تھی اورکیا ہوجایا کرتی ہے۔ چناچہ مجھے اپنے روز مرہ کے معمولات، مطالعے، تحقیقات کے ساتھ ساتھ اس پر توجہ دینا پڑتی ہے، اور گھنٹوں پی۔سی پر بیٹھنے، میل اور چیٹ کے ذریعہ مسلہ حل کروانا، دوسروں کی سستی اور ٹال مٹول کے سبب عموماً خود اکیلے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے اور پھر ان پر نگاہ ڈال کر تبدیلی کروانا پڑتی ہے، پھر بھی کتاب آن لاین ہونے کے باوجود لموزنگ کی غلطیان بار بار نگاہ مارنے سے معلوم پڑتی ہیں۔، یہ سب کافی وقت لے لیتا ہے، ان سارے معاملات سے معلوم پڑتا ہے کہ دوسروں پر ذمہ داری ڈالنا اکثر ناامیدی کا بھی سبب بنتا ہے، اور تعلقات بھی خراب ہوتے ہیں، لوگ ذمہ داری لیکر بھی وقت کی پابندی کرنا پسند نہیں کرتے ہیں، وعدے کا پاس کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا ہے، معذرت، اور جھوٹی قسمیں پیش کرکے دامن چھڑایا جاتا ہے، مذید لوگ سست روی کا مظاہرہ کرکے، کل منصوبے کو التوا کا شکار کردیتے ہیں، جبھی ہم سے جو خود ممکن ہوسکتا ہے وہ خود کرتے ہیں ورنا دوسروں کے ہاتھوں مایوسی کا شکار ہونا پڑ سکتا ہے، لہذا جو جتنا مجھ سے ممکن ہوتا ہے اسے حتی المکان خود کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

جس دوران میں اس مجموعہ مقالات پر کام کر رہا تھا اصل میں یہ میری ترجیہات میں شامل نہیں تھا، میں اس دوران بیک وقت چار مختلیف موضوعات پر طبع زاد کتب اور مجموعات پر کام کر رہا تھا، ہوا کچھ ایسا کہ ایک روزمیرے سامنے اپنے پی سی کو سرچ کرتےہوئے خالد صاحب کی کچھ نئی تحریریں سامنے آئیں جو خالد صاحب کی غالباً عشرہ قبل کی تحریریں انداز تحریر سے معلوم پڑتی ہیں، پھر ساتھ ساتھ ادب و لسانیات کی کچھ چیزیں بھی سامنے آئیں ، میں نے سوچا کہ سال شروع ہوچکا ہے ، جامعہ کراچی بند ہے، لوگ ادارہ کی منفرد کتب کے مفت اور آسانی سے دستیاب ہونے کے سبب منتظر رہتے ہیں چناچہ لسانیات کے ضمن میں اوردو کے دخیل الفاظ کو پیش کیا گیا، میں اس سے ماقبل تاریخی تحقیق کی کچھ تحریروں کو مدون کرنے اور بعد میں ان پر مسبوط مقدمے کی تیاریوں میں مصروف تھا ، تو سوچا کہ یہ لمبا کام ہے ، حواشی، تخریجات، مصنفین پر نقد، کتب کے ڈھونڈنے ڈھانڈنے میں وقت لگےگا، موضوع میں موجود مذہبی نزاکتیں اس پر سے مستزاد ہیں، چناچہ سوچا عوام زیادہ تر جس نوع کا مطالبہ کر رہی ہے تو اسی کو پایہ تکمیل پر پہنچایا جائے، لہذا مقالات کی پانچویں جلد تیار کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا، جسکا نتیجہ آپکے سامنے ہے۔

اس میں خالد صاحب کی تحریروں کو جو جدید و قدیم دونوں قسم سے تعلق رکھتی تھیں کو دو حصوں میں بانٹ کر مدون کیا گیا ہے، اس میں اختلاف امت پر دو تحریریں بھی ملیں جو کہنے کو صاحب مضامین، کی حسن نیت کی عکاسی کرتی ہیں مگر، اس میں اخذ مسایل کے ضمن حدیث و فوہ کے اصول خصوص و عموم، صحیح و غلط، مقید و غیر مقید ، مشروط اور عدم مشروط ، مطلق اور غیر مطلق، ناسخ و منسوخ کے طریقہ کار و منہج سے یا تو جان بوجھ کر پہلو بچایا گیا تاکہ کام کے منتخب حوالے دیکر مضمون کو محقق و تیر بہ ہدف ثابت کیا جاسکے۔

بلکہ کئی جگہوں بھی الفاظوں اور اصطلاحوں کا غیر موزوں چناو، نے تحریر میں مذید الجھاو کو پیدا کر دیا ہے، خالد صاحب کی ہر بات کو آمناً و صدقاً ماننے والے، یا انکو حرف آخر سمجھنے والے شاید ان باتوں کو سمجھ نا پائیں یا پھر شخصیت پرستی کے سبب سمجھنے سے انکار کردیں تو الگ بات ہے ورنا علم حدیث اور محدثین کی منہج کی مخالفت اس میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے، اصول دین ، فروع اور متعلقات میں انھونے ندرت طبع دکھانے کے چکر میں، سب کو خوش کرکے اعتدال پسندی کے مظاہرے دکھانے کے چکر میں ایک خاص مذہبی لبرلازم ، تنوعیت اور آزاد روی کا مظاہرہ کردیا ہے۔ اختلاف امت کو رحمت قرار دیکر موضوع روایت کی پیروی میں کیا کیا تاویلیں کی گئی ہیں ، کہ اس دفعہ خاموش رہا نہیں گیا ، انکی کئی تحریروں میں جن مں اسلام کے ضمن میں انھونے اپنی منہج، تاویل اور موقف دکھانے کی کوشش کی تھی وہاں جا بجا نتایج کے ضمن میں اختلاف کی گنجایش موجود تھی، مگر میں نے ان سے حسن عقیدت اور صاحب تحریر کی تحریر میں تصرف کی زیادتی سے پرہیز کرنے کے سبب اپنا پہلو بچا کر رکھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو جگہ حواشی میں کچھ اجمالاً بڑھادیا گیا۔ مگر اس تحریر میں اور اس سلسلہ کی دیگر تحریروں نے اور اکثر قارئیں کے اعتراض نے اب مجھے مجبور کردیا ہے، کہ کم از کم اس اختلاف امت کے سلسلے کی حدیث، فقہ، تاریخ ، علم حدیث اور اسما الرجال کے ذریعے تردید کروں۔ چناچہ خاکسار نے شروع شروع میں کوشش کی تھی اس مقالات کے لئے ایک مبسوطمقدمہ لکھ دوں بعد میں اندازہ ہوا کہ اگر گنتی کے دو چار معاملات پر بھی لکھوں تو اصل کتاب سے معاملہ کافی تجاوز کر جائیگا، چناچہ اس تعارف سے قبل تک مقدمہ ٦٠

صفحات سے تجاوز کرچکا تھا، لہذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسے اسکے بعد اختصار سے الگ کتاب میں چیدہ چیدہ چیزیں منتخب کرکے پیش کردونگا، جس پر تاحال کام جاری ہے۔

چناچہ خالد صاحب اس دعوے کی حد تک تو محققہ بنیادوں پر بلکل درست ہیں کہ سلفِ امت فروعی مباحث میں ایک دوسرے کی تکفیر سے بچا کرتے تھے، ایک دوسرے کی امامت میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے، خیر یہ سب کچھ اس سبب بھی تھا کہ، صحابہ کرام کے تربیت یافتہ تابعین اور انکے تربیت یافتہ تبع تابعین پھر انھی اسے نکلنے والے آیمہ اہل حدیث و اصحاب حدیث اور انھی سے نکلے اصحاب رائے منہجی اختلاف کے باوجود ایک ہی اہل قبلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں اجتہاد کے تقید، ممانعت، بند ہونے کی نا فقہی بحث موجود تھی اور نا ہماری موجودہ عصری مسلم دنیا کی طرح کی فرقہ پرستی رایج تھی، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس ضمن میں جو کچھ حجتہ اللہ البالغہ میں فرمایا کہ:
یہ امت شروع کی چار صدیوں (یعنی پانچویں ہجری) تک کسی کی تقلید نہیں کرتی تھی جسکو جس سے مسلہ پوچھنا ہوتا پوچھ لیتا تھا، اور جسکو عمدہ جانتا اس پر عامل ہوجاتا تھا، انھی کے اتبع میں اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنے فتاوی میں اس بیان کا اعتراف کیا ہے، جسکا ذکر اصل تردیدی کتاب میں آئیگا۔

معلوم پڑتا ہے کہ اجتہاد و تقلید کا حکم اور معاملہ شروع صدیوں تک کوئی نفرت و عناد کا معاملہ سرے سے تھا ہی نہیں، یہ منہجووں کا اختلاف تھا، شیخ خضری بک مصری نے تاریخ فقہ الاسلامی میں اس امر پر کافی تفصیل و دلایل سے بحث کی ہے۔

لہذا جنکی نگاہ میں تقلید جایز نہیں ہے انکی اہل تقلید کے پیچھے اس بنیاد پر نماز پڑھنا کے دونوں کے اصول دین ایک ہی ہیں تویہ بات جایز ہے، یہی اہلسنت و الجماعتہ کی منہج ہے، فروعی اختلاف سرے سے اس بنیاد پر معتبر نہیں ہوتے ہیں کہ انکی بنیاد پر باہم لڑا، مرا اور باہمی لاحاصل بحث و مباحثہ کیا جائے، گالی گلوچ کی جائے، سب و شتم کے سلاسل قایم کئے جائیں، لہذا یہ سب اموراسی وقت سرانجام دئے جائیں جبکہ سامنے والا آپکے عمل و موقف پر تعصب سے حملہ کرے اور خود کے حق پر ہونے پر اصرار کرے تو اہل علم پر انکا فسد زایل کرنا جایز ہوجاتا ہے۔

ویسے بھی سلف کے دور میں فقہی اختلاف تو کہیں نا کہیں ہوا کرتے تھے مگر اصول دین اور فرایض دین میں اختلاف موجود نہیں تھا، اللہ کی ذات و صفات، قرانی آیات میں متشابہ کی تاویل شروع میں جھم بن صفوان، واصل بن عطا، سبائیوں، کیسانیوں اور روافض نے کی تھیں، مگر اہل سنت میں اسکا سبب معتزلہ کے مقابل میں دو اصول دین کے دبستان کے سبب ممکن ہوا، جن پر بھی علم کلام، اور فلسفہ حاوی ہو گیا تھا ۔ دیکھا گیا ہے جبھی محدثٰین کرام نے اس ضمن میں اہل سنت کے معتزلیوں اور روافض کے معتزلیوں کا اسما الرجال میں ذکر کیا ہے، مورخین اور تذکرہ نگاروں اور محدثٰن نے اشعری اور ماتریدی افکار پر بھی سخت نقد کیا ہے۔

میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ احادیث موقوفہ اور مراسیل سے بھی جو معنی مفہوم معلوم ہوتے ہیں ان سے یہ امر مفسر ہوتا ہے کہ وہ اختلاف نوعیت کے حساب سے اکثر ویسا نہیں ہوتا تھا جیسا آج کے دور میں محسوس ہوتا ہے، امام ابن حزمؒ نے اپنی کتاب احکام فی السُّصول احکام میں ان امور پر کافی

شافی بحث کی ہے ،جنکے حوالے اس کے تعاقب پر کی گئی تحقیق میں سامنے آئینگے۔ ان میں یعنی صحابہ کرام، انکے اتبع کرنےوالے حد یہ کہ خوارج تک میں کفر و شرک کے مباحث وہ نہیں ہوا کرتے تھے جیسے آج اہل سنت کہلانے والون میں ملتے ہیں، جیسا کہ واضھ ہے کہ حروری بھی ابن عباسؓ جیسوں خط بھیج کر دینی مسلے معلوم کیا کرتے تھے۔ علیؓ، اور انکے بیٹے محمد بن حنفیہؒ کی نسبت بد عقیدگی نے اول فلسفیانہ فسق کو ظہور دیا، اس سے قبل عثمانؓ اور علیؓ سمیت صحابہ کرام کی تکفیر فلسفیانہ کم سیدھا سادھا قران کی غلط تاویل پر استوار فاسقانہ اظہار تھا، سج میں عین کفر کے جراثیم پکڑنا ان پر ثابت نہیں تھا، چناچہ علیؓ یا معاویہؓ کے دور میں انکے کفر کی بحث تو پیدا نہیں ہوئی مگر انکے باغی اور اور قتال پر استوار ارتداد کے مسلے پر انکے خلاف فوجی کاروایئاںؓ کی گئیں۔

جنگ نہروان اسکا بین ثبوت ہے جس میں ابن سبا وغیرہ کو اپنی طرف الوہیت کی نسبت کے سبب علیؓ نے جلوادیا تھا اور منصور عباسی نے منصوریہ فرقہ والوں کو موت کی گھاٹ اتارا، کیسانیہ کا فتنہ [1] ایک کذاب مختار ثقفی کے سبب پھوٹا ،مگر خوارج میں خون خرابے ،تکفیر کرنے سے زاید زیادہ بد عقیدگی نہیں پھیلی تھی انکے گناہ نوعیت کی رو سےکفر کم فسق زیادہ تھے۔ خوارج ہی روافض کی اصل تھے، اگر چہ بعد میں دونوں کا ناطہ الگ ہوگیا تھا، کیونکہ علیؓ اور صحابہ سے بد عقیدگی میں خوارج الگ راہ پر چلے اور مبالغہ آمیز حبِ علی میں روافض الگ دنیا کے مکین بنے، مگر ان سب کے باوجود روافض کو ابن سبا کی فکر سے الگ کرکے دیکھا جائے تو ان میں شروع شروع کے دوران وہ عقاید و اعمال نہیں ملتے تھے جو آج ان میں دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔ یا جسکی ایک حد نصیریوں میں ڈھونڈھنے سے مل جاتی ہے، چناچہ شیعہ اس دور میں ضروری نہیں تھا کہ لازمی رافضی ہو۔

اور جو آج ،بدعات، کفر و شرک کے مسایل و مباحث فلسفیانہ اخذ و تلمذ کے سبب عود آئے ہیں، خوارج و روافض کا اختلاف سیاسی، و شخصیاتی نوعیت کا حامل تھا، فرایض دین ،اصول دین میں یہ تبدیلیاں، انحرافات، بدعات و کج رویاں اس دور تک کھل کر عود کر نہیں آئی تھیں، مگر چوتھی صدی تک اس بابت کتب شیعہ میں بہت کچھ ملنے لگا تھا، کیونکہ اب انکے آیمہ غیبت کرچکے تھے، انکو سنبھالنے والی کوئی با اثر شخصیت موجود نہیں تھی، لہذا آل بویہ نے ان کے اعتقاد میں سیایس اثر سے کافی تبدییلی پیدا کردی تھی۔ ، روافض کے وہ عقاید و مباحث جو بنو عباس کے دور زوال ،آل بویہ کے دور امارت، ترکوں کے دور ظلم و وحشت، منگولوں کے روافضی نوعیت کے قبول اسلام کے بعد نمودار ہوئے وہ مباحث و مسایل ابھی صدیوں دور تھے، جب تک حدیث اور انکی اسناد کا دور رایج رہا انکی جمع وتدوین کا دروازہ کھلا رہا تب تک نا اجتھاد بند ہوا اور نا تقلید کا رواج رہا، فقہی دبستان آیمہ دین کے شاگردوں کی دین تھے، مگر انھونے بھی نا انکی نا ہی ویسی تقلید کی اور نا انکی اس طرح پیروی کی جیسے آج دعوی کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔

---

[1] احمد و تنقیح المقال

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ صاحبین کرامؒ نے دو تہائی دین میں امام ابو حنیفہؒ سے اختلاف کیا تھا، بلکہ شیخ خضری بک نے یہ کہا یہ دونوں شیخ باقاعدہ مستقل مجتھد تھے، انکا مقام شاگرد کا تھا، ناکہ مقلد کا تھا۔

خیر اجتھاد امت میں کبھی نا بند ہوا ہے اور انشااللہ نا کبھی بند ہوگا یہ امت ہمیشہ ایسے افراد دیکھے گی جو اجتھاد کرتے رہینگے چاہے وہ کہنے کو کسی مخصوص فقہ ، منہج اور تقلید کے دعوے دار کیوں نا ہوں کیونکہ یہ معلوم مسلہ ہے کہ اہل تحقیق کبھی مقلد ہو ہی نہیں سکتا ہے، اسی طرح فروعی معاملات کے سبب اختلاف کی کوئی دلیل نہیں بنتی ہے، مگر اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ اختلاف کوئی رحمت کا عمل ہے ؟یہ خالد صاحب کی انتھا کی غلط فہمی یا خوش فہمی ہے اسے جو چاہے نام دے دیں انکے سارے مقالات و تحریر بین ثبوت ہیں کہ انہونے جتنا نام کمایا اختلاف میں کمایا اور انکے خصم اسے رحمت نہیں مانیں گے اور نا وہ اسے رات کی تنہائی میں کبھی اکیلے تنائی میں غور کریں رحمت نہیں قرار دینگے ، مانی جانی بات ہے جو بدیہات و قیاس سے ثابت ہے کہ اختلاف اتفاق کی ضد ہے ، یہ اجتماع الضدین ، حشر سے قبل ممکن نہیں ہے، باقی یہ اختلافات جن اسناد پر قایم ہیں ، انکو انہی تک محدود رکھا جائے تو عمدہ ہوگا۔

، یہی اہل قبلہ کا جایز دایرہ کار ہے۔ جہاں انکی ان[2]بس امام صحیح العقیدہ ، کفر و شرک سے دور ہو بنیاد پر تکفیر جایز نہیں ہے۔ مگر خالد صاحب اور مکتبہ جامعہ کراچی کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ وہ جدیدیت کو جتنا بڑی ہوا بنا کر تبلیغی مورچہ قایم کرتے ہیں ، انکی نگاہ میں کفر و شرک، الحاد، بدعات کے مباحث سرے سے اہمیت کے حامل ہی نہیں ہوتے ہیں چناچہ اختلاف رحمتی کے کلیہ کی جڑ میں ڈھونڈنے سے ایک خاص مقامی مسلم لبرلازم کا ایک نیا تصور موجود پایا جاتا ہے، جسکی رو سے تم بس مسلمان ہونے کے دعوے دار ہو قبلہ ہمارا تمہارا ایک ہو ، ہمارے تہمارے کسب ، تعلقات، اکتساب کے لئے یہی سب سے عمدہ شرط مانی جائیگی، اور مل ملا کر ہماری بات مانکر مغرب و جدیدیت کے خلاف صف آرا ہوجاو۔

مکتبہ جامعہ کراچی مغرب و جدیدیت، سرمایہ داریت اور سائینٹفک منہج کا ناقد مکتبہ حیات ہے اس ضمن میں انہونے مابعد الجدیدیت کے فلسفہ کو ایک آلہ کار بنایا ہوا ہے، معاشرے ریاست، مذہب و تمدن سے لیکر سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات تک تمام مباحث کی تفسیر و تشریح کے لئے انھی علوم و فکر اور ان سے مرتب شدہ مواد کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

ہر صاحب تحریر اپنی تحریر نتایج و عواقب کا خود ذمہ دار ہے، لہذا خالد صاحب سے متاثر ہونا یا پھر نا ہونا انکی بحث کو دلیل ماننا نا ماننا ہر صاحب مطالعہ کا ذاتی معاملہ ہے عین ایسے صاحب تدوین کا بھی انکی فکر و تنقید، تشریح، و تاویل سے کامل اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے، ویسے بھی ساحب تحریر خود اختلاف کو رحمت جانتا ہے تو اس سے اختلاف کرنا اسکا رد کرنا یک اسکی اجازت شدہ حرکیات کی قبیل کی شہ ہے۔

---

[2] یہی امام مالکؒ کا موقف تھا، امام ابن حزمؒ نے بھی اس پر کافی بحث کی ہے، امام احمدؒ کا ایک قول یہی ہے۔

انہونے اختلاف امت کی جو بحث فرمائی ہے اس میں کئی جگھوں پر تحقیق کم زیادہ تر حوالے منتخب کرکے من چاہے نتایج اخذ کئے گئے ہیں، کئی لوگوں کی تحریروں سے جو معرف باتیں تھی انکو نظر انداز کردیا گیا ہے اور شاذ و مقید اقوال سے کام چلایا گیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ، امام ابن حزمؒ کے کچھ اقوال منتخب کرکے ان سے من چاہے معنی ومفہوم اخذ کئے گئے ہیں۔ انہونے کھل کر نہیں کہا مگر ماہر فرد انکی بحث سے بہت کچھ سمجھ سکتا ہے، کہ اس میں کیا کیا آفتیں پنہاں ہیں۔

عبارتوں کے تراجم میں لفظوں کو اصل معنی و مفہوم سے ہٹا کر اپنے عقاید ر رجھانات کو وہاں نفوذ پذیر کردیا گیا ہے۔ خالد صاھب کی اکثر تحریروں میں احادیث کے صحیح و غلط ہونے کا کوئی تصور وہ تحقیق نہیں پائی جاتی ہے، اکثر اقوال تابعین اور موقوف آثار کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ایسی کئی منتخب فکری خام فہمیوں کی تردید کے لئے میں ایک الگ تحقیق کر رہا ہوں جسکی تکمیل کے بعد وہ پیش خدمت کردی جائیگی۔

ڈاکٹرمحمد علی جنید۔

حصہ اول

بروشسکی زبان اور لغت

سید خالد جامعی

زبانوں کی تاریخ محض بھول بھلیوں میں گم ہو جانے اور مسلسل گم رہنے کی تاریخ ہے جس میں ہر لمحہ نئے موڑ آتے ہیں اور ہر لحظہ قدیم تحقیقات یکسر مسترد کر دی جاتی ہیں۔ نئے قیاسات مفروضات قائم کیے جاتے ہیں اور نئے نظریات کے سہارے محقق کا سفر جاری رہتا ہے۔ زبانوں پر ایک زمانہ وہ بھی گزرا جب سنسکرت کو زبانوں کی ماں قرار دیا گیا اور بے شمار زبانوں کے رشتے اسی سے جوڑ دیے گئے حتیٰ کہ سنسکرت شمالی ہند کی تمام زبانوں کی ماں قرار دی گئی اور اردو زبان کو سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل کہا گیا لیکن مولانا ابوالجلال ندوی[۱، ۲، ۳]؛ اور ڈاکٹر سہیل بخاری[۴] نے ام الالسنہ کے حوالے سے نت نئے انکشافات کیے، جس کے نتیجے میں ایک ہلچل پیدا ہوئی، یہ ہلچل ابھی علمی حلقوں میں تسلیم نہیں کی گئی مگر ان ماہروں نے فکر و نظر کے بعض نئے دریچے روشن کیے۔ ان انکشافات کی بنیاد پر ڈاکٹر خالد حسن قادری نے ''اردو کا آغاز اور مولد'' کے عنوان سے بعض نئے خیالات پیش کیے[۵]۔

آریاؤں کی آمد پر لسانی نقشہ کیا تھا؟

اب تک تقریباً سبھی نامور علمائے لسانیات ہند کے خیال میں سنسکرت شمالی ہند کی تمام زبانوں کی ماں سمجھی جاتی ہے لیکن ایک سادہ سا سوال جو اکثر اس لیے نہیں پوچھا جاتا کہ اس کا نظر انداز کرنا آسان ہے لیکن اس کا جواب فراہم کرنا مشکل، کہ آریائی قوم نے جب ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس وقت ہندوستان کا لسانی نقشہ کیا تھا؟ کیا وہ لوگ جو شمالی ہند کے اس وسیع، زرخیز اور تہذیب یافتہ علاقے میں رہتے تھے اور حملہ آور آریاؤں کے ساتھ جن کا واسطہ پڑا کیا وہ گویائی سے محروم تھے یا ان کی کوئی زبان ہی نہیں تھی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ کون سی زبان یا زبانیں تھیں جنھیں وہ استعمال کرتے تھے؟ ظاہر ہے آریاؤں کی آمد سے قبل ہندوستان کے لوگ گونگے بہرے نہیں تھے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے تو اس ضمن میں بہت بڑی زقند لگائی ہے اور قدیم ترین زبانوں میں اردو

زبان کے الفاظ کو شامل دکھایا ہے، جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے۔

"سب سے پہلی بات یہ کہ اردو زبان کی قدامت کے موضوع پر بلکہ اردو لسانیات کے میدان میں کسی موضوع پر مرحوم ڈاکٹر سہیل بخاری کی کوئی بات معتبر نہیں۔ اور ان کا یہ ارشاد تو واقعی تعجب انگیز ہے کہ اردو کے الفاظ سنسکرت، ویدی سنسکرت اور رگ وید و پاژند میں موجود ہیں۔ یعنی ڈاکٹر صاحب کے خیال میں مندرجہ بالا زبانیں یا کتابیں اردو کے بعد یا اردو کے ساتھ ساتھ وجود میں آئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات غلط محض ہے۔ لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ کس لفظ یا الفاظ کو اردو کا لفظ قرار دیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اردو میں جو الفاظ غیر زبانوں سے لے لیے گئے ہیں وہ تو ان ہی زبانوں کے ہیں اردو کے نہیں ہیں۔ پھر ہزاروں الفاظ ایسے ہیں جو سنسکرت سے آئے ہیں اور اردو میں آتے آتے یا اردو میں آنے کے بعد ان کی شکل بدل دی گئی ہے۔ مثلاً سنسکرت میں دگدھ [Dugdh] ہے جو اردو میں دودھ ہو گیا اس طرح کے ہزاروں الفاظ ہیں جو اصلاً اردو نہیں ہیں۔ یہ جس زبان سے آئے ہیں وہ زبان اردو سے تقدم زمانی رکھتی ہے یا پھر اردو کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئی۔"[۶]

تاریخی افسانے:

خالد حسن قادری کے خیال میں "آریاؤں کے ورود کا سال ۱۵۰۰ ق م ہے ویدوں کا زمانہ تقریباً ایک ہزار سال پر محیط فرض کر لیا گیا ہے، آخری وید "اتھروید" کی تصنیف ۳۰۰ ق م کے آس پاس ہوئی، پہلی ویدی تخلیق ۱۴۰۰ ق م بتائی گئی۔ مگر یہ تمام تاریخیں واضح طور پر محض الل ٹپ نظریات ہیں۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک یہ وید اور بالخصوص پہلے تین وید ضبط تحریر میں نہیں آئے اور رسم الخط کی ایجاد و دریافت سے پہلے تقریباً ایک ہزار سال کی مدت تک یہ تمام وید صرف زبانی اور سماعی روایات کے طور پر منتقل ہوتے رہے۔[۷]

سنسکرت اصلی نہیں رہی:

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ویدوں کی زبانوں نے مقامی زبانوں کا گہرا اثر قبول کیا تھا جس کی وجہ سے یہ زبان اُس ایک ہزار سال پہلے والی سنسکرت سے بہت زیادہ مختلف تھی جو حملہ آور آریا اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، سنسکرت کے بہت سے ماہرین اب اس نقطۂ نظر پر متفق ہو چکے ہیں۔ ویدوں کی سنسکرت کے بہت سے اجزا اس کی ہم ماخذ یورپی زبانوں میں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر زبان کے پچھلے حصے سے نکلنے والی آوازوں والے الفاظ کی ایک کثیر تعداد جو کہ ویدوں کی سنسکرت میں تو موجود ہے لیکن یورپی شاخ کی دوسری آریائی زبانوں سے غائب ہے۔[۸] یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سنسکرت بغیر رسم الخط کے زبان تھی لہذا ایک ہزار سال تک محض زبانی روایات کے بل بوتے پر اس کا خالص رہنا محال صورت تھی۔

پانینی کی سنسکرت اصل سے مختلف ہے:

پانینی نے جب پشاور میں اپنی لافانی قواعد مرتب کرنا شروع کی تو جس زبان سے وہ واقف تھا وہ حملہ آور آریوں کی اصل زبان سے واقعی مختلف تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ پانینی کی سنسکرت بھی ویدوں کی سنسکرت سے بہت مختلف تھی۔ قواعد کی کچھ شکلیں ایسی بھی ہیں جو رگ وید میں تو ہیں مگر جدید سنسکرت میں ان کا وجود نہیں۔ اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سنسکرت کو خود تبدیلیوں کے بے شمار مراحل سے گزرنا پڑا ہے جس کا بالعموم اعتراف نہیں کیا جاتا۔[۹]

آریاؤں کا دیسی زبانوں سے رویہ:

چوں کہ آریہ مفتوح لوگوں کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے لہٰذا انھوں نے مفتوحین کی زبانوں کو "وبھاشا" [غیر زبان] یا "اشور بھاشا" [بھوتوں کی زبان] یا پھر "ناگ وانی" [ناگ، سانپ اور ناگ قوم کی زبان] کہتے تھے۔ یہ سارے نام ایک بیرونی زبان کو ظاہر کرتے ہیں۔ لفظ بیرونی سے ان کی مراد ایک ایسی زبان تھی جو نا قابلِ فہم ہو، کیوں کہ ان کے نزدیک ان زبانوں میں نہ کوئی ربط تھا نہ منطق اور نہ قابلِ فہم قواعد۔ اسی وجہ سے ان زبانوں کو "غیر زبان" [یعنی کوئی زبان نہیں] کا درجہ دیا گیا۔ جیسا کہ ہر مادری زبان بولنے والے کو اپنی زبان معقول، مدوّن اور منظم لگتی ہے، کانوں میں شیرینی گھولتی ہے، اس وجہ سے آریہ بھی اپنی زبان کو خالص، تہذیب یافتہ زبان "سانسکرت" اور، دیوتاؤں اور دیویوں کی زبان "دیواوانی" [دیوابانی] کہتے تھے۔[۱۰]

اردو ہندی: ہند آریائی زبانیں نہیں:

ڈاکٹر خالد حسن قادری نے اس مفروضے کو رد کرتے ہوئے کہ تمام ہند آریائی زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں، لکھا ہے "اولاً مجھے بہ بانگِ دہل یہ کہنا ہے کہ تمام زبانیں سنسکرت سے نہیں نکلی ہیں۔ اُردو اور اس کے ساتھ ہندی اپنے وجود کے لیے سنسکرت کی مطلق محتاج نہیں اور جن معنوں میں ہند آریائی زبانوں کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، ان معنوں میں اردو اور ہندی ہند آریائی زبانیں بھی نہیں کہی جاسکتیں۔ نیز یہی نظریہ دوسری ہندوستانی زبانوں کا بھی احاطہ کرسکتا ہے جن کی اب تک بغیر حیل و حجت ہند آریائی زبان کے ساتھ گروہ بندی کی جاتی تھی۔"[۱۱]

وادیٔ سندھ کی تہذیب سے سنسکرت کا تعلق:

سب سے پہلے سر الیگزنڈر کننگھم، ڈاکٹر کے پی جیسوال اور رائے بہادر بشن سروپ نے براہمی حروف کی مدد سے موئن جو دڑو کی مہروں اور تصویری نشانات کو سنسکرت میں پڑھنے کی کوشش کی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ براہمی حروف اور اس کا رسم الخط براہِ راست وادیٔ سندھ کی لکھائی سے ماخوذ ہے۔ اس طرح سنسکرت زبان کا وادیٔ سندھ کی تہذیب سے خاص تعلق قائم کیا گیا جس کا فطری نتیجہ یہی تھا کہ اس تہذیب کا تعلق ہندومت سے جوڑ دیا جائے۔ فادر ہیراس (Father Rev. H. Heras) نے اپنی کتاب

Studies in Proto Indo-Mediterranean Culture (Bombay 1953) میں ثابت کیا کہ مہروں کی اصل زبان دراوڑی دور سے پہلے کی زبان (Proto-Dravidian) ہے اور اسی سے ہندوستان کی تمام دراوڑی زبانیں نکلی ہیں۔ آریاؤں کی آمد کے بعد دراوڑیوں نے ہندومت اختیار کرلیا تھا لہٰذا اس نقطہ نظر سے بھی وادیٔ سندھ کے لوگوں کا تعلق ہندو دھرم سے قائم کیا جاسکتا ہے۔

بنارس ہندو یونیورسٹی کے محقق اور مشہور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر پران ناتھ نے اپنے دو مضامین میں جو Indian Historical Quarterly Vol.VII & VIII (Calcutta 1931-32) اور روزنامہ پائنیر Pioneer (Lucknow 1957), Feb. 03, 10, 17, 24, March 03, 10, 17, 24, اور April 07 میں شائع ہوئے۔ وادیٔ سندھ کے لوگوں کو ہندومت سے وابستہ قرار دیا۔ ان کے دو معرکہ آراء مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

1- The Scripts on the Indus valley seals. (Quarterly)

2- Decipherment of Mohenjodaro and Harappa Inscriptions. (Pioneer)

ان مضامین میں وادیٔ سندھ کی تہذیب کو ہندو تہذیب ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کی تحقیقات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ وادیٔ سندھ کا رسم الخط ''الف بائی'' ہے۔ اس کے حروف کا علم سندھی نشانات کا تجزیہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے جو براہمی حروف سے مشابہت رکھتے ہیں۔

۲۔ مہروں پر دیوی اور دیوتاؤں کے نام پائے جاتے ہیں۔

۳۔ بعض دیوی دیوتاؤں کا تعلق سومیری قوم سے ہے اور بعض ہندوستان کی ''پورانک'' روایات اور تانترک مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

۴۔ ہڑپہ موہن جودڑو کے تین بڑے راجا تھے: شورسین ہنزا اور ہری۔

۵۔ ہندوستانی روایات میں انھیں سوراشٹر (گجرات) کے راجا ظاہر کیا گیا ہے۔

۶۔ ان راجاؤں کا زمانہ دو ہزار سات سو پچاس قبل مسیح تھا۔ ان کی زبردست حکومت ہندوستان سے لے کر بحیرہ روم کے ساحل تک پھیلی تھی۔

۷۔ بعض مہروں پر ''شیو جی''، ''موشنکر'' لکھا ہوا ملتا ہے اور بعض پر سومیریہ کے کش (Kish) اور مشہور حکمران سارگون کے نام پائے جاتے ہیں۔

۸۔ ہندوستانی روایات کا ''شورسین'' ہی عراق میں سارگون کہلاتا تھا۔

۹۔ سومیری لوگ آریہ تھے اور سارگون بھی آریہ تھا۔ وادیٔ سندھ کے خط کا تعلق ان علامات سے

ہے جو جنوبی ہند کے مٹی کے کتابوتوں پر پائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر پران ناتھ کا یہ دعویٰ کہ سومیری لوگ آریہ تھے اور سارگون (شورسین) آریہ تھا، عجیب و غریب ہے۔ یہ دعویٰ خود اپنی تردید ہے۔ شورسین سنسکرت کا لفظ ہے اور یہ وہ گروہ ہے جو کمتر ذات سے تعلق رکھتا تھا اور اشور قوم کے ساتھ مل کر دیوؤں سے جنگیں کیا کرتا تھا۔ ہندومت میں سب سے کمتر طبقہ شودر (اکشودر) ہے۔ یہ سنسکرت کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی ''لاوجود'' (Non-existent) کے ہیں۔ یعنی ایسی چیز جس کی کوئی حقیقت نہ ہو، یا اس کی کوئی حیثیت نہ ہو یا اس کا کوئی وجود نہ ہو، اسی وجہ سے کائنات جہاں کچھ بھی نہ ہو اس کے لیے بھی سنسکرت کا یہی لفظ ''اکشونیہ'' استعمال کیا جاتا ہے اور ر''اکشونیہ'' لفظ صفر کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ شورسین قوم ہندوستان میں تو اتنی ذلیل و حقیر ہے کہ اگر اس کے کان میں ویدوں کے اشلوک چلے جائیں تو آریہ یا برہمن ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیتے ہیں اور اگر اشرافیہ کے کسی کنویں سے یہ لوگ پانی پی لیں تو وہ کنواں ناپاک ہو جاتا ہے اور اگر برہمن کو چھو لیں تو اذیت ناک سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔

لیکن یہی نیچ، کمتر، حقیر و فقیر ''شورسین'' دنیا کی عظیم الشان تہذیب کے شہر کش کی تخت نشینی کے وارث قرار پاتے ہیں۔ آریہ (سنسکرت زبان بولنے والے) شورسینی زبان کو پراکرت یا وبھاشا کا درجہ دے کر حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ اپنی زبان کو سنسکرت کہتے ہیں جس کا مطلب ہے ''تہذیب یافتہ''۔ پراکرت اور وبھاشا سنسکرت کے لفظ ہیں جس کے معنی ''قدرتی'' یا ''خودرو'' اور وبھاشا کے معنی ''نہیں زبان'' کے ہیں۔ اسی طرح دیگر مقامی زبانوں کو بھی جو غیر سنسکرت تھیں، یا آریاؤں کی زبانیں نہ تھیں، انھیں ناگ باقی، ناگ بھاشا اور اشور بھاشا کہا جاتا تھا۔ جس کا مطلب سنسکرت زبان میں ناگوں کی زبان یا اشور (خراب) لوگوں کی زبان ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا مذہب اور رکوئی ایسی الہامی تہذیب نہیں ہے جہاں نہ صرف یہ کہ دوسروں کو ذلیل سمجھا جائے۔ انسانوں کو طبقات میں تقسیم کیا جائے۔ ان کی زبانوں کو زبان ماننے سے انکار کر دیا جائے اور اسے سانپوں کی زبان کہا جائے بلکہ علی الاعلان اس کا اعتراف بھی کیا جائے نہ صرف غیر مذہب اور غیر زبان کے لوگوں سے حقارت آمیز رویہ رکھا جائے بلکہ اپنے ہم مذہب لوگوں کو بھی شودر اور شورسین سمجھا اور کہا جائے۔

سنسکرت زبان والوں اور رہندو مذہب کے پیروکاروں کا دوسری زبانوں سے تحقیر آمیز رویہ تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا رویہ نہیں، مختلف اقوام تاریخی طور پر ان رویوں کا شکار ہو چکے ہیں مثلاً یہودی اپنے آپ کو اللہ کی محبوب ترین قوم ظاہر کرتے ہیں، اور اسی بنیاد پر نجات اور جنت کا حقدار صرف اپنے آپ کو سمجھتے ہیں، اسی رویے

کے نتیجے میں ان کے یہاں نسل پرستی پیدا ہوئی تا کہ خدا سے محبت، آخرت میں کامیابی اور جنت کا حصول صرف اور صرف ان کی قوم کے لیے خاص ہو جائے۔ لہٰذا ان کے یہاں تبلیغ کا کوئی تصور نہیں، جو یہودی نسل میں پیدائش سے محروم رہا وہ دائمی طور پر جنت سے بھی محروم رہے گا۔

قرآن نے اسی نسل پرستی کی مذمت کی اور فرمایا "اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کیوں نہیں کرتے"۔ وجہ یہ ہے کہ "اللہ کی یہ محبوب قوم" اپنے ادعاء کے باوجود موت سے بہت ڈرتی تھی جب کہ موت قرب الٰہی کا ذریعہ ہے پھر اپنے محبوب حقیقی سے دوری کے کیا معنی۔ قرآن نے اپنے معجزانہ اسلوب میں یہود کی دنیا داری پر زبردست طنز کیا ہے۔

اہل عرب بھی رسول اکرم کی آمد سے قبل پوری دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے اور دنیا کی تمام زبانوں کو اسی حقارت سے دیکھتے تھے جس حقارت سے سنسکرت زبان والے دوسری زبانوں کو دیکھتے اور پکارتے تھے لیکن رسول اکرمؐ نے خطبہ حجۃالوداع میں اہل عرب کے اس ادعا اور قومی افتخار کو ریزہ ریزہ کر دیا جب آپؐ نے یہ فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ اللہ کے نزدیک وہی بہتر ہے جو تقویٰ میں سب سے بہتر ہے۔

ڈاکٹر پران ناتھ کا دعویٰ کہ ہندو مت وادیٔ سندھ کا دھرم تھا اہمیت کا حامل ہے خصوصاً انھوں نے گجرات کے ہندو راجاؤں کی حکومت کا ذکر کیا ہے یہ ایک تاریخی حکومت تھی۔ گجرات میں صنعت وحرفت کی عالی شان ترقی کے بارے میں تاریخ تفصیل سے بیان کرتی ہے۔ گجرات کی تاریخ اکتشافات، ایجادات و کمالات کی تاریخ ہے حتیٰ کہ وہاں مغل دور اور اس سے پہلے بھی کاغذ کی صنعت کے شواہد ملتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خطے پر کسی زبردست تہذیب کا سایہ ماضی میں رہا ہے۔ یہ سایہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے سوا کوئی اور سایہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مولانا ابو الجلالؒ ندوی اس تہذیب کو مذہب ابراہیمؑ سے ملاتے ہیں۔ اور ڈاکٹر پران ناتھ اسے ہندو مذہب کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ ہڑپہ وموئن جوڈرو سے ایک عالی شان مجسمہ بھی دریافت ہوا ہے جس نے احرام کی طرح کا لباس زیب تن کر رکھا ہے جو ابراہیمی مذہب کی یادگار ہے اور مسلمان آج بھی سنتِ ابراہیمی کی پیروی میں حج وعمرے کے دوران احرام یعنی غیر سلا کپڑا ملبوس کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مذہب ابراہیمی کا لباس حج وعمرہ احرام پہننے والا مجسمہ سازی اور بت گری کیسے کر سکتا ہے؟ حضرت ابراہیمؑ نے تو آذر و نمرود کے بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

ابو الجلالؒ ندوی کا یہ دعویٰ درست ہو سکتا ہے کہ ہڑپہ وموئن جوڈرو والے حضرت ابراہیمؑ کی ملت میں شامل تھے لیکن یہ ممکن ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان میں شرک کے آثار پیدا ہو گئے ہوں جس طرح کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی موجودگی کے باوجود گوسالہ پرستی کا مرض بڑی شدت

سے پیدا ہوا اور انبیاء کی رحلت کے بعد بنی اسرائیل میں دیگر امراض مثلاً قوم پرستی نسل پرستی بھی مذہبی رویہ بن گئے۔ لہٰذا اس بات پر تحقیق کی ضرورت ہے کہ ہڑپہ و موئن جو دڑو میں آباد ملت ابراہیمی کے لوگوں نے توحید سے شرک کا سفر کب شروع کیا اور اس شرک کو مجسمے اور بت کی صورت اختیار کرنے کے باوجود وادیٔ سندھ کے لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کے لباس ''احرام'' کو ترک کیوں نہیں کیا؟ ہڑپہ، موئن جو دڑو، کوٹ ڈیجی، ڈیرہ اسماعیل خان، چولستان اور رحیم یار گڑھ کی کھدائیوں سے ابھی تک کوئی مندر برآمد نہیں ہوا۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ مندروں کے بغیر وادیٔ سندھ کی تہذیب کا تعلق ہندومت سے کیسے جوڑ دیا جائے؟ البتہ موئن جو دڑو میں ایسا کمرہ دریافت ہوا ہے جس کے بارے میں خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ عبادت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر پران کے دعویٰ کی تحقیق مختلف پہلوؤں سے ضروری ہے۔

تاریخ بتاتی ہے اور قرآن کریم کی امثال اس کی تصدیق بھی کرتی ہیں کہ شرک کا نا فکار رکھنے والی قوموں اور ان کے بعض طبقات میں بھی توحید کی کچھ نہ کچھ علامتیں باقی رہتی ہیں۔ نیز یہ کہ پیغمبروں کے پیروکاروں میں بھی الہامی کتابوں میں تحریف کے بعد شرک کے زبردست آثار و مظاہر پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی تاریخ اس سلسلے میں تفصیلات بیان کرتی ہیں، لہٰذا ڈاکٹر پران ناتھ کا دعویٰ درست بھی ہو تب بھی ابوالجلالؒ ندوی کا یہ دعویٰ بھی بالکل درست ہے کہ وادیٔ سندھ کے لوگ ملتِ ابراہیمی سے تعلق رکھتے تھے۔ ابوالجلالؒ کے پہلے دعویٰ کا تعلق اسلام کے دور سے ہے اور دوسرے دعویٰ کا تعلق جو ہندومت سے متعلق ڈاکٹر ناتھ کا ہے لازماً شرک کے دور سے ہے لہٰذا دونوں دعووں میں مطابقت تلاش کی جا سکتی ہے اور یہی اس مسئلے کا مناسب حل ہے۔

مولانا ابوالجلالؒ ندوی نے اپنے مضمون ''فن کتابت'' میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مہروں کو پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ وادیٔ سندھ کے قدیم باشندے عربوں کے ہم نسل اور ہم زبان تھے۔ وہ نہ دراوڑی تھے اور نہ ہی پروٹو انڈو یورپین تھے۔ قدمائے سندھ دلیس تھا عربوں کا جو کہ اپنے زمانے میں ماروت کہلاتے تھے۔ جنوبی عرب، جنوبی عراق، جنوبی فارس، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور ایک حصہ راجستھان کا ۲۰۰۰ تا ۳۰۰۰ قبل مسیح قوم ماروت کا دلیس تھا جہاں عربی جیسی زبان بولی اور لکھی جاتی تھی۔ یہاں کے باشندے ''ادیوا'' تھے یعنی کسی نبی یا دیوتا کے قائل نہ تھے۔ وہ الا اللہ کے بغیر یا الا اللہ کے ساتھ لا الہ کے قائل تھے۔ (جریدہ شمارہ ۲۳ صفحہ ۱۰۲)

دوسری جانب مولانا ابوالجلالؒ ندوی کا ایک مختلف موقف جو جریدے کے شمارہ ۲۳ صفحہ ۴۵ پر ''ابوالجلالؒ آثار و افکار'' کے زیر عنوان شامل ہے۔ اس کے مطابق ''سندھ کی قدیم قبریں قبلہ رخ ہیں۔ بلوچستان میں ہرو نامی پہاڑی پر ایک نقش بنا ہوا ہے اس نقش کے بالکل سامنے ایک قبر ہے جو اس لیے نہیں

کھودی گئی کہ یہ مسلمان کی قبر ہے۔ قدیم زمانے کی جتنی قبریں ملی ہیں وہ سب مسلمانوں جیسی ہیں۔ ان کا رخ کعبے کی جانب ہے یہاں کے لوگ ملت ابراہیمی کے قائل تھے۔ ہم نے ایک مہر میں ''دھہ'' ایک شخص کا نام پڑھا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ تحریری سے نہیں بلکہ بنی ہوئی تصویر سے بھی ثابت ہوا''۔

مولانا ابوالجلالؒ کے ان دونوں بیانات میں ہمیں کوئی تضاد محسوس نہیں ہوتا چوں کہ تاریخ اس طرح کے معاملات میں تطابق کی بہت سی مثالیں پیش کرتی ہے۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب حضرت ابراہیمؑ کی آمد سے پہلے کی تہذیب تھی اور حضرت ابراہیمؑ کی آمد سے پہلے بھی انبیاء کی آمد کا سلسلہ کائنات میں جاری و ساری رہا۔ ممکن ہے کہ سندھ کی طرف کوئی پیغمبر تشریف نہ لائے ہوں لیکن پیغمبروں کی تعلیمات کے اثرات جس طرح حضورؐ کی آمد سے پہلے مشرکین عرب کے کچھ طبقات میں اور اہل کتاب میں موجود تھے اسی طرح وادیٔ سندھ کے لوگوں میں بھی وحدانیت کے افکار و عقائد یقیناً موجود رہے ہوں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اولاد ابراہیمؑ کی اسماعیلی شاخ میں ڈھائی ہزار سال کے بعد تشریف لائے اس طویل مدت میں عرب کے لوگ مشرک بھی ہوئے اور جو اہل کتاب تھے وہ بھی شرک کی آمیزش سے بچ نہ سکے لیکن سیرت النبیؐ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے اعلان نبوت سے قبل مکہ مکرمہ میں ایسے بہت لوگ تھے جو شرک اور بت پرستی سے بھی بے زار تھے اور اہل کتاب کے محروف دین سے بھی دل برداشتہ تھے۔ یہ لوگ صحراؤں میں جا کر اللہ کو پکارتے تھے اور شرک اور بت پرستی کی تمام روایتوں سے بے زاری کا اظہار کرتے تھے۔ حضورؐ نے ان کو حنفاء کہا۔ اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم مولانا ابوالجلالؒ ندوی کے اس تحقیق و تجزیہ پر آتے ہیں کہ یہاں کے باشندے ''ادیوا'' تھے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ کسی دیوتا کو مانتے نہ تھے اور کسی نبی کے قائل اس لیے نہیں تھے کہ کوئی نبی ان کے یہاں نہیں آیا تھا اس کے باوجود وہ اللہ کی وحدانیت کے قائل تھے، جس طرح حضورؐ اکرم کے اعلان نبوت سے پہلے عرب میں حنفاء کا طبقہ موجود تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے دین حنیف سے وابستہ تھے۔

لیکن حضرت ابراہیمؑ کی آمد کے بعد وادیٔ سندھ کے ادیوا باشندوں نے جو توحید کے علمبردار اور شرک سے آلودہ نہ تھے انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کے دین حنیف کو اختیار کرلیا ہوگا۔ اس تطبیق سے ہماری رائے میں مولانا کی دونوں تحقیقات میں کوئی تضاد باقی نہیں رہتا۔

جہاں تک ڈاکٹر ماتھ کے دعوٰی کا تعلق ہے اس کی توجیہہ بھی یہ ہو سکتی ہے کہ ''ادیوا'' نے پہلے دین حنیف اختیار کیا یا دین حنیف سے پہلے ہندومت اختیار کیا لیکن ان کا زوال اسی لیے ہوا کہ وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگے تھے۔

ہڑپہ اور موئن جوڈرو کی کھدائی کے دوران ایک ایسے بڑے مکان کا نشان ضرور ملتا ہے جس کو کہا

جا سکتا ہے کہ وہ مرکزی عبادت گاہ ہوگی۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موئن جودڑو کی گلی کوچوں میں مندر یا معبد خانے ہوں گے کیوں کہ ایسی عمارتوں کی نشان دہی اب تک نہیں ہو سکی۔

وادیٔ سندھ سے برآمد ہونے والی مہروں پر کندہ نشانات کی تعداد مختلف ماہرین آثار قدیمہ نے مختلف بتائی ہے اور اپنے ذاتی مشاہدات، تاثرات اور تجربات کے مطابق ان نقوش کی تعداد ہر ماہرین آثار قدیمہ کے یہاں مختلف ہے۔

جی آر ہنٹر (G.R. Hunter) نے اپنی کتاب The Script of Harappa and Mohenjodaro and its connection with other scripts (London 1934) میں ان نقوش کی تعدا ۲۵۳۱ ظاہر کی۔

اسٹوارٹ پیگاٹ (Piggot) نے اپنی کتاب Pre-Historic India (Pelican Series 1950) میں نقوش کی تعداد چار سو بیان کی ہے اس کے برعکس پروفیسر اسٹیفن لینگڈن نے ۲۸۸، سی جے گیڈ اور سڈنی اسمتھ نے ۳۹۶ بتائی۔

آسکر پرپولا نے دو ہزار نقوش پڑھنے کا دعویٰ کیا ہے۔

سر جان مارشل نے اپنی کتاب Mohenjodaro and the Indus Civilization Vol.III (London 1931) میں موئن جودڑو کی ۵۰۰ مہروں کی تصاویر شائع کیں۔

مادھو سروپ وتس نے اپنی کتاب Excavation at Harappa Vol.II (Calcutta 1940) میں ہڑپہ کی تقریباً ۹۰۰ مہروں کے نقوش سے بحث کی۔ ایک اور ہندوستانی محقق نے وتس اور مارشل کی ۱۴۰۰ مہروں کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وادیٔ سندھ کے رسم الخط میں کام آنے والے نشانات کی تعداد تقریباً ۵۰۷ ہے۔ بعض محققین کے مطابق ان نشانات میں بیشتر ایک ہی نشان کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وادیٔ سندھ کے رسم الخط پر مشتمل کوئی کتبہ ماہرین آثار قدیمہ کو دستیاب نہیں ہو سکا۔ کچھ ماہرین کی رائے ہے کہ یہ نقوش براہمی اور دیوناگری کی ماتروں (اعراب) کے مماثل ہیں لیکن یہ محض بیان ہے، اس کے لیے نقوش سے کوئی استدلال نہیں کیا گیا۔ دنیا میں جتنے بھی رسم الخط پائے جاتے ہیں وہ عموماً دائیں سے بائیں یا بائیں سے دائیں لکھے جاتے ہیں یا چینی اور جاپانی خط جو اوپر سے نیچے لکھے جاتے ہیں، لیکن موئن جودڑو سے برآمد ہونے والی مہروں میں رسم الخط عموماً دائیں سے بائیں لکھا گیا ہے۔ لیکن ایسی مہریں بھی ملی ہیں جن پر خط بائیں سے دائیں لکھا گیا ہے اور بعض مہروں پر دونوں طرف سے تحریر لکھی گئی ہے یعنی ایک لکیر دائیں سے بائیں کو اور دوسری بائیں سے دائیں کو۔ اس طرز نگارش کو A.S.C Ross نے اپنی کتاب The Numeral-Signs of the Mohejodero Script میں

(Rous Trophedon) کہا ہے اور یہ یونانی کا لفظ ہے جس کے معنی Ross کے مطابق ”جیسے بیل ہل چلاتا ہے“ ہیں۔ ہیروغلافی رسم الخط کو اس رخ پڑھا جاتا تھا جس رخ پر تصویریں کندہ کی جاتی تھیں۔ اس لیے بعض ماہرین آثارِ قدیمہ کی رائے میں موئن جوڈرو کا خط ہیروغلافی، سومیری رسم الخط سے مماثل ہے۔ لہٰذا موئن جوڈرو کی مہروں پر کندہ تصویری عبارت اسی رخ سے پڑھی جانی چاہیے جس رخ پر تصویر ہے۔ بعض اور ماہرین نے اس خط کی مماثلت اس دور میں پائے جانے والے دیگر رسم الخط سے ثابت کرنے کی کوشش بھی کی، کسی نے اسے Proto-Dravidion قبل از دراوڑی رسم الخط قرار دیا۔ اگر ان تمام بیانات کو درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ وادیٔ سندھ کا رسم الخط اس عہد کے تمام رسم الخط کا مخزن بن گیا تھا اور اس عہد میں موجود تمام رسوم الخطوط کا احاطہ کر رہا تھا تا کہ دنیا میں موجود تمام زبانیں پڑھنے والے اس خط سے استفادہ کر سکیں۔ سندھ کی تجارتی اشیاء دور دور تک جاتی تھیں لہٰذا وادیٔ سندھ کے خط کو دائیں خط والے، بائیں خط والے اور تصویروں کے خط والے بھی پڑھ سکتے ہوں گے۔ ماہرین کے مطابق وادیٔ سندھ کا رسم الخط ایلم، موجودہ خوزستان یا جنوبی ایران کے رسم الخط سے زیادہ مشابہ تھا۔ اس خط (سندھی) کی سومیری رسم الخط سے بھی کچھ نہ کچھ مماثلت ہے لیکن وادیٔ سندھ کی مہروں پر پائی جانے والی انسانی تصاویر، سومیری اور ایلمی تصاویر سے بالکل مختلف ہیں اور ماہرین کے مطابق ان تصاویر کی بناوٹ کا اسلوب مصری ہیروغلافی خط سے ملتا جلتا ہے۔ بعض ماہرین نے وادیٔ سندھ کے رسم الخط اور کریٹ (Crete) کے رسم الخط میں مماثلت ظاہر کی ہے۔ مشہور ماہر آثارِ قدیمہ B.Hrozny نے اپنی کتاب Ancient History of Western Asia, India and Crete (Prague, Czechoslovakia) میں اپنی تحقیقات کا رخ اس سمت مرکوز کیا ہے کہ ہڑپہ کی مہروں پر پائے جانے والے نشانات اور حتی (Hittite) قوم کے تصویری رسم الخط کے درمیان کافی مشابہت تلاش کی جا سکتی ہے۔ پروفیسر لینگڈن نے اشوک کے زمانے کے براہمی رسم الخط کو سندھی رسم الخط سے ماخوذ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وادیٔ سندھ کے رسم الخط میں اس دور کے تمام اہم رسم الخط سے پائی جانے والی مماثلت، مشابہت اور مطابقت ایک حیرت انگیز بات ہے جس پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ ہماری رائے میں وادیٔ سندھ کا رسم الخط انتہائی زرخیز اور گہرا رسم الخط تھا جس کے اندر یہ صلاحیت موجود تھی کہ وہ اس عہد کے تمام مروجہ رسم الخط کو اپنے دامن میں سمو کر ایک ایسا رسم الخط پیش کرنے کے قابل ہوا جو دنیا کی تمام اقوام کے لیے قابلِ فہم تھا۔ اس لیے مولانا ابو الجلالؒ کا یہ دعویٰ قرین قیاس نظر آتا ہے کہ دنیا کے تمام رسم الخط وادیٔ سندھ کے رسم الخط سے برآمد ہوئے اور دنیا کی تمام تر زبانوں کے حروف تہجی کا سلسلہ آخر کار وادیٔ سندھ پر جا کر مل جاتا ہے۔ وادیٔ سندھ کی زبان عربی کی ابتدائی شکل تھی اور عربی زبان ہی دنیا کی فطری زبان ہے۔

وادیٔ سندھ کے رسم الخط کی بحث میں ایک دلچسپ اور منفرد نقطۂ نظر ڈاکٹر ہنٹر کا ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے وادیٔ سندھ کے رسم الخط میں پائے جانے والے نشانات کا جنوبی عرب کے حمیری اور سبائی خط، قتیمی خط اور قبرصی خط سے گہرا تقابل کرنے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان تمام خطوط کا منبع اور ماخذ وادیٔ سندھ کا رسم الخط ہے لیکن اس نظریے کو محض اس بنیاد پر مسترد کرنے کی کوشش کی گئی کہ سندھ کی لکھائی سبائی اور قتیمی رسم الخط کے وجود میں آنے سے کم از کم دو ہزار سال پہلے فنا ہو چکی تھی لیکن یہ استدلال ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہے کیوں کہ سنسکرت زبان جو دنیا کی اعلیٰ ترین زبان سمجھی جاتی ہے اس کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں تھا اور اس نے دراوڑیوں کے رسم الخط “گرنتھا” کو اختیار کیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دراوڑی، آریاؤں کے ہاتھوں ذلت، رسوائی، تباہی و بربادی کا عذاب سہنے کے بعد دور دراز خطوں اور پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ ان کی زبان کا کوئی کتبہ مخطوطہ یا آثار یا مہریں دستیاب نہیں اس کے باوجود ان کا رسم الخط محفوظ رہا اور ان کا رسم الخط آریاؤں کو سنسکرت کے لیے اختیار کرنا پڑا۔ سنسکرت زبان کی قواعد موجود ہے۔ اس کی لغت بھی دستیاب ہے مگر اس کے بولنے والے ختم ہو چکے ہیں۔ دراوڑیوں کی نسل ابھی تک موجود ہے لیکن ان کے اصول و قواعد زبان و لغت کے منتشر اجزا تو مل جاتے ہیں لیکن سنسکرت کی طرح منظم اور مربوط صورت میں نہیں ملتے۔ لہٰذا کسی تہذیب کے فنا ہو جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس تہذیب سے متعلق ہر چیز فنا ہو چکی ہو۔ فنا مقامی ہوتی ہے مثلاً ہڑپہ اور موئن جو دڑو پر عذابِ الٰہی نازل ہوا اور قرآن کی زبان میں “بستیوں کو الٹ دیا گیا تلپٹ کر دیا گیا” لیکن ان بستیوں سے اٹھنے والی تہذیب، جنم لینے والی زبان، برآمد کی جانے والی مصنوعات اس تہذیب کی خصوصیات اور کمالات کو لے کر دنیا کے تمام خطوں میں پہنچ چکی تھیں اور وہاں پر وہ تمام چیزیں محفوظ رہیں کیوں کہ عرب عجم کی ان تہذیبوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل نہیں ہوا اور وہاں کی بستیاں تباہی و بربادی سے محفوظ رہیں لہٰذا انھوں نے وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بہت سے نشانات کو لازماً محفوظ رکھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹ویں صدی میں جب عراق میں بڑے پیمانے پر آثار قدیمہ کی کھدائی ہوئی تو وادیٔ سندھ کی مہریں اور نشانات وہاں سے برآمد ہوئے۔ فہرست ابن ندیم جو چوتھی صدی ہجری کی کتاب ہے اس کے مصنف محمد بن اسحاق کے پہلے مقالے میں وادیٔ سندھ کے رسم الخط کے چار نمونے دیے گئے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وادیٔ سندھ کا رسم الخط چوتھی صدی ہجری میں دنیائے عرب کے اندر معروف و مشہور تھا جب کہ مارشل کا دعویٰ ہے کہ اس نے ۱۹۲۰ء میں کھدائی کے بعد اس رسم الخط کی مہریں دریافت کیں۔ لہٰذا ابن ندیم نے مارشل سے آٹھ سو برس قبل اس خط کا ذکر کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں یہ خط مستعمل تھا۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب اپنے عہد کی غالب ترین اور طاقتور ترین تہذیب معلوم ہوتی ہے۔ اس

تہذیب کی چکا چوند، چمک دمک، ثقافتی اور جمالیاتی کمالات جو مصنوعات کے ذریعے اپنا اظہار کر رہے تھے دنیا کے تمام خطوں تک پہنچ چکی کہ جزیرہ ایسٹر کی لکھائی کی بعض علامتیں اور نشانات D.E. Hevesy کے مطابق وادئ سندھ سے ملتے جلتے ہیں۔ جزیرہ ایسٹر وادئ سندھ سے ہزاروں میل کے فاصلے پر بحرالکاہل میں واقع ہے۔ جزیرہ ایسٹر کا رسم الخط ۱۸ ویں صدی کے اختتام تک موجود تھا۔ سوال یہ ہے کہ پانچ ہزار سال قبل مٹ جانے والے سندھ کے رسم الخط کی علامتیں جزیرہ ایسٹر میں کیسے موجود تھیں؟ اس سے بھی اہم ترین سوال یہ ہے کہ چوتھی صدی ہجری کی فہرست ابن ندیم میں وادئ سندھ کے رسم الخط کے نمونے زندہ رسم الخط کے طور پر کیسے درج ہوئے؟ پروفیسر ڈاکٹر ایل اے وڈل Waddel نے اپنی کتاب The Indo-Sumerian Seals Decipher (London 1925) میں وادئ سندھ کی مہروں کو سومیری رسم الخط ثابت کرنے کی کوشش کی اور وادئ سندھ کو سومیری نوآبادی ظاہر کیا۔ [۱۲]

ام السنہ سنسکرت یا عربی:

مغربی محققین سنسکرت کو مادر لسانیات قرار دیتے ہیں لیکن مولانا ابوالجلال ندوی کی تحقیق کے مطابق:

عربی ہی ایک زبان ہے جو انسان کی فطری زبان کہی جا سکتی ہے، دنیا میں صدہا زبانیں بولی جاتی ہیں، ان زبانوں کو ہم مختلف گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک گروہ کی زبانوں کا اجمالی نام "انڈو یورپین" دوسرے گروہ کا نام "انڈو ایرانین" ہے اس کی بھی دو ذیلی شاخیں ہیں ہندیائی (Indic)، ایرانین (Iranian) ان زبانوں میں سب سے قدیم تر زبان سنسکرت ہے دوسرے گروہوں کی زبانوں کا نام "السنہ سامیہ" فرض کیا جاتا ہے، ان میں سب سے قدیم تر زبان سریانی ہے مگر وہ سریانی نہیں جو آج سے چند ہزار سال قبل بولی جاتی تھی بلکہ وہ سریانی جسے نوح یا سامی قبائل کے آبائے اولین بولتے تھے"۔

عربی اور عربی مبین:

وہ عربی جس میں قرآن مجید اترا ہے قدیم عربی نہیں، قرآن مجید تو عربی مبین میں اترا ہے جو قبیلہ قریش کی زبان کا نام ہے، یہ زبان قبائل مضر کی فصیح ترین زبانوں کے چیدہ الفاظ اور ترکیبوں کا مجموعہ ہے چوں کہ یہ زبان تمام قبائل عرب کی سمجھ میں بوضاحت آجاتی تھی اس کا نام "مبین" تھا، ہم جس عربی سے واقف ہیں وہ مضر کے سات قبائل کی زبانوں کے ساتھ منقول ہے، یہ قبائل ہمیشہ خانہ بدوش اور غیر شہری رہے، شہریت کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ قوموں کی دماغی حالت روز بروز ترقی پذیر ہوتی رہتی ہے، معلومات، احساسات، ضروریات اور اغراض میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے، شہریت کے باعث الفاظ میں تراش خراش پیدا ہوتی رہے لیکن بداوت کا طبعی اقتضاء یہ ہے کہ اقوام کی دماغی حالت ساکن ہوتی ہے، ضروریات و معلومات محدود ہوتی ہیں، بہت زیادہ تراش خراش کی ضرورت نہیں پڑتی نہ دوسری اقوام کی زبانوں کا اثر قبول کرنے کی حاجت ہوتی ہیں، اس بناء پر بدویوں کی

زبانیں کم تغیر پذیر ہوتی ہیں اور جلد جلد اپنی نوعیت نہیں بدلتی رہتیں، اس قاعدے کے مطابق قبائل مضر کی زبانیں اپنی اصل سے بہت زیادہ مشابہ ہوں گی۔

عربی اور غیر زبانیں:

عربی مبین دنیا کی زبانوں میں سب سے زیادہ فطرت کے مطابق ہے۔ عربی زبان کے الفاظ اپنے معنی پر محض فرض و اصطلاح و ریخت و اتفاق سے دلالت نہیں کرتے بلکہ ہر لفظ اپنے معنی کو چند خاص نوامیس قدرت کے مطابق ظاہر کرتا ہے، الفاظ اور معنی میں ربط پیدا ہونے کی وجہیں عربی علم اشتقاق کے اصول پر غامض نظر ڈالنے کے بعد اس قدر واضح ہو سکتی ہے کہ ہم غیر زبانوں کے الفاظ کو بھی عقلی طور پر سمجھ لینے کی قوت اور ملکہ پیدا کر سکتے ہیں۔

عربی زبان کی اقسام:

خالص قحطانی زبانوں میں صرف حمیری زبانوں کا حال معلوم ہے۔ عرب کے علمائے لغت کی روایتیں ظاہر کرتے ہیں کہ حمیری زبان میں اعراب نہ تھے اور قدیم عربی میں بھی اعراب نہ تھے، اعراب کا استعمال اہل عرب کو اسماعیلی نسل کے مستعرب عربوں نے سکھایا۔

خالص عربی تو طسم، جدیس اور عمالقہ وغیرہ تباہ شدہ قبائل کی عربی تھی۔

عربی مبین [۱] قدیم عربی [۲] عہد قحطان کی سریانی [۳] عہد اسماعیل کی عبری الفاظ اور ترکیبوں سے مرکب ہے، چوں کہ یہ تینوں زبانیں ایک ہی اصل کی شاخیں اور ایک ماں کی بیٹیاں ہیں، ان کے میل سے جو زبان پیدا ہوئی وہ پھر بھی قدیم سریانی سے بہت مشابہ رہی۔

الفاظ کے تین معنی:

الفاظ اپنے اندر تین قسم کے معنی رکھتے ہیں [۱] نفسی کیفیات [۲] حسی امور [۳] ذہنی و اختراعی معلومات۔

چناں چہ خیال، علم، عام ادراک وغیرہ الفاظ پر غور کرو، خیال کی اصل خیالہ [نگرانی] ہے چوں کہ شے کی نگرانی کے لیے شے کا خیال ضروری ہے اس لیے خیالہ سے خیال بنا، خود خیالہ بھی کوئی حسی مفہوم نہیں ہے، خیالہ کا اصلی ترجمہ گھوڑوں کی رکھوالی ہے جس طرح ابل سے ابالہ بنا اسی طرح خیل سے خیالہ بنا، خیل اگرچہ حسی چیز کا نام ہے مگر یہ بھی اصلی لفظ نہیں ہے، اشیاء کے نام عموماً وصفی نام ہوتے ہیں، جن میں سے وصفیت فنا ہو جاتی ہے، خیل کی اصل "خال" ہے، خال ایک قسم کی چال کا نام ہے، یہی لفظ اصل ہے کیوں کہ عربی علم اشتقاق کی رو سے حرف حلقی اور حرف مکرر [ر۔ل] کا وہ مجموعہ ہے جس میں کوئی حرف شدید نہ ہو، حرکت ظاہر کرتا ہے۔

حسی معانی کی پانچ قسمیں:

حسی معانی کی پانچ قسمیں ہے [۱] مسموع یعنی آوازیں [۲] مرئی جیسے لمبائی، چوڑائی، موٹائی، رنگ، حرکت، فصل، فاصلہ وغیرہ [۳] مشموم جیسے بدبو، خوشبو جیسے سونگھنا یا سونگھنے کی چیزیں [۴] طموس جیسے لمس، چکنا، ملنا وغیرہ معانی جن کا تعلق مساس سے ہے۔ [۵] مذوق یعنی زبان سے محسوس کی جانے والی چیزیں اور کیفیتیں، دیلمی نے ''مسند فردوس'' میں روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری امت مجھے آب و گل کی حالت میں دکھائی گئی اور آدمؑ کی طرح اس کو بھی تمام اسماء کی تعلیم دی گئی، اس سے معلوم ہوا کہ خدا نے الہام طبعی کے ذریعہ انسان کو بولنا سکھایا۔

عربی الفاظ کی قسمیں:

عربی زبان کے الفاظ کی چار قسمیں ہیں [۱] ایک حرفی [۲] دو حرفی [۳] سہ حرفی [۴] زائد از سہ حرف، چوتھی قسم کے الفاظ دو قسم کے ہیں، بعض تو وہ ہیں جو سہ حرفی لفظوں میں چند حروف کے اضافے یا کسی حروف کی تضعیف سے پیدا ہوئے جیسے قاتل مقتول وغیرہ وغیرہ بعض وہ ہیں جو دو ثلاثی کے باہم مل کر ایک ہو جانے سے پیدا ہوئے، ایک قسم کے الفاظ کو منحوت کہتے ہیں، رباعی اور خماسی عموماً منحوت ہیں۔

دو حرفی الفاظ کی اہمیت:

سہ حرفی لفظ کو عربی زبان کی بنیادی اصلیت قرار دیا جاتا ہے مگر عربی زبان پر غور کرو تو اس کی صدہا مثالیں ملیں گی، مضاعف، اجوف، معتل اور وہ سہ حرفی الفاظ جو لام کلمہ کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد مضاعف کی آواز کے مشابہ ہوں، ذرا ذرا سے فرقوں کے ساتھ تقریباً یکساں معنی ظاہر کرتے ہیں مثلاً غط [غوطہ دینا] غوط [ڈوبنا] تغطی [ڈھانپ لینا۔ ڈوبا لینا] قط، قطع، قطف سب کاٹنا ظاہر کرتے ہیں

قص، قصل، قصم، قصب سب تقریباً ہم معنی ہیں، اس قسم کی بہتیری مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ثلاثی الفاظ بھی اصل میں دو حرفی آوازوں سے پیدا ہوتے ہیں، یک حرفی الفاظ کے متعلق بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ دو حرفی لفظوں کا مخفف ہے۔ انسان سب سے پہلے دو حرفی آوازیں پیدا کر سکتا ہے اور سب سے پہلے انسان کو چیزوں کی طلب ظاہر کرنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی قدیم زبانوں میں طلب کے صیغے یعنی امر کے الفاظ دو حرفی ہوتے ہیں۔ عربی میں اجوف کا امر ہمیشہ دو حرفی ہوتا ہے۔

الفاظ کی ابتدائی اصل:

مختصر یہ کہ الفاظ کی ابتدائی اصلی دو حرفی آوازیں ہیں جو کسی چیز سے سنائی دینے والی آوازوں یا انسان کی بعض غیر اضطراری آوازوں کی پے بہ پے نقل سے معرض وجود میں آئی تھی، ان آوازوں کو ہم چند قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں [۱] ہم مخرج حرفوں کا مجموعہ [۲] باہم متشابہ حروف سے بنا ہوا لفظ [۳] دو متباین جنس کے حروف سے بنا ہوا لفظ، چوں کہ حروف کی پانچ قسمیں ہیں حلقی، حنکی [تالو کے حروف] تجی [ر۔ل۔ن] سنی [دندانی] شفوی

[لب کے حروف]۔

زبان کی ابتداء:

خلاصہ یہ ہے کہ ہماری زبانوں کی ابتداء صرف گیارہ قسم کے معنی اور بارہ قسم کے الفاظ سے ہوئی اور ان ہی بارہ قسم کے الفاظ سے صدہا زبانیں پیدا ہوئیں۔ دنیا بھر کی زبانوں کے بسیط حروف کو پانچ جنسوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان میں اکثر حروف صرف لہجے کے اختلاف سے الگ نظر آتے ہیں۔ ورنہ حقیقت ان کی ایک ہے اصل حروف جو دنیا بھر کی زبانوں میں ادا کیے جا سکتے ہیں صرف چودہ ہیں [۱] ہمزہ، [۲] ب، [۳] م [۴] ک [۵] ج [۶] ر [۷] ل [۸] ن [۹] س [۱۰] و [۱۱] ی، [۱۲] الف [۱۳] دیا [ڈ] [۱۴] ت [دیا ٹ]۔

ابتداء میں انسان کی زبان کوئی مستقل نوعیت نہ رکھتی تھی نہ تو الفاظ کے اوزان، صیغے اور شکلیں کوئی خاص آواز کی مالک بنی تھی اور نہ الفاظ اور معنی کے ربط میں کوئی استقلال پیدا ہوا تھا۔ اس طرح الفاظ کی آوازیں ابتدائی عہد میں کچھ مستقل نہ ہوں گی۔ انسان کو اپنی زبان پر کافی قابو نہ ہوگا لیکن جب دنیا میں بنی نوع آدم جب مختلف قوموں کی شکل میں پھیل گئے تو آہستہ آہستہ قوم نے مستقل لہجے، مستقل صیغے اور مستقل شکلوں کے الفاظ استعمال کرنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ لفظ اور معنی میں مستقل ربط پیدا ہونے لگا۔ دنیا کی موجودہ زبانوں کی اصل وہی مستقل زبانیں ہیں جو بالکل ابتدائی عہد میں آدم کی غیر مستقل زبان سے پیدا ہوئیں۔

دنیا کی ابتدائی زبانیں:

ابتداء میں دنیا کی تمام زبانیں باہم مشابہ ہوں گی، ان میں فرق یہ ہوگا کہ، ایک قوم میں کسی معنی کے لیے ایک لفظ استعمال کیا جاتا ہوگا تو دوسری قوم میں اس لفظ کا الٹا۔

ہندوستان میں دیوتا کا وجود نہایت مقدس ہے، ایران میں دیوتا نہایت خطرناک چیز ہے، عرب ابر کو غیم بولتے ہیں تو فارس والے میغ، ہندوستانی زبان میں میگھا اوتا ر بارش کا دیوتا ہے عربی کا اباب فارسی میں آب ہے ہندوستانی زبان میں اپ چناں چاپ پا رتم آبخورہ کو کہتے ہیں، انگریزی میں بھی اباب[E ┘ ú bb]ن کر پانی کی ایک خاص کیفیت [جزر] کو ظاہر کرتا ہے تقریباً ہم صورت الفاظ کسی زمانے میں باہم مترادف تھے مگر جس تدریج کے ساتھ انسانی معلومات میں اضافہ ہوتا رہا ہے ہر نیا لفظ اصلی مفہوم سے قریب تر معنی اختیار کرتا رہا، تا آنکہ اب دنیا میں کوئی دو لفظ ایسے نہیں جو ایک زبان میں مرادف ہوں، عربی زبان میں اب بھی متشابہ الصوت الفاظ کثرت کے ساتھ باہم مشابہ ہوتے ہیں مثلاً قتل [مار ڈالنا] قطل [درخت کاٹنا] قطم [دانت کے ساتھ کھانا] تقدیر [اندازہ کرنا، جدا جدا کرنا وغیرہ الفاظ کا مفہوم مشترک یا ایک جز کا ٹوٹ کر دو ہونا یا دو چیزوں کے درمیان فصل پیدا ہونا ہوتا ہے شکست کی حالت میں چیزوں سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اس لفظ کی اصل شکل سے کس قدر مشابہت ہے۔

عربی حروف کی خاصیت:

حروف کی ترتیب بدلنے پر بھی الفاظ کے معانی تقریباً یکساں رہتے ہیں مثلاً دلک [ملنا] لدک [چپکنا] تکلید [تلے اوپر جمع کرنا] تلکد [چپکنا] ذوکل [مٹی سانتا] یہ الفاظ درحقیقت ایک مفہوم یعنی دو جسم کا ایک دوسرے کے ساتھ التصاق ظاہر کرتے ہیں۔

عربی زبان اور دوسری زبانوں میں فرق یہ ہے کہ اس زبان کے الفاظ اپنے معنی کو جن وجوہ اور اسباب کے ماتحت ظاہر کرتے ہیں وہ تشابہ الاصوات کے مطالعے سے بتشریح معلوم ہو سکتے ہیں۔

زبانوں کی ابتداء وارتقاء:

الفاظ کی ابتدائی شکل، حروف کی پانچ اقسام، صرف گیارہ قسم کے معانی اور بارہ قسم کے الفاظ سے زبانوں کی ابتداء وارتقاء کا نظریہ اور انہی ۱۴ اقسام کے حروف سے صدہا زبانوں کی ترویج واشاعت کے موضوعات پر مولانا نے نکتہ آفرینی کے کمالات دکھائے ہیں۔ مولانا ابوالجلال ندوی کے خیال میں اصل حروف وہ ہیں جو دنیا بھر کی زبانوں میں ادا کیے جاسکتے ہیں۔ اس قسم کے حروف صرف ۱۴ ہیں۔

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
ہمزہ	ب	م	ک	ج	ر	ل
۸	**۹**	**۱۰**	**۱۱**	**۱۲**	**۱۳**	**۱۴**
ن	س	و	ی	الف	دیا	ڈت [یاٹ]

تمام زبانوں کے چودہ مشترک الفاظ:

تمام زبانوں میں چودہ حرف مشترک ہیں اس لیے یہ حروف تمام زبانوں میں ادا کیے جاسکتے ہیں یہی اصل حروف ہیں۔ ان چودہ حروف کے سوا جتنے حروف ہیں وہ فرع ہیں، اصل نہیں ان ۱۴ حرفوں کو باہم ضرب دو تو ۱۱۹۲ الفاظ پیدا ہوں گے۔ ہماری زبانوں کی ابتداء صرف گیارہ قسم کے معانی اور چودہ قسم کے الفاظ سے ہوتی ہے اور انہیں الفاظ سے صدہا زبانیں پیدا ہوئی ہیں۔

الفاظ کی اصل دو حرفی آوازیں:

الفاظ کی ابتدائی اصل دو حرفی آوازیں ہیں جو کسی چیز سے سنائی دینے والی آوازوں یا انسان کی بعض غیر اضطراری آوازوں کی پے بہ پے نقل سے معرض وجود میں آئی تھیں، مثلاً انسان نے لکڑی کاٹنے کے لیے جب اس پر اپنا اوزار مارا تو جو آواز نکلی وہی اس عمل کا نام ہو گئی مثلاً اردو، ہندی اور انگریزی میں کٹ اور عربی میں قطع۔

غور کیجیے تو عربی کا ماء ہو انگریزی کا واٹر، جرمن کا واسر ہو، فارسی کا آب ہو یا اردو ہندی کا پانی سب کو ادا کرتے وقت پیاس کے ماروں کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے، خواہ ادائیگی کے بعد بند ہو جائے۔

عربی کا لفظ ہے ''سری''، یہی لفظ ہندی اور سنسکرت میں ''شری'' فارسی میں ''سردار'' انگریزی میں Sir اور سائر Sire بنا۔ مولانا نے مختلف زبانوں کے بے شمار الفاظ کا تقابلی مطالعہ کر کے بتایا کہ ایک ہی لفظ املا یا تلفظ کے فرق کے ساتھ ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ ایسی امثال ان کے نوشتوں میں بکھری ہوئی ہیں، جنھیں جمع کیا جائے تو بہت سے عقدے حل ہو سکتے ہیں۔

ہفتہ [فارسی اردو]، سبت [عبرانی عربی] اور سپتاہ [ہندی] کی صوتی مماثلت کا ذکر کرتے ہوئے مولاناؒ نے پوچھا کہ ہر جگہ ہفتہ سات دن کا کیوں ہوتا ہے؟ دنیا کے کسی حصے میں کم یا زیادہ کیوں نہیں ہوتا؟ پھر بتایا کہ ہر سات دن بعد چاند کی شکل بدل جاتی ہے۔ ابتدائی سات دنوں میں وہ ہلال سے شروع ہو کر نصف تک پہنچ جاتا ہے۔ اگلے سات دنوں میں پورا ہو کر بدر بن جاتا ہے بعد کے سات دنوں میں پھر آدھا ہو جاتا ہے اور آخری سات دنوں کے بعد پھر طلوع ہونے کے لیے غائب ہو جاتا ہے شاید ان کا استدلال یہی تھا کہ قمری تقویم ہی فطری تقویم ہے۔

ابتدائی چار حروف:

ابتدائی چار حرفوں [حروف تہجی] کے یونانی نام الفا (Alpha) بیٹا (Beta) گاما (Gamma) اور ڈلٹا (Delta) خبر دیتے ہیں کہ یہ نقوش اپنے ناموں سمیت الف، بیت، جمل دالت [عبرانی] بولنے والی قوم کے ذریعے یورپ پہنچے ان حروف کو یوروپ میں فنیقیوں نے پہنچایا، یہی حروف عربی میں الف ب ج دال ہیں۔

سید سلیمان ندویؒ اور ندوہ والے انھیں زبان پر سند سمجھتے کسی لفظ کا ماخذ دریافت کرنا ہوتا تو سید سلیمان ندویؒ کہتے اس لفظ کی ٹانگیں توڑ لاؤ۔ مولانا جواب دیتے ہم تو صرف لفظوں کی ٹانگیں توڑتے ہیں مردوں کے کفن نہیں کھولتے۔ ان کا اشارہ مولانا سلیمان ندویؒ کی تاریخ نویسی کی طرف ہوتا کہ وہ کس طرح تاریخ کھود کر نکالتے تھے۔ مولانا ابو الجلالؒ مختلف زبانوں میں ارتباط باہمی کے رشتے تلاش کرتے ہوئے بتاتے ہیں [۵۴] ''مثال کے طور پر میں کہتا ہوں کہ حضرت موسیٰؑ کا قول ہے:

شمع یاإسرائیل اِلُوحیک اِلُوحیم اَحدیم''

[سنو! اے اسرائیل تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے]

اب میں اس کا عربی میں ترجمہ کرتا ہوں۔

اِسمَع یا اِسرائیل اِلٰھکم اِله واحد [سنو اے اسرائیل تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے]

کیا یہ دو مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں؟ دونوں میں کوئی رشتہ نہیں ہے؟ سب سے بڑی مثال...... جو مشہور جملہ ہے انجیل میں ...... حضرت مسیحؑ کی زبان سے ...... تقریباً ہر بائبل میں لکھا ملتا ہے کہ: ’’ایلی ایلی لما سبقتانی‘‘ ہر زبان کی بائبل میں [عبرانی کا] یہ فقرہ اصل حالت میں موجود ہے...... تو:

شَبَق کے معنی عبرانی میں ہیں ’’پیچھے چھوڑ گیا‘‘

سبق کے معنی عربی میں ہیں ’’آگے بڑھ گیا‘‘

ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

ایلی ایلی: الٰہی الٰہی [میرے اللہ...... میرے اللہ]

لما: لما [کیوں]

سبقتانی: ترکتني [مجھے چھوڑ دیا]

اسلوب تو ایک ہی ہے۔ ہر زبان میں ایک مفہوم کو ادا کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ:

سنسکرت: تتا متی: [تو وہی ہے]

فارسی: تو ہمائی: [تو ہی سب میں ہے]

انگریزی: Thou art that [تو وہی ہے]

عربی: لا الٰہ الا اللہ [کوئی نہیں الٰہ سوائے اللہ کے]

یہ مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں۔ مگر کیا ان زبانوں میں کوئی رشتہ نہیں ہے؟

صرف طرزِ بیان کا فرق ہے‘‘۔[۱۳]

دنیا کی پہلی زبان کیا تھی؟

بائبل کی کتاب پیدائش (۱۱/۱۔۹) کا بیان ہے کہ طوفان نوح تک سارے انسانوں کی ایک ہی زبان تھی پھر جو لوگ غرق ہونے سے بچے تھے وہ ملک شنار کی طرف گئے اور وہاں پختہ اینٹوں سے ایک شہر بنانا شروع کیا اور اس میں ایک مینار بھی بنانا چاہا جو اتنا بلند ہو کر آسمان تک پہنچ جائے۔ یہ بات خدا کو پسند نہ آئی اور وہ آسمان سے اتر کر اس مقام کو آیا اور ان لوگوں کو سارے کرہ ارض پر منتشر کر دیا۔

بائبل کی ان آیات میں مینار کا بیان غالباً اس منشاء کا اظہار ہے کہ وہ لوگ مینار پر چڑھ کر خدا کو دیکھنا چاہتے تھے لہٰذا خدا نے ناراضگی کے باعث ان کو کرہ ارض منتشر کر دیا۔ اس انتشار کے باعث ان کی زبان بھی منتشر ہوگئی اور جس جگہ یہ مینار بنا گیا تھا اس مقام کو بابل کا نام دیا گیا جس کے معنی ہیں زبانوں کا مختلف ہو جانا یعنی نئی زبان کا پیدا ہونا۔

باب پیدائش کی آیات یہ بتاتی ہیں کہ کائنات کا آغاز ہوا تو کائنات کی زبان ایک ہی تھی۔ کائنات کے پہلے انسان آدمؑ حواؑ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور پیغمبر تھے جن سے نسل انسانی کا آغاز ہوا، تاریخ اور الکتاب بتاتی ہے کہ پیغمبر زبان اور کتاب کے بغیر ظہور نہیں فرماتے۔ جب کائنات کا آغاز روشنی، کتاب اور رسالت کے سائے میں ہوا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ روئے زمین پر پیغمبر اور پیغمبر کے گھرانے والے طلاقت لسانی سے محروم ہوں اور اشاروں کنایوں میں گفتگو کرتے ہوں اور اشاروں، کنایوں میں بات چیت کا یہ سلسلہ صدیوں تک جاری و ساری رہا ہو۔ ہندوؤں کی مذہبی کتاب مقدس اپنشد میں درج ہے ’’ہر نام کی ابتداء حرف سے ہوئی اور حروف ہی سے ہر نام منسوب کیا گیا۔ انجیل مقدس میں منقول ہے۔

In the Begining was the Word and the word was with God and the word was God

قرآن کریم کی پہلی آیت ہے ’’اقرا باسم ربک‘‘ اس کا انگریزی ترجمہ **Proclaim the word of God** مفسرین اور علمائے حق نے اقراء کے لیے دو لفظ استعمال کیے پڑھ اور بول انگریزی میں اس کے لیے Read اور Proclaim کے الفاظ منتخب کیے گئے جب کہا گیا ’’پڑھ‘‘ یا ’’کہہ‘‘ تو یہ اعلان کا حکم رکھتا ہے۔ ان تینوں الفاظ پڑھ، کہہ اور بول میں مشورہ بھی ہے، ترغیب بھی ہے اور حکم بھی۔ دنیا کے تین بڑے مذاہب کی مذہبی اور الہامی کتابیں اسی بات کی توثیق کرتی ہیں کہ حرف اور اسم سے ہی خدا کا ذکر کیا جاتا ہے اور کائنات کا آغاز ذکر خداوندی سے ہی ہوا۔

دنیا میں زبان کے آغاز و ابتداء کے بارے میں قدیم ترین نقطہ نظر الہامی نقطہ نظر ہی رہا ہے۔ تحریف کے نتیجے میں ظہور پذیر مذاہب میں بھی زبان کے لحاظ سے الہامی نقطہ نظر کی جھلک تو نظر آتی ہے مگر یہ تحریف شدہ نقطہ نظر ہے لیکن اس کی اساس یہ الہام ہے کہ اللہ نے آدم کو اسماء سکھائے اور زبان و بیان کی صلاحیت عطائے ربانی ہے۔

مذہبی نقطہ نظر ایک دو روز کا قصہ نہیں لاکھوں کروڑوں سال کا قصہ ہے تاریخ بتاتی ہے اور بالکل ٹھیک بتاتی ہے کہ زمانہ قدیم میں لوگ زبان کو عطیۂ خداوندی اور فن تحریر کو دیوتاؤں کی ایجاد سمجھتے تھے۔ چناں چہ سنسکرت کو ’’دیوتاؤں کی زبان‘‘ اور دیوتا گری کو ’’دیوتاؤں کا خط‘‘ ماننے کا عقیدہ اب تک چلا آتا ہے۔ اسی طرح دیوتا گری کا پیشرو براہمی خط برہما کی ایجاد مانا جاتا تھا۔ قدیم اہل مصر فن تحریر کا موجد تھاتھ دیوتا کو مانتے تھے جس کا جسم انسان کا لیکن سر آئی بس نامی پرند کا بتایا جاتا تھا۔ اسی دیوتا کو وہ ریاضی اور علوم نجوم کا بانی سمجھتے تھے۔ عراق کے قدیم باشندے فن تحریر کو اونیس دیوتا سے منسوب کرتے تھے۔ ان کی روایت کے مطابق وہ روز سمندر سے نکل کر انسان کو تہذیب و تمدن کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اسی لیے اسے مچھلی کی کھال اوڑھے دکھایا

جاتا یا پھر اس کا اوپر کا جسم انسان کا اور نیچے کا مچھلی کا بناتے تھے۔

زبانوں کے آغاز کے بارے میں دنیا کا قدیم ترین نقطۂ نظر مذہبی یا الوہی نظریہ کہلاتا ہے جس میں زبانوں کی اصل الوہی یا الہامی قرار دی گئی ہے۔ اس اقرار کے باوجود بعض مذاہب نے اپنی زبان کو قدیم ترین قرار دیا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک اصل زبان عبرانی تھی۔ ہندوؤں نے سنسکرت کو قدیم جانا، بدھوں کے نزدیک پالی پراکرت قدیم ترین زبان ہے۔ جینیوں کی لسانیات کی کئی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ اردھ ماگدھی پراکرت کو انسان و حیوان کی ازلی زبان مانتے ہیں۔ اس دعوے کی بنیاد یہ مفروضہ تھا کہ پیر تھنکروں کے وعظ نہ صرف انسان بلکہ حیوان بھی سمجھتے تھے آخری تھنکر پرسوامی دیہات کے رہنے والے تھے وہ اپنی زبان اردھ ماگدھی میں وعظ کرتے تھے۔ بعض قوموں نے بھی اپنی زبان کو دنیا کی پہلی زبان قرار دینے کی کوشش کی۔ مثلاً سولھویں صدی میں ولندیزی عالم بے کانس نے ڈچ زبان کو اور اسی زمانے میں دو اور محققین نے بہت ہی قدیم جرمن کو اصل زبان قرار دیا۔

قرآن کریم میں آدمؑ کو نام سکھانے کا ذکر مختلف آیات میں آیا جس میں اللہ تعالیٰ آدمؑ کو تمام اسماء سکھاتے ہیں پھر ان موسوم شدہ چیزوں کو فرشتوں کو دکھا کر پوچھتے ہیں کہ کیا تم ان چیزوں کے نام بتا سکتے ہو؟ فرشتے اپنی بے علمی کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ پھر آدمؑ ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاتے ہیں۔ جب آدمؑ نے ان کے نام بتائے۔ کم و بیش یہی قصہ بائبل کی کتاب پیدائش آیت ۱۹،۲/۲۰ میں درج ہے۔ بائبل کی آیات میں چیزوں کو نام حضرت آدمؑ دیتے ہیں۔ زبان و بیان کے سلسلے میں ناموں کی اہمیت بنیادی چیز ہے۔ کنفوشس کتابوں Wu Ching اور Shih Shu میں ناموں کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اپنشد، بائبل، کنفوشس اور قرآن کریم سے اسماء کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہی اسماء حروف و الفاظ کی صورت میں زبان کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں اسی لیے کائنات کے آغاز سے پہلے ہی ایک مکمل زبان سے آدم و حوا علیہما السلام کو واقف کرا دیا گیا تھا۔

قرآن کریم نے انسان کے بارے میں بیان فرمایا ”**لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم**‘ ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ”**خلق الانسان علمه البیان**“ (رحمٰن) ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا لہٰذا کائنات کا آغاز انسان نے زبان و بیان کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے ساتھ کیا۔ یہ الہامی نقطۂ نظر ہے اور بالکل درست نقطۂ نظر ہے۔ سائنس اس کی تردید نہیں کر سکتی اور اس کی تردید کی کوئی حیثیت نہیں۔

سائنس کو اس طریقے سے رد کرنے پر کچھ لوگوں کو حیرت ہوگی لیکن اس حیرت کی کوئی وجہ نہیں۔

سائنس کے نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں مثلاً پہلے سائنس دانوں کا دعویٰ تھا کہ آدم کی تخلیق اور دنیا کی

تخلیق کو ساڑھے سات ہزار سال ہوئے ہیں اور بعض مورخین کی تحقیقات کے مطابق دنیا کی معلومہ تاریخ ساڑھے سات ہزار سال کا احاطہ کرتی ہے جب کہ فی الحقیقت دنیا کے آغاز کو کتنی صدیاں گزر چکی ہیں؟ اس کا ادراک ذہنی انسان کی رسائی سے ماورا ہے۔ ۱۹ویں صدی تک دنیا کی عمر لاکھوں سال بیان کی گئی تھی۔ ۲۰ویں صدی میں اس کی عمر کچھ اور بڑھ گئی لیکن تازہ ترین تحقیقات کے مطابق دنیا کی عمر ڈھائی کروڑ سال سے زیادہ ہے اس سلسلے میں آسٹریلیا میں دریافت ہونے والے رکازات (fossils) سے زندگی کے معروف نظریے کی نفی ہو گئی ہے

”اسکاٹ لینڈ سے بیالیس کروڑ اٹھاسی لاکھ سالہ قدیم زندگی کے آثار برآمد کر لیے گئے ہیں۔ جانوروں کی یہ باقیات ساحلی شہر اسٹون ہیون سے برآمد ہوئیں۔ سائنس دانوں نے ان رکاز (باقیات) کے تجزیے اور ان کے زمانے کے تعین کے لیے کئی ماہ صرف کیے۔ ان کی دریافت سے زمین پر حیوانی زندگی کی ابتداء کے بارے میں معروف نظریے کی نفی ہو گئی۔ رکاز کا نام انھیں دریافت کرنے والے بس ڈرائیور کے نام پر رکھ دیا گیا ہے۔ اسکاٹ لینڈ کا علاقہ اس زمانے میں خط استوار پر واقع علاقوں کا حصہ تھا۔ ان ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ دریافت اس اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ اس سے اس تصور کی نفی ہوتی ہے کہ زمین پر حیوانات کی زندگی کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ ان آثار کا نام انھیں دریافت کرنے والے شخص کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اس کے نام پر رکھا گیا ہے۔ مائیک نیومین نامی یہ شخص ایک بس ڈرائیور ہے اور بطور شوق قدیم آثار کی تلاش کرتا ہے“۔

سائنس دان ابھی تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ کائنات کا آغاز کب ہوا۔ ہر نیا دن کائنات کی عمر کے بارے میں ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے اور عموماً یہ نقطۂ نظر کائنات کی عمر میں اضافے کا ہی نقطۂ نظر ہے لیکن عین ممکن ہے کہ کچھ عرصے بعد کائنات کی عمر کم کرنے کا نقطۂ نظر قابل قبول ہو جائے۔ لہٰذا سائنس دانوں کے پاس کروڑوں سال پہلے کی معلومات موجود نہیں وہ محض قیاسات کی بنیاد پر تحقیقات پیش کرتے ہیں لسانیات کے حوالے سے بھی ان کی تحقیقات محض مفروضات، خواہشات، اور قیاسات کا دفتر ہے۔

لامحالہ ہمارے پاس لسانیات کے حوالے سے اہم ترین اور بنیادی ترین ماخذ مذاہب عالم کی کتابیں ہیں جن کو دنیا کے مختلف خطوں میں قرن ہا قرن سے نسل در نسل پڑھا جا رہا ہے اور کوئی محقق ان کتابوں کا انکار نہیں کر سکا۔

مذاہب سے قطع نظر ہم دنیا کی اہم زبانوں کے حروف تہجی کا تحقیقی مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں بھی وہی صورت حال نظر آتی ہے کہ ان حروف تہجی میں حیرت انگیز مماثلت اور مطابقت پائی جاتی ہے۔ ذیل میں

عربی، عبرانی، یونانی، حبشی، انگریزی زبانوں کے حروف تہجی تحریر کیے جا رہے ہیں۔

حروف تہجی کی یکسانیت اہم زبانوں میں

	عربی	عبرانی	یونانی	حبشی	انگریزی
۱	الف	الف	الفا	اَلف	a
۲	با	بیط	بیٹا	بیت	b
۳	جیم	گیمل	گاما	جیمیل	c
۴	دال	ڈالط	ڈیلٹا	ڈینٹ	d
۵	ہا	ہے	ایپ سی لون	ہوئی	e
۶	واؤ	واؤ	واؤ	واوے	f
۷	زا	زین	زیٹا	زائی	g
۸	حا	حیط	ایٹا	حاؤط	h
۹	طا	طیط	تھیٹا	طیئط	i
۱۰	یا	یود	آیوٹا	یمن	j
۱۱	کاف	کاف	کاپا	کاف	k
۱۲	لام	لامد	لامدا	لاوے	l
۱۳	میم	میم	مو	مائی	m
۱۴	نون	نون	نو	نحاس	n
۱۵	سین	سامک	سی	ست	p
۱۶	عین	عین	اومیکرون	عین	q
۱۷	فا	فے	پائی	الیف	r
۱۸	صاد	صادے	سان	صادائی	
۱۹	قاف	قوف	کوپا	قاف	s
۲۰	را	ریش	رہو	ریس	t
۲۱	شین	شین	سگما	شاؤت	u

۲۲	ت	تاؤ	تاؤ	تاوے	v

ان زبانوں کے حروف تہجی کے تقابلی مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں بنیادی فرق نہیں ہے۔ اس وقت دنیا میں زبانوں کے جتنے بھی خاندان موجود ہیں وہ انہی حروف تہجی سے زبان کا بازار سجاتے ہیں۔ حروف تہجی کی حد تک دنیا کی تمام بڑی اور اہم زبانیں یکساں نوعیت کی حامل ہیں اور حروف تہجی کی مماثلت اس دعوے کی اہم دلیل ہے کہ دنیا کی پہلی زبان ایک ہی تھی۔ اس دعوے کی دوسری اہم ترین دلیل یہ ہے کہ دنیا کی زبانوں میں ماں، باپ اور جنت کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ تقریباً تمام زبانوں میں مشترک ہیں۔

''فردوس'' جنت کے لیے معروف ترین لفظ، تمام انسانی زبانوں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے۔ سنسکرت میں ''پردیشا'' قدیم کلدانی زبان میں ''پردیسا''، قدیم ایرانی ژند میں ''پیری وائزا''، عبرانی میں ''پردیس''، ارمنی میں ''پردیز'' سریانی میں ''فردیسو''، یونانی میں ''باراداسوس''، لاطینی میں ''باراوائیسس'' عربی میں ''فردوس''۔ یہ لفظ ان سب زبانوں میں ایسے باغ کے طور پر بولا جاتا ہے جس کے گرد حصار موجود ہو وسیع ہو، قیام گاہ سے متصل ہو، ہر قسم کے پھل خصوصاً انگور پائے جاتے ہوں اور بعض زبانوں میں تو منتخب پالتو پرندوں، جانوروں کا بھی پایا جانا اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ قرآن سے پہلے عرب کے کلام جاہلیت میں بھی فردوس مستعمل تھا۔ اس کے بعد ماں باپ کے الفاظ پر غور کیجیے یہ بھی تمام زبانوں میں کم و بیش مشترک ہیں۔ یہی حال لفظ پانی کا ہے اور لفظ آخرت یا قیامت میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔

باپ

انگریزی	سنسکرت	عربی	ترکی	جاوانی نگوکو
Father	پترا	اب	بابا	بابا
مالائی	برائل	تبتی (تحریری)	پکھیا	تھولنگیا
باپا	باؤ	فا	بابائی	پاپ ۔ اپاپ
کھالنگ	دنوار	پاہری	چھنتگ	بھرامو
اپاپ	بابا	با	بابو	بابائی
دنوار	پاہری	چھنتگ	بھرامو	کسوار

بابا	با	بابو	بابائی	بابا یک
تھارو	کوچ	سب ساگر میری	بری (تحریری)	بری (بول چال)
بابا	باپ	بابا	فائی	فا ای
تونگھتو	ستنالی	بھومیج	اوراون	گیاقی
فا	بابا	بابو	بالی	بابا
رٹ لک	کولامی	ماڑی	کری	چینٹھو
باوا ۔ داوا	باو	بابا	با ۔ بابا	با

ماں

انگریزی	سنسکرت	عربی	باسک	گیامی
Mother	ماتر	ام	اما	ما
تکپا	مانیاک	ہورپا	اما	تبتی (تحریری)
اما	اما	اما	اما	اما
تبتی (بول چال)	سرپا	سنوار	گورنگ	مرمی
اما	اما	اما	امور	اما
مگار	تھکسیا	پاکھیا	لمبو	کیرانتی
ما	آما	اما	آما	اوما
روڈنگ	رنگچوں بنگ	چھنگ ٹنگیا	تھولنگ	ویلنگ
ما	اوما	اوما	اوما	اما

یاکھا	چوراسیا	کولنگیا	تھولنگیا	باہنگیا
ای ما	آمو	ای	مام	آمو
لوہورونگ	لمبچھونگ	بالالی	سانگ پانگ	ڈمی
اما	اما	اما	اما	مایام
ڈمی	کھالنگ	ڈنکمالی	پاہری	چپنگ
مایام	مام	اما	ی	امل
بجرامو	وایو	کسوار	کوسندا	لپ چا (سکم)
امل	اوی	آی	مائی	آمو
بھوٹانی لہوپا	بودو	دھمل	کوچ	گارو
آئی	اما	اما	ما	اما
کاچاری	سونی پوری	متھن ناگا	ابورمیری	بری (تحریری)
آای	اما	امو	ناما	ای
بری (بول چال)	کی	سگاؤ کیرن	پوو کیرن	تونگھتھو
ای	اما	مو	مو	من
انا میق	سیامی	اووم	خامتی	لاؤس
ی	ما	ی	ی	ی
بھومیج	نیکوڈی	کولامی	کیکاڑی	چینچو
مائی	اما	اما	اما	اما

تامل قدیم	ملیالم جدید	سنہالی
اماں	ماں	اما

پانی

انگریزی	سنسکرت	عربی	باسک	مانشو
Water	اپ	ماء	ار	ماکی
سوکپا	پکھیا	روڈنگ	سانگ پانگ	کسوار
واسو	پانی	وا	وا	پانی
تھارو	اوراون	راج محلی	رٹ لک	نیکوڈی
پانی	ام	ام	ار	ار
کولامی	ماڑی	کیکاڑی	چینشو	تودووا
ار	ار	تانی	پانی	مرو

۱۷۷۲ء میں برلن اکیڈمی نے زبان کے آغاز کے موضوع پر ایک مقابلہ منعقد کیا جس میں Herdel کا مقالہ بہترین مقالہ قرار دیا گیا اس مقالے میں اس نے الوہی نظریہ لسان پر اہم اعتراضات اٹھائے۔

۱۔ اگر زبان خدائی تخلیق ہوتی تو وہ بہت باقاعدہ ہوتی لیکن تمام زبانوں میں عجب بے اصولی و بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔

۲۔ زبان میں بنیادی الفاظ فعل کے مادے ہیں جن سے متعدد اسماء کا اشتقاق ہوتا ہے، اگر خدا زبان تخلیق کرتا تو ماجرا برعکس ہوتا وہ انسان کو سب سے پہلے چیزوں کے نام سکھاتا فعل بعد میں آتے۔ افسوس یہ ہے کہ ہرڈل نے قرآن کریم میں تخلیق آدم سے متعلق آیات کا مطالعہ نہیں کیا جہاں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے آدم کو نام سکھائے۔

جہاں تک زبانوں میں عجب بے اصولی و بے ترتیبی کا تعلق ہے یہ اعتراض کرتے ہوئے ہرڈل نے دو چیزوں کا خیال نہیں رکھا۔

۱۔ اس کائنات کے آغاز کو کروڑوں سال ہو چکے ہیں، یہ سائنس کا دعویٰ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لاکھوں سال نئی تحقیقات کے بعد اربوں سال میں تبدیل ہو جائیں۔ آدمِ اول کی زبان کروڑوں سال کا سفر کرتے ہوئے ایک ہی سانچے میں کیسے ڈھل سکتی تھی؟ اگر مذہبی صحائف اور الہامی کتابیں زبانوں کے اصول اور الفاظ متعین کریں تو یقیناً اس میں ترتیب موجود رہتی۔

۲۔ اللہ نے آدم کو اسماء سکھائے لہٰذا اصولاً سب سے پہلے نام سکھائے گئے تاکہ انسان زبان سیکھ سکے اس کے بعد ہی فعل سکھائے گئے اور مکمل زبان عطا کر کے انسان کو زمین پر بھیجا گیا۔

قرآن کریم، عہد نامہ جدید اور عہد نامہ قدیم اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ زبان الہامی عطیہ تھا لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ محققین نے زبانوں کے مذہبی نظریے پر غور و فکر کی زحمت گوارا نہیں کی اور اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ زبانوں کے آغاز و ارتقاء پر تحقیقات کا آغاز اس دور میں ہوا جب یورپ کے اندر مذہب سے بغاوت کی تحریک نشاۃ ثانیہ (Inlightment Movement) یا روشن خیالی کے نام سے برپا ہوئی تھی اور جس نے تمام سابقہ زبانوں کو قرن مظلمہ (Darkages) قرار دیا تھا۔ جس کا مختصر مطلب یہی تھا کہ انسانی تاریخ کا وہ پورا عہد جو آغاز کائنات سے لے کر سترہویں صدی کے آغاز سے پہلے کا احاطہ کرتا ہے اور جس کا بنیادی تعلق کسی نہ کسی طور پر مذہب سے رہا ہے، یہ تمام ادوار ظلمت اور تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ملفوف تھیں یعنی سترہویں صدی سے پہلے کا زمانہ جو سائنس کے مطابق بیالیس کروڑ اٹھاسی لاکھ سال کا زمانہ ہے جس کے بارے میں سائنس کچھ نہیں جانتی اس پورے زمانے کو سترہویں صدی کے مغربی مفکرین نے صرف اس لیے رد کر دیا کہ یہ پورا زمانہ مذہبی عہد تھا۔ لہٰذا زبانوں پر تحقیق کرنے والے محققین دانستہ طور پر مذہبی کتابوں سے فاصلے پر رہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فہرست ابن ندیم جو چوتھی صدی ہجری کی عربی کتاب ہے اور بعض محققین کے مطابق غالباً دنیا کی پہلی محفوظ اور مرتب فہرست کتاب ہے، اس کتاب کا پہلا باب چوتھی صدی میں پائی جانے والی زبانوں سے متعلق تھا۔ مغربی مفکرین اور محققین نے عموماً لسانیات پر تحقیقات سترہویں صدی میں شروع کیں۔ یہ کتاب اس سے چھ سو سال قبل دنیا کے مختلف خطوں میں بولی اور لکھی جانے والی زبانوں کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم کرتی ہے اور ان زبانوں کے رسم الخط کی بھی نشاندہی کرتی ہے لیکن اس کتاب کا حوالہ کسی محقق کے ہاں نہیں ملتا حتیٰ کہ ۱۹ویں صدی کا اہم ترین محقق سر ولیم ولسن ہنٹر اپنی کتاب A Comparative Dictionary of Non Aryan Languages of India and High Asia میں شامل تقابل لسانیات کے مقالے میں القزوینی، الادریسی ابن خرداذبہ، رشید الدین کے حوالے دیتے ہیں لیکن فہرست ابن ندیم سے صرف نظر کرتے ہیں حیرت انگیز طور پر شبلیؒ، سلیمان ندویؒ اور مولانا ابوالجلال ندویؒ کے مضامین میں بھی اس کا حوالہ نہیں ملتا اور نہ ہی

اس پر نقد و نظر ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عصر حاضر میں لسانیات پر ہونے والے تازہ ترین کاموں میں بھی ابن ندیم کا کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ ابن ندیم کے انگریزی ترجمے بھی عام ہیں۔ یہ صورتحال اس اغماض یا عصبیت کا شاخسانہ تھا جس کی بنیاد سترہویں صدی میں علم، عقل، آزادی اظہار رائے، وسیع النظری وخیالی اور بے تعصب معاشروں کی تشکیل کے نام پر شروع کی گئی۔

زبانوں میں اشتراک اور مماثلت کے ساتھ ساتھ رسم الخط میں بھی اشتراک کی بہت سی صورتیں سامنے آئی ہیں اس حقیقت کے باوجود کہ یکساں رسم الخط مختلف زبانوں میں موجود ہے مثلاً چین اور جاپان کی زبانوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں اس کے باوجود ان دونوں کا رسم الخط ایک ہے۔ ایک اور تحقیق جس کے مطابق اردو اور انگریزی رسم الخط ایک ہی ماخذ سے تعلق رکھتا ہے اور وہ سامی النسل ہے کیوں کہ اردو عربی رسم الخط سے ماخوذ ہے یونانی کے ابتدائی حروف تہجی، الفا، بیٹا، گاما، ڈیلٹا عبرانی ابجد کے الف، بیت، جمل اور دالتھ کی ترمیم شدہ شکلیں ہیں حیرت تو یہ ہے کہ بعض انگریزی حروف کی ترکیب آج بھی عربی ابجد سے مماثلت کا اعلان کر رہی ہے۔

K L M N — کلمن
ک ل م ن
Q R S T — قرشت
ق ر ش ت

یہ نقطہ نظر نیا نہیں ہے۔ مولانا ابو الجلال ندوی بھی اسی نقطہ نظر کے حامل ہیں مگر ان کی دلیل یہ ہے کہ تمام زبانوں کا منبع اور ماخذ وادی سندھ کی تہذیب ہے اور وادی سندھ کی زبان عربی کی ابتدائی شکل ہے۔ یونانی زبان کے بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ لاطینی زبان سے نکلی کیوں کہ آریا پہلے یونان میں آباد ہوئے اور وہاں سے ان کا ایک گروہ اٹلی میں بس گیا انگریزی کا جرمن خاندان سے قریب اور فرانسیسی سے نسبتاً دور ہونا ظاہر کرتا ہے کہ انگریز قوم لاطینی گروہ سے پہلے جدا ہوئی اور جرمن اس کے بعد۔ یورپ کے خانہ بدوش قبائل کی زبان اس بات کا اشارہ ہے کہ یہ لوگ اس زمانے میں ہندوستان سے یورپ گئے۔ کشمیری زبان کی آریائی ہند سے علیحدگی یہ بتاتی ہے کہ یہاں دوسرا گروہ آباد ہوا جو بقیہ ہند و پاک کے باشندوں سے الگ تھلگ اس برعظیم میں وارد ہوا تھا۔ اس سلسلے میں شبلی نعمانی کا ایک مختصر مضمون انتہائی اہمیت کا حامل ہے جس میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ عربی عبرانی سے برآمد نہیں ہوئی بلکہ عبرانی زبان عربی زبان سے نکلی ہے۔ اسی موقف کو سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس دلچسپ بحث سے زبانوں کے آغاز و ارتقا اور خصوصاً سامی زبانوں کی اصل کے بارے میں بعض نئے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

ہندی کے ماہر لسانیات ڈاکٹر بھولا ناتھ کھواری نے ہندوستان کی تمام زبانوں کے لیے دیوناگری رسم الخط کی زبردست وکالت کی لیکن اس وکالت کے باوجود انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ میں نے ایک فرانسیسی ایک کمبوڈی اور ایک امریکی کو لے کر ہندوستان کے مختلف رسم الخط سکھانے کے لیے الگ الگ تجربے کیے ان کے نتائج درج ذیل ہیں:

۱۔ تامل تیلگو، کنٹر، ملیالم اور اڑیا کی نسبت دیوناگری رسم الخط زیادہ آسان ہے اور کم وقت میں سیکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ دیوناگری بنگلا اور گورکھی میں لگ بھگ مماثلت ہے اور محنت کرنا پڑتی ہے۔

۳۔ گجراتی اور اردو رسم الخط سب سے سہل ہے

ڈاکٹر بھولا ناتھ کھواری کی یہ تحقیق ثابت کرتی ہے کہ سامی النسل زبان کا رسم الخط سب سے سہل ہے اور یہی زبان غالباً فطری زبان رہی ہوگی۔ اور دنیا کی تمام اہم زبانوں کے رسم الخط اسی سے مستعار ہیں مثلاً یونانی، انگریزی، فارسی وغیرہ وغیرہ۔

عربوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کا یہ رسم الخط ان کی اپنی ایجاد ہے۔ وہ اسے دوسروں سے مستعار بتاتے تھے بعض جدید تحقیقات کی رو سے اسے ارامی رسم الخط سے ماخوذ قرار دیا گیا ہے۔ ارامی رسم الخط کا ماخذ فنیقی (Phoenician) رسم الخط قرار دیا گیا اور فنیقی رسم الخط کو مصری رسم الخط سے اخذ کرنے کا دعویٰ بھی کیا گیا۔ محققین کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ یورپی ممالک میں جتنے رسم الخط مروج ہیں یا آج سے قبل مروج رہے ہیں ان سب کا ماخذ فنیقی رسم الخط ہی تھا۔ انسائیکلوپیڈیا امریکہ کے مطابق

> It is generally agreed that writing was introduced to the western nations by the Phoenicians and it is commonly believed that the Phoenician system was based on the Egyptian.

یہ نقطۂ نظر ان محققین کے اتفاق کی تردید کرتا ہے جس کے مطابق سامی رسم الخط مصری رسم الخط سے ماخوذ ہے اور مصری رسم الخط کا ماخذ فنیقی رسم الخط ہے اس تمام بحث کے نتیجے میں محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دنیا کے رسوم الخط کا مبدا خط امثالی ہے اس کی تحریر (Pictography) یا امثال نویسی کہلاتی ہے۔ یہ دعویٰ اسی قسم کا دعویٰ ہے کہ انسان نے صدیوں کی ریاضت اور لگاتار تجربات کے بعد ایک زبان ایجاد کی پھر اس زبان کے اظہار کے لیے صدیوں کی تلاش و جستجو کے بعد وسائل اور اوزار تخلیق کیے اور پھر صدیوں کی کوشش کے بعد تصویری زبان کے ذریعے ابلاغ کا قرینہ سیکھا اور پھر صدیوں کی کوششوں کے بعد تصویری

زبان رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ تحریر کی صورت میں ڈھلتی چلی گئی۔ اس قسم کے دعوے اسی وقت تسلیم کیے جاسکتے ہیں جب اس مفروضے کو یقین کے ساتھ تسلیم کیا جائے کہ خالق کائنات نے انسان کو بے زبان پیدا کیا لیکن بے زبان جانوروں کو پہلے دن سے زبان کی نعمت سے آراستہ کیا۔ انسان جانوروں کا اور مختلف بے ساختہ آواز وں کا محتاج رہا اور محتاجی کی ایک طویل رات جو صدیوں پر محیط تھی آخر کار روشن دنوں میں تبدیل ہوئی۔ یہ تصور تاریکی اس قدر مضحکہ خیز ہے کہ اس پر یقین کرنا نشاۃ ثانیہ کے نتیجے میں ابھرنے والے یقین کے لیے تو شاید بہت آسان ہو لیکن عقل سلیم رکھنے والوں کے لیے اس مفروضے پر یقین کرنا امر محال ہے۔ اس سلسلے میں دلچسپ تجربات تین بادشاہوں نے کیے کہ انسان کی فطری زبان کیا ہے؟ اس کے لیے انھوں نے نوزائیدہ بچوں کو تنہائی میں رکھ کر ان کی زبان سننے کی کوشش کی۔

ان بادشاہوں کو انسان کی سب سے پہلی یا فطری زبان جاننے کی خواہش تھی، اس خواہش کی تکمیل کے لیے انھوں نے نوزائدہ بچوں کی جنگل میں اس طرح پرورش کرائی کہ ان کے کانوں میں کسی زبان کا کوئی لفظ نہ پڑ سکے اس قسم کے چار تجربات کیے گئے۔ قدیم مصری بادشاہ سیمائی دیکا ہوس (Psammidicahos) نے دو بچوں کو جنگل میں پرورش کرایا کچھ سال بعد یہ بچے دربار میں گئے تو ان میں سے ایک نے لفظ بیکوس کہا جو فرنجین زبان میں روٹی کو کہتے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ فرنجین اصلی زبان ہے حالانکہ ہوا یہ تھا کہ یہ لفظ کسی دن روٹی دینے والے فرنجین خادم کے منہ سے نکل گیا تھا۔

تیرہویں صدی کی ابتدا میں شاہ فریڈرک دوم نے بھی ایسا ہی تجربہ کیا۔ لیکن یہ بچے گویائی سیکھنے سے قبل ہی مر گئے۔ پندرہ سو عیسوی کے لگ بھگ اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ جیمس چہارم نے بھی دو بچوں کو نظر بند رکھا آخر میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ بہت اچھی عبرانی بولتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے بھی جنگل میں کچھ بچوں کی پرورش کا اہتمام کیا مگر یہ گونگے ثابت ہو گئے۔ (صفحہ۳۳، لسانی مطالعے، ڈاکٹر گیان چند، انڈیا ۱۹۷۳) یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جنگل میں پرندوں کی آوازیں سننے کے باوجود اور مختلف جانوروں کی بولیاں سننے کے باوجود بھی ان بچوں نے ان آوازوں کے اشتراک یا اختلاط اور آمیزے سے کچھ لفظ تخلیق کرنے کی کوشش نہیں کی اور وہ گونگے ہی رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ نے انسان کو بے زبان پیدا کیا ہوتا تو انسان آج تک گونگا رہتا۔

دنیا کی معلومہ تاریخ کے مطالعے اور دستیاب آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران نکلنے والے کتبے اس بات کی تصدیق رہے ہیں کہ دنیا کا کوئی خطہ کوئی قوم اور کوئی تہذیب مذہبی نظریات سے، مذہبی اقدار سے خالی نہیں رہی اور دنیا کی تاریخ میں تاریخی تسلسل کے ساتھ جس چیز کا سراغ ہر جگہ ملا ہے، وہ وجود باری اور آخرت کے تصورات ہیں اور ان تمام تصورات میں زندگی کی فانی حیثیت ہر جگہ اس قدر نمایاں ہے جس

طرح آفتاب کی تمازت۔ اس کے باوجود مغربی اور مشرقی محققین اپنی تحقیقات میں مذہبی کتابوں، کتبات، مخطوطات، مذہبی افکار ونظریات اور عبادت گاہوں کو وہ مقام نہیں دیتے جو اس کا حقیقی تقاضا ہے۔

یہ بات بھی دنیا نے تسلیم کی ہے کہ تمام مذہبی کتابیں اور ان مذہبی کتابوں سے متعلق ادبیات اعلیٰ ادبی شہ پارے ہیں اور اخلاقیات کے موضوعات پر ان کا ورثہ مشترکہ ہے۔ عہد نامہ جدید، عہد نامہ قدیم، تالمود، وید، اُپنشد، بھگوت گیتا، گرنتھ صاحب، رامائن، مہابھارت، ژند، آژند، اوستا، بدھ مت کی مقدس کتاب تری پٹکا جو پالی زبان میں ہے، کنفوشس مذہب کی کتابیں Wu Ching (وو چنگ) اور Shih Shu (شی شو) اور تاؤ مت (Taoism) کی کتاب تاؤتے کیانگ (Tao-te-Kiang) مذہبی کے ساتھ ساتھ ادبی شہ پارے بھی ہیں۔ اس بات پر تمام محققین کا اجماع ہے کہ دنیا کے اعلیٰ ترین ادبی شہ پارے یا تو مذہبی کتابیں ہیں یا ان کتابوں کے زیر اثر تخلیق کیے گئے ہیں۔ مثلاً رامائن، تالمود، اوستا، گیتا، الیڈ، اوڈیسے، اینائڈ، کامیڈی، فردوس گم گشتہ، فردوس بازیافتہ وغیرہ وغیرہ۔ مذہب اور ادب کی بحث مغرب میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے عروج کے بعد مذہب کو زندگی سے خارج کرنے کے بعد ادبیات سے خارج کرنے کے لیے ایک زبردست تحریک کے طور پر برپا کی گئی۔ آج بھی مغربی و مشرقی معاشروں میں اس بحث کی چنگاریاں پوشیدہ ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عالمی ادبی شہ پارے مذہبی افکار ونظریات سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکے۔ لہٰذا ادبیات کے دائرے میں عقائد، مابعد الطبعیات اور نظریات کی آمیزش کی بحث ایک بے بنیاد گفتگو ہے۔ کسی دور میں بھی تاریخ آثار قدیمہ، تہذیب کے دائرے مذہب کے سائے سے نہیں بچ سکے تو ادب کے حریم ناز میں مذہب کی گنجائش پیدا کرنے یا نہ کرنے کی بحث ایک لغو بحث کے سوا کچھ نہیں۔ لاکھوں سال کی تاریخ، کائنات کے خالق سے انسان کی محبت، تعلق، راز ونیاز کی تاریخ ہے اور مذہبی افکار انسان کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑتے ہیں خواہ اس کا اعتراف کیا جائے یا اس سے انکار کیا جائے۔ ہومر کی الیڈ اور اوڈیسے، یونانی دیوی اور دیوتاؤں کی فکر سے پیدا ہوئی۔ ورجل (Vergil) کی اینائڈ روم کی تاسیس و عظمت کو منشائے ربانی کا سبب قرار دیتی ہے۔ ملٹن کی فردوس گم گشتہ اور فردوس بازیافتہ، خالص عیسائیت کے احیاء کے لیے لکھی گئی عظیم مذہبی نظمیں ہیں۔ یہ تخلیقات ادبی، عالمی ادبی، فنی، جمالیاتی عروج کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد کا بھی نقطۂ عروج ہیں۔ فردوس گم گشتہ سقوط آدم کی داستان اور عالمی ادبی شہ پارہ ہے اس کا مواد تالمودی روایات اور عیسائی چرچ کی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ دانتے کی کامیڈی اطالوی زبان کا پہلا ادبی شاہکار تھا جس سے اطالوی زبان عہد طفولیت سے عہد بلوغ تک پہنچ گئی۔ دانتے کے شہ پارے کو مابعد الطبیعیاتی شہ پارہ کہا گیا۔ کیوں کہ نظم کے مذہبی عناصر ڈرامائی عناصر پر غالب ہیں۔ اس کامیڈی کا آخری

باب انسان کی روحانی خلش کا نقطۂ عروج ہیں۔ یہ حصہ الہامی ادب کا شاہکار ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اس کے باوجود مذہبی تحریروں کو لسانیاتی ارتقاء کے معاملے میں نظر انداز کرنا مغربی محققین کا تعصب ہے۔

Andrew Lang نے ۱۸۹۸ء میں مذہب کی تشکیل (The making of religion) اور ولہل اسمتھ (Wilhal Smith) نے اپنی کتاب (Origin of the idea of God) میں طویل تجربات، مشاہدات، مطالعات، معلومات اور تحقیقات کے بعد شدت کے ساتھ یہ نظریہ پیش کیا کہ قدیم ترین مذہبی عقیدہ ایک برتر ہستی کا عقیدہ تھا۔ اینڈریو لینگ نے برسہا برس تک طویل سفر کر کے دنیا کے مختلف خطوں اور قوموں سے شہادتیں جمع کر کے بتایا ہے کہ ایک خدا کا عقیدہ انتہائی ابتدائی انسانوں میں پایا جاتا رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں (ابتدائی) قبائل میں دوسرے دیوتاؤں کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ ان تحقیقات کے نتیجے میں مذہب کو نفسیاتی فریب (Psychological illusion) یا سماجی فریب (Socialogical illusion) ثابت کرنے کی مغربی کوششیں خود ہی دم توڑ چکی ہیں۔ فراعنۂ مصر جو سورج دیوتا کی پرستش کرتے تھے جن کے یہاں آخرت کا تصور موجود تھا وہ اس سفر کو آسان بنانے کے لیے مردہ لوگوں کے ساتھ مختلف اشیاء خورد و نوش دفن کرتے تھے اور زندگی بعد الموت کے سلسلے میں ان دیکھے رب کے رحم و کرم کے متمنی رہتے تھے۔ یونانیوں کے یہاں بھی دیوی اور دیوتاؤں کی شکل میں مابعد الطبیعیات اور مذہبی تصورات موجود رہے ہیں۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار تاریخ کی کسی تہذیب کے فلسفے سے نہیں ہو سکا اور خالق ارض و سماء کے وجود پر یقین تاریخی تواتر کے ساتھ ملتا ہے لیکن مغربی تہذیب دنیا کی تاریخ میں واحد تہذیب ہے جس کا فلسفہ جس کی مابعد الطبیعیات، جس کی علمیات خدا، آخرت اور مذہب سے انکار پر رکھی گئی ہے۔ مغربی تہذیب انسان کو مخلوق کے بجائے خالق کے درجے پر فائز کرتی ہے اسے عبد کے بجائے معبود کا درجہ دیتی ہے۔ آزادی اور آزادئ اظہار رائے کے ذریعے وہ انسان کو تمام اخلاقی اقدار سے آزاد ہونے کا پروانہ عطا کرتی ہے اور اسے یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ جو قدر (Value) تخلیق کرنا چاہے تخلیق کرے۔ اس تہذیب کے خیال میں خیر و شر کی بحث، حق و باطل کی گفتگو سب بے معنی باتیں ہیں اصل خیر، حق انسان کی خواہش ہے یہی الٰہ ہے یہی خیر ہے یعنی اصل خیر آزادی ہے جس کے ذریعے انسان اپنی شخصیت کی شناخت کائنات کی تسخیر کے ذریعے کرتا ہے۔ جس کے لیے سرمایے کی بڑھوتری ضروری ہے لہٰذا انسان سرمائے کا غلام ہے اور سرمائے کے سوا ہر چیز بے معنی ہے اصل حق اور خیر انسانی خواہش ہے خواہ وہ کیسی ہو اس خواہش کی تکمیل کے لیے آزادی اور سرمایہ ضروری ہے۔ لہٰذا خیر حق آزادی ان سب کی اصل مادی شکل سرمایہ (Capital) ہے انسان کا مقصد تخلیق سرمایہ کی طلب اور اس میں اضافہ ہے اس لیے مغرب میں گھریلو خواتین کو بے کار اور گھر سے باہر کام کرنے

والیوں کو Working Women کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ سرمایہ (Capital) کما رہی ہیں۔ مغربی تہذیب کا دعویٰ ہے کہ خدا مر چکا ہے اور انسان خود خدا بن چکا ہے۔ اس لیے مشہور امریکی فلسفی رچرڈ رارٹی اپنی شہرۂ آفاق کتاب "Contingency Irony and Self" میں کہتا ہے کہ ہمیں اپنے اقدامات کے لیے کسی دلیل کی کوئی ضرورت نہیں اگر ہم نے کچھ غلطیاں کی بھی ہیں تو ہم نے اپنے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ تاریخی طور پر غلطیوں کی معافی کا اختیار ہمیشہ رب العالمین کے پاس رہا ہے مغربی تہذیب دنیا کی واحد تہذیب ہے جو خود اپنے آپ کو رب العالمین کے درجے پر فائز کر کے اس بات کا دعویٰ کرتی ہے کہ وہ کسی کو جوابدہ نہیں لہٰذا اس کا ہر قول و فعل امر حق ہے اور اس امر حق جو مطلق حق ہے اس کے خلاف تنقید اور آزادیٔ اظہار رائے کی اجازت مغربی فلسفیوں کے یہاں نہیں ملتی۔

اسی بنیاد پر براعظم امریکہ ۶۰ لاکھ سرخ ہندیوں کا قتل عام کیا گیا اور مشہور فلسفی ہابز اور کارل مارکس نے اس قتل عام کی مخالفت نہیں کی کیوں کہ یہ ریڈ انڈین انسان نہیں تھے۔ وحشی تھے اور وحشیوں کو زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اس تمام گفتگو کا مقصد یہ بات واضح کرنا ہے کہ ماہرین لسانیات، مذہبی تحریروں، مذہبی آثار اور مذہبی اساطیر کو اپنی تحقیقات میں کوئی مقام دینے کے روادار کیوں نہیں ہیں۔ لہٰذا تاریخی طور پر دستیاب مذہبی آثار اور اساطیر کی بنیاد پر زبانوں کے آغاز و ارتقاء کو از سر نو سمجھنا اور سمجھانا نہایت ضروری ہے۔ اس طویل بحث کے بعد جو نتائج برآمد ہوئے مختصراً درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت آدمؑ کو زمین پر زبان و بیان کی صلاحیتوں کے ساتھ بھیجا گیا۔

۲۔ آدمؑ اول کی زبان ایک تھی جو نسل میں اضافے کے بعد فطری طور پر تبدیل ہوئی۔

۳۔ اگر انسان پیدائشی طور پر بولنے کی صلاحیت نہ رکھتا تو کبھی بول نہ سکتا اور آج تک گونگا ہوتا۔

۴۔ تمام زبانوں کے حروف تہجی مشترک ہیں لیکن زبانیں الگ ہیں۔

۵۔ تمام زبانوں میں جنت کے لیے یکساں الفاظ ہیں۔

۶۔ تمام زبانوں میں ماں اور باپ کے لیے ملتے جلتے الفاظ ہیں۔

۷۔ تمام زبانوں میں پانی، آخرت اور قیامت کے الفاظ میں مماثلت ہے۔

۸۔ بچوں کو تنہائی میں پرورش کر کے دیکھا گیا تو وہ کوئی زبان نہ بول سکے کیوں کہ انھوں نے کسی زبان کے الفاظ نہیں سنے۔

۹۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دنیا کی پہلی زبان ایک تھی۔ یہ آدم اول کی زبان تھی جس کی مشترک چیزیں ۸۲ کروڑ ۸۵ لاکھ سال کے بعد بھی باقی ہیں۔[۱۴]

اس تفصیل سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ زبانوں کے آغاز و ارتقاء لغت کی ابتدا و انتہا کے بارے میں

ماہر لسانیات و تاریخ کے کیا قطعۂ ہائے نظر رہے ہیں اور سنسکرت جیسی زبان کا حشر علماء لسانیات کے ہاتھوں کیا سے کیا ہو گیا تو دوسری زبانیں کیا حیثیت رکھتی ہیں اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت حال میں بروشسکی جیسی غریب، اجنبی، نامانوس زبان پر کچھ لکھنا، کچھ کہنا بہت مشکل کام ہے لیکن بروشسکی اکادمی کے ذمہ داروں کا حکم ہے کہ اس موضوع پر کچھ ضرور لکھا جائے۔ اس زبان پر کچھ لکھنے سے قبل وادئ ہنزہ، اس کی تاریخ، روایات، تہذیب و تمدن، مذہب، ثقافت اور ادب کا اجمالی تذکرہ ضروری ہے۔

ہنزہ: محل وقوع:

ریاست ہنزہ کوہستان قراقرم کے اونچے پہاڑوں کے درمیان ایک وادی ہے۔ یہ وادی شرقاً غرباً ایک سو میل سے کچھ زیادہ لمبی اور شمالاً جنوباً نصف سے لے کر دو میل تک چوڑی ہے۔ اس کے مشرق میں چینی ترکستان [اُئی غر یا سنکیانگ] کی حدود یارقند، سریقول اور کاشغر ہیں۔ جنوب میں ریاستہائے نگر، استور اور کشمیر واقع ہیں۔ جنوب مشرق میں بلتستان اور لداخ کے علاقے ہیں۔ شمال میں پامیر بیضائی گنبد، تاشقند اور افغانستان کے پامیر منارہ اور روخان ہیں اور مغرب میں اشلوکن اور روخان افغانستان کے علاقے واقع ہیں۔

ریاست ہنزہ کے باشندے تاتاری مغول، تاتاری ہن، بلتستانی بلتی، وخانی وخی اور رقندوزی، بدخشانی، کرغز، داریل، تانگیر کی شین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بروشسکی زبان بولنے کی وجہ سے سب بروشو (Burusho) کہلاتے ہیں۔[۱۵]

بروشو کون ہیں؟

بروشو دراصل "ہون" قبیلے کی ایک شاخ ہے جو چین میں دریائے ہوانگ ہو کے شمالی اور مغربی علاقوں میں بستے تھے۔ یہ آباد کار سفر کرتے ہوئے ہنگری میں آباد ہوئے اور ان ہی بے شمار حملہ آوروں میں سے کچھ لوگ موجودہ قراقرم، ہندوکش، اور ہمالیائی علاقوں میں بھی آباد ہو گئے۔ "ہونزہ" اصل میں "ہون زاد" تھا۔ نیز آبادی کا نام "ہنوکشل" اور اشخاص کے ناموں میں "ہنو" جیسا ایک نام اس حقیقت کی مزید تصدیق کرتا ہے۔ ہنگری کے پروفیسر آئمر اولا اور نصیر ہونزائی صاحب کے درمیان ہونے والی خط و کتابت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دونوں قوموں کے لوگوں کے ناموں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔[۱۶]

بروشسکی کہاں بولی جاتی ہے؟

اس وقت یہ زبان پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی وادئ ہونزہ، نگر اور یاسین میں بولی جاتی ہے، جب کہ گلگت کے گرد و نواح میں بھی بروشسکی بولنے والے افراد موجود ہیں۔ پاکستان کے جنوبی شہر کراچی میں بھی بروشسکی زبان بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ مجموعی طور پر پاکستان میں بروشسکی بولنے والوں کی تعداد تیس ہزار ہے لیکن بروشسکی اکادمی کے دعوے کے مطابق یہ تعداد تقریباً دو لاکھ ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں حتمی

رائے دینا ممکن نہیں، وادی ہونزہ، نگر اور یاسین کی بروشسکی بنیادی طور پر ایک ہی زبان ہے، تاہم تینوں علاقوں میں لہجے اور کچھ الفاظ کا فرق ہے، جس کی بنیادی وجہ جغرافیائی فاصلہ و مختلف لسانی ماحول ہو سکتا ہے۔ [۱۷]

ہنزہ: طبقاتی تقسیم:

[۱] وادی ہنزہ کا حکمران طبقہ وہ تھا جو سابق میر کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا یہ خاندان تقریباً پانچ سو سال سے ہنزہ پر حکمران چلا آتا تھا۔ اب یہ امارت ختم کر دی گئی لیکن ماضی میں امیر کے ساتھ مختلف طبقات قائم تھے جن سے اس ریاست کی سیاست کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ [۲] دوسرا طبقہ وزراء کا ہے۔ [۳] تیسرا طبقہ اکابرین ملک کہلاتا ہے۔ یہ اکابرین ریاست کی ترقی اور فلاح و بہبود کے کاموں میں مشورے دیتے ہیں۔ بروشسکی میں اس طبقے کو کرپاتنگ (Kurpating) کہتے ہیں۔ [۴] چوتھا طبقہ بار (Bar) کہلاتا تھا۔ انھیں مدت سے عسکری فرائض سونپے گئے تھے۔ راستے محفوظ ہو جانے کے بعد اس طبقے کی ضرورت نہیں رہی۔ [۵] پانچواں طبقہ شدر شو (Sadarsho) کہلاتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ سپاہ گری کی خدمت کے علاوہ حکمران طبقے کے لوگوں کی کاریگاری، جسے یہ لوگ رجاکی (Rajaki) کہتے ہیں، بھی کرتے تھے، جو اب قریباً ختم ہو گئی ہے۔ [۶] چھٹا طبقہ باربرداروں پر مشتمل تھا۔ ان کا کام بوجھ اٹھانا، طلا کشی کرنا اور بڑے زمینداروں کی خدمت بجالانا تھا۔ میر محمد جمال خان صاحب کے عہد میں یہ طبقہ بالکل مفقود ہو گیا۔ [۷] ساتویں طبقہ میں ایسے مجرم مرد اور عورتیں آتی تھیں جن کو ناقابلِ معافی جرم کی پاداش میں قید کی سزا دی جاتی۔ ان کو غلام تصور کیا جاتا تھا اور یہ لوگ تھانگم (Thangum) کہلاتے۔ ان سے شاہی قلعہ میں آب کشی، جاروب کشی، ہیزم کشی اور گاؤبانی کی خدمات لی جاتیں۔ انگریزی تسلط کی ابتدا سے اس رواج کا انسداد ہونے لگا اور آخر میں غزان خان کے زمانے میں یہ رواج مکمل طور پر نابود ہو گیا۔ [۸] آٹھویں طبقے میں ہنرمند لوگ آتے ہیں۔ ان کو بروشسکی میں بریچو (Bricho) کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک نسل سے تعلق نہیں رکھتے ان میں کوئی بلتی ہے، تو کوئی وخانی اور کوئی شین نسل سے ہے۔ البتہ یہ لوگ ایک ہی گاؤں میں رہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں طبقاتی طور پر سب سے نچلے درجے میں آتے تھے اس لیے کہ یہ لوگ مروجہ اصولوں کے مطابق حلال و حرام کے تصور کا احترام نہیں کرتے تھے اور بیویوں کو بلا مہر و طلاق رکھ لیتے اور چھوڑ دیتے تھے۔ اب یہ لوگ اپنے روحانی پیشوا حاضر امام کی پیروی کی بدولت مومن کہلاتے ہیں او ران کے گاؤں کو بریشل (Berishal) یعنی مومن آباد کہا جاتا ہے۔ [۱۸]

لباس کا انداز:

میر محمد نظیم خان [۱۸۹۲ء۔ ۱۹۳۸ء] کے عہد کی بے ڈول ٹوپیاں بوڑھی عورتیں پہنا کرتی ہیں۔ ان کے دور میں مذہبی اثرات کے زیرِ اثر جسم کی مکمل ستر پوشی کے لیے گلے اور آستینوں والا کرتا پہنا جانے لگا جسے خراسانی یا درویشانہ کرتا کہا جاتا تھا۔ [۱۹]

عہدے اور مناصب:

ریاست ہنزہ کے قدیم مناصب کا جاننا بھی ضروری ہے جس سے ہنزہ کی تہذیب و ثقافت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ریاست ہنزہ میں عہد قدیم سے مندرجہ بالا عہدے پائے جاتے تھے۔

۱۔ فراش معروف بہ فراج، ۲۔ یرق، ۳۔ دیوان بیگی، ۴۔ وکیل، ۵۔ ایلچی، ۶۔ ٹیلپانچی، ۷۔ بیپا، ۸۔ یحرم، ۹۔ بساول، ۱۰۔ غول چیس یا گل چیس، ۱۱۔ اسیری، ۱۲۔ میر شکار، ۱۳۔ شبانی۔

تہوار:

ریاستی لوگوں کے تہوار بھی اہمیت کے حامل ہیں جس سے تاریخ کا سفر آسان ہو جاتا ہے، اہم تہوار آٹھ ہیں۔ تھموشلنگ، گروکس، بوفو، نوروز، شکامشک، گنانی، بیاقمر اور دھوم نکھالی۔[۴۰]

مذہبی پس منظر:

ہنزا کے لوگ بتوں کو حاجت روا اور نجات دہندہ سمجھتے تھے، ان کے نام پر نذرانے پیش کرتے تھے اور اپنے مُردوں کو جلاتے تھے۔ مُردوں کو جلانے کے مقامات کے نام جنھیں بروشسکی میں جائی میچنگ (Jeymicing) کہتے ہیں اب بھی موجود ہے۔

ہنزہ میں جن بتوں کی پوجا ہوتی تھی ان کے نام یہ ہیں: سہلا بوئن (Sahala Boyn)، ہلا بوئن (Hala Boyn) اور تھول بوئن (Thol Boyn)۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ایسے جانوروں کی پرستش بھی کرتے تھے جن کو بویو (Boyo) کہا جاتا۔ بویو ایک غیر پالتو جانور تھا جو کتے کے پلے سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔

لوک ادب: کسی دیے کے پاس بیٹھنا:

ہنزہ میں بھی رات کو کھانے کے بعد دیے کی روشنی میں کہانی کہنے اور سننے کا رواج عام تھا۔ ان لوگوں میں کہانی سننے کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ”کسی دیے کے پاس بیٹھنا“ محاورے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اکثر لوگ دن ڈھلتے اور چراغ جلتے ہی ان کچے پکے خیموں، دیاروں اور حویلیوں میں چراغ کی لو کے اردگرد پروانوں کی طرح جمع ہو جاتے ہیں اور انسانی، اخلاقی اور نیکی کی باتیں سنتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بروشسکی زبان کی متعدد کہانیاں فرضی کرداروں پر مبنی نہیں بلکہ ان کے کردار یہاں کی روایتی تاریخ کے کردار ہیں جن کا تعلق یہاں کے عوام اور ان کے حکمرانوں سے ہے۔

بروشسکی علاقے کا لوک ادب وہاں کے باشندوں کی اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی اقدار کا آئینہ دار ہے۔ یہ ادب لوک کہانیوں میں محفوظ ہے۔ یہ کہانیاں ایک خاص ماحول میں بسنے والے لوگوں کے اعمال کا عکس پیش کرتے ہیں۔ ان کہانیوں کو ہم مندرجہ ذیل طور پر تقسیم کر سکتے ہیں [۱] وہ کہانیاں جو سیاسی واقعات یا حکمران طبقے سے متعلق ہیں۔ [۲] جو یہاں کے باشندوں کے اجتماعی اعمال پر مبنی ہیں۔ [۳] جو انفرادی کرداروں کی عکاسی

کرتی ہیں۔ [۴] جن میں مافوق الفطرت عناصر کا ذکر ہے۔ اور [۵] وہ کہانیاں جو دوسرے علاقوں سے متعلق ہیں اور یہاں رائج ہیں۔

پہلے حصے سے متعلق دو نمایاں کہانیاں: ۱۔ شری بدت کی کہانی ۲۔ ناپکنس اور روامتنگ کی کہانی ہے۔ [۲۱]

دونوں کہانیاں جن کرداروں کے گرد گھومتی ہیں وہ یہاں کی سیاسی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس لیے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا تو نہیں کہ یہاں کی سیاسی تاریخ انہی روایات پر مبنی ہو؟ جس طرح ان کہانیوں میں قتل کے واقعات کا اعادہ ہوتا ہے، اسی طرح ہنزہ کی تاریخ قتل و غارت کی ایک مسلسل داستان ہے۔ شاید ہی کوئی حکمران ایسا ہوگا جو اپنی طبعی موت مرا ہو ورنہ ایک کو دوسرے نے طاقت یا دھوکے سے قتل ہی کیا اور یہ سلسلہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں صفدر علی کے برسر اقتدار آنے پر ختم ہوا۔ [۲۲]

کہانیاں قتل و خون کے واقعات ہی کی حامل ہیں۔ پیار و محبت اور گہرے دوستانہ تعلقات کے باوجود ایک دوسرے کو قتل کر دینا معمولی بات سمجھا جاتا رہا ہے۔ [۲۳]

لوک کہانیاں: عشق و محبت سے خالی:

بہت سی ایسی کہانیاں بھی ملتی ہیں جن میں وفاداری، احسان مندی، دوسروں کے لیے خطرات مول لینا اور مکاری اور فریب کے افعال پر قدرت کی طرف سے سزا پانے کے سبق آموز واقعات کا بیان پایا جاتا ہے۔ البتہ عشق و محبت کی داستانیں مفقود ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شادی کے سلسلے میں ان کے ہاں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی تھی۔ [۲۴]

لوک گیت: ہجر و فراق کی داستان:

کہانیوں کے برعکس یہاں کے لوک گیتوں میں عشق و محبت کے جذبات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ ایک گیت کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس میں وصل سے محروم، فراق کی آگ میں جلنے والے دو دلوں کی داستانِ محبت بیان کی گئی ہے۔ دیکھیے بیان کی سادگی اور جذبات کے بے ساختہ اظہار نے کرداروں کے ماحول کی کتنی واضح تصویر پیش کی ہے۔

ویرلوک : میری قسمت میں ایک دور دراز کا سفر ہے
اے میرے زخم مندمل کرنے والے!
میں اپنے تعویذ بھلا آیا ہوں
خدا کرے میرے لیے وہ جنازے کی خیرات ہوں
جب علاقے میں شاہین آ جائے

تو تیتر کے لیے امن کی صورت کوئی نہیں رہتی
اگر میرے اور تیرے درمیان دوستی ہوئی
تو پھر ملک میں بدامنی نہیں ہوگی
تمہارا یہ حال کیوں ہے؟
اے میرے خوبصورت زلفوں والے محبوب!
ویرلوک : میں نے کہا۔ میں پریوں کی وادی کی راہ جاؤں گا۔
جب راہ کھو بیٹھا تو ہوا کے پراسرار طوفان نے مجھے گھیر لیا
میرے دوست۔ پراسرار طوفان کا کیا علاج ہو سکتا ہے!
امیکس لوک: شاید شوئی پری کے بال علاج ثابت ہو سکیں [۲۵]

اسماعیلی علماء: تبلیغی کوششیں:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کے غلبہ پا لینے کے باوجود اسلام کی تبلیغ کا کام بہت بعد میں شروع ہوا۔ کیوں کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے تک اس علاقے میں قرآن کریم نہیں پہنچا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شاہ بیگ کا بیٹا خسرو خان مذکورہ سن میں تخت نشین ہوا تو اس وقت قرآن کریم کا ایک نسخہ یہاں لایا گیا۔ چونکہ انیسویں صدی کے آخر تک کوئی تعلیمی بندوبست نہیں تھا اس لیے لوگ اسلامی عقائد اور نظام فکر سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب کے اثرات ختم ہو جانے کے باوجود یہاں کئی معمر لوگوں کے نام سکھی یا ہندوانہ ہیں۔

تبلیغ کے سلسلہ میں جو علماء یہاں تشریف لائے ان میں اکثریت اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج یہاں کی قریباً تمام آبادی اسماعیلی عقائد ہی کی پیرو ہے۔ [۲۶]

گرمنس اور غتنس [لکھنا پڑھنا]

بروشسکی زبان محض ایک بولی تصور کی جاتی ہے اور بظاہر اس میں لکھنے اور پڑھنے کا رواج نہیں تھا کیوں کہ قدیم کتبات مخطوطات اور کتابوں کا سراغ نہیں مل سکا لہذا اس زبان میں کوئی قدیم ادبی مواد موجود نہیں ہے۔ لیکن اس زبان کے دو قدیم مصادر گرمنس (girminas) یعنی لکھنا اور غتنس (gatanas) یعنی پڑھنا یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ کسی دور میں یقیناً بروشسکی زبان لکھی اور پڑھی جاتی تھی۔

بروشسکی: لسانیاتی نقطۂ نظر سے:

برعظیم کی زبانوں کے مبسوط جائزے میں گریرسن نے جو کچھ اپنی ابتدائی رائے دی تھی اس پر بہت زیادہ نئی معلومات تا حال اس کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ کرنے والوں کو نہ مل سکیں۔ لیکن پروفیسر شاہین نے شمالی علاقہ جات میں بعض ایسی زبانوں کو دریافت کیا ہے جن کا ذکر گریرسن کے یہاں نہیں ملتا ان میں کچھ

زبانیں ایسی ہیں جن کے بولنے والے اب صرف چند رہ گئے ہیں پروفیسر شاہین افغانستان کی وادی کنڑ کو زبانوں کی وادی قرار دیتے ہیں جہاں بے شمار زبانیں اپنے اصلی لب و لہجے کے ساتھ زندہ ہیں حتیٰ کہ سنسکرت زبان بھی۔[۲۷]

بروشسکی زبان کے تحقیقی اور سائنٹیفک اصولوں کے مطالعہ کی تاریخ میں لوری مر Lorimer کی کوششوں کو اولین سنگ میل سمجھنا چاہیے جن کے بارے میں جارج مورگن اسٹیرن George Morgenstierne نے ۱۹۳۲ء میں اپنی روداد برائے Mission of North West India 1932 0520-[مطبوعہ اوسلو ،۱۹۳۲ء] میں یہ اطلاع دی تھی کہ لوری مر نے بروشسکی کے مطالعے میں خاصی پیش رفت کی ہے۔[۲۶] مگر اس زبان کی اصل و بنیاد کا مطالعہ بے حد مشکل ثابت ہوا ہے۔ خود جارج نے اس کی صوتیات کا مطالعہ اس کی پڑوسی ہند ایرانی زبانوں سے تقابل کے ساتھ کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہرمن برگر Hermann Berger نے اپنے مطالعات کے ذیل میں، جو اس نے ہائیڈل برگ کے "ادارہ مطالعات شرقیہ" میں انجام دیے، بروشسکی سے ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۱ء کے عرصے میں دو کہانیوں کے ترجموں نے انقلابی نتائج کی جانب ماہرین کی پیش قدمی کو آسان بنا دیا۔ اب وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ زبان اس علاقے میں اپنی پڑوسی زبانوں میں سب سے مختلف زبان ہے اور اس کی مماثلت کسی اور زبان میں نظر نہیں آتی۔ یہاں تک کہ تبتی زبانوں میں، بلکہ نہایت قریبی زبان بلتی سے بھی کوئی مماثلت نہیں رکھتی۔ محض ایک ہلکی سی مماثلت قفقازی (Caucasian) زبانوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی فاضل مترجم اور ماہر لسانیات برگر نے بالآخر اپنے مطالعات کی بنیاد پر ۱۹۷۴ء میں اس کی قواعد شائع کروائی۔[۲۹]

بروشسکی زبان دنیا کی چند عجیب و غریب اور انتہائی قدیم زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ ماہرین لسانیات ابھی تک اس زبان کے اصلی وطن یا دنیا کی اہم زبانوں سے اس کے رشتوں کی تلاش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو زبانوں کی درجہ بندی کی فہرست میں غیر نوعی زبان (Unclassified) قرار دے کر علیحدہ رکھا گیا ہے۔[۳۰]

اس زبان پر اردو، ترکی، سنسکرت اور فارسی کے اثرات پائے گئے ہیں جب کہ عربی عبرانی مصادر بھی اس زبان میں پائے جاتے ہیں۔ اور عصر حاضر میں شینا زبان سے جغرافیائی قربت کے باعث اس کے الفاظ اور بے شمار اردو اور انگریزی الفاظ بھی اس زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔

بروشسکی قواعد کے اصول:

قواعد کے اصول اور لفظوں کی بناوٹ کے اعتبار سے بھی یہ ایک دقیق اور پیچیدہ زبان ہے جس میں تذکیر و تانیث کے چار اجزاء اور واحد سے جمع بنانے کے پچاس سے زائد اصول ہیں۔ یہ زبان، جواب تک صرف

ایک بولی کے طور پر پہچانی جاتی ہے، تحریر کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ اس وقت یہ زبان شرق میں عربی/اردو رسم الخط اور مغرب میں رومن رسم الخط میں لکھی جا رہی ہے۔ عربی/اردو رسم الخط میں پاکستان سے بروشسکی میں اب تک آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس رسم الخط میں پہلی کتاب ۱۹۷۰ء میں پاکستان سے شائع ہوئی۔ انگریزی، جرمن و دیگر زبانوں میں بروشسکی زبان سے متعلق تقریباً نو کتابیں غیر ملکی ماہرین تحریر کر چکے ہیں۔ اس طرح بروشسکی زبان میں اور بروشسکی زبان سے متعلق مطبوعہ کتابوں کی کل تعداد سترہ سے زیادہ نہیں۔ لیکن یہ تعداد نہایت حوصلہ بخش ہے۔ مختصر عرصے میں ایک بولی دو رسم الخط اختیار کر کے کتابوں کے سانچے میں ڈھل گئی ہے۔[۳۱]

نفیس، شائستہ اور نستعلیق زبان:

تاریخ کے کسی عہد میں یقیناً بروشسکی ایک نہایت غیر معمولی زرخیز اور اہم علمی و ادبی زبان رہی ہوگی۔ اس کی زرخیزی آج بھی ترو تازہ ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اس زبان کا کوئی مخطوطہ یا تحریری نمونہ تا حال دستیاب نہ ہو سکا لیکن اس زبان کی گہرائی و گیرائی کا اعتراف لازمی ہے۔ مثال کے طور پر دروازہ کھولنے کے تین مختلف طریقوں کو یہ زبان نہایت خوبصورتی، نفاست اور نستعلیق انداز سے اس طرح بیان کرتی ہے:

قریک	بہت ہی آہستہ سے دروازہ کھولنے کی آواز۔
قرا ک	زور سے دروازہ کھولنے کی آواز۔
قُرک	بہت زیادہ تیزی سے دروازہ کھولنے کی آواز۔

زبان میں ایسی نفاست کہ لفظوں سے عامل کی ذہنی حالت، اخلاقی کیفیت اور نفسی خلل کا اندازہ کیا جا سکے۔ یہ خاصیت انگریزی، اردو، عربی، فارسی، ہسپانوی اور فرانسیسی میں بھی موجود نہیں اور ان تین مختلف کیفیات کے لیے ہمیں ان زبانوں میں کوئی جامع لفظ نہیں ملتا۔[۳۲]

بروشسکی زبان کی یہی فصاحت و بلاغت اس امکان کا در وا کرتی ہے کہ یہ زبان کبھی اہم علمی و ادبی زبان بھی رہی ہوگی۔ اس کی تصدیق بروشسکی زبان کے دو قدیم مصادر گرمنس (Girminas) لکھنا اور ھتنس (G atanas) پڑھنا سے ہوتی ہے۔ یہ دونوں مصادر اس امکان کو یقین میں بدلنے کے لیے کافی ہیں کہ بروشسکی زبان کبھی لکھی اور پڑھی جاتی تھی اور تاریخ کے کسی دور میں یہ صفحۂ قرطاس پر تحریر بھی کی جاتی رہی مگر اس کا رسم الخط کیا تھا یہ کوئی نہیں جانتا۔ اس زبان کا ادب، شاعری، تاریخ اور ثقافتی ورثہ تحریری حالت میں دستیاب نہیں۔

بروشسکی: عربی، عبرانی روابط:

اس زبان میں عربی اور عبرانی مصادر کے باوجود اس زبان کا اسلوب، ساختیات، صوتی نظام، قواعد عربی یا عبرانی زبانوں سے اس قدر مختلف ہیں کہ اسے سامی زبانوں کے گروہ میں شامل نہیں کیا گیا۔

“ئیل کنس” عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ “ئیل” عبرانی میں خدا کو کہتے ہیں، جیسے جبرائیل کے معنی

ہیں مرد خدا یا بندۂ خدا۔ بروشسکی زبان میں اس سے مماثل لفظ ئیلیکنس [ایلیکنس] ہے جس کے معنی عبادت و پرستش کے ہیں۔ عربی زبان میں "حَیَّ وحَیَّ هلاً وَحَيْهَلَ" اسم فعل بمعنی جلدی کرو متوجہ ہو کے لیے آتا ہے، جس طرح اذان میں حی علی الفلاح [دوڑو فلاح کی طرف] کہا جاتا ہے اسی طرح بروشو زبان میں حَیَّ اے[٢] [جلدی کر] کا لفظ مستعمل ہے۔ عربی زبان میں "هِـــلال" کے معنی ہیں نیا چاند جب کہ بروشسکی میں یہ لفظ من و عن کنواری، دوشیزہ، بن بیاہی لڑکی کے لیے بولا جاتا ہے۔ ہلال بروشسکی میں لفظ بھی ہے اور تشبیہ بھی۔

"فخر" ایک قدیم عربی لفظ ہے جس سے بروشسکی لفظ ڈھو غُوس بنا ہے۔[٣٣]

بروشسکی فرانسیسی گنتی میں مماثلت:

ماہرین لسانیات کے لیے یہ بات نہایت تعجب خیز ہوگی کہ بروشسکی کی گنتی فرانسیسی زبان کی گنتی سے مکمل مشابہت اور مماثلت رکھتی ہے جب کہ بروشسکی کے حروف تہجی، تلفظ، اور ذخیرۂ الفاظ میں فرانسیسی اثرات کا سراغ ابھی تک نہیں مل سکا۔ گنتی کے اظہار کا بروشسکی طریقہ فرانسیسی طریقے سے مکمل مطابقت رکھتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ابھی کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔

مثال کے طور پر ۹۹۹ کو بروشسکی اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں ایک ہی طریقے سے ادا کیا جاتا ہے۔ فرانسیسی میں کہا جائے گا Neuf Cent Quatre Vingt Dix-neuf

(9 hundred + 4 X 20 + 10 + 9)

اس کا مطلب یہ ہے کہ نو سو جمع چار ضرب بیس جمع دس جمع نو

بروشسکی میں

ہُنتی تھے کے[٢] ولتی اَلتر تورمہ ہُنتی

۹سو + ۴ x ۲۰ + ۱۰ + ۹

اس کا مطلب یہ ہے نو سو جمع چار ضرب بیس جمع دس جمع نو

کیا فرانسیسی اور بروشسکی گنتی کے اصول و ضوابط میں مکمل مشابہت عربی سنسکرت میں موجود قواعد اسم میں پائی جانے والی مماثلت کی طرح محض اتفاقی ہے یا حادثاتی؟ اس پر تحقیق کی ضرورت ہے۔[٣٤]

سو فیصد خواندگی کا اشارہ:

فرانسیسی اور بروشسکی گنتی کے منفرد اصول ان دونوں قوموں میں سو فی صد خواندگی اور تعلیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ گنتی (Counting) کے یہ اصول ان دونوں قوموں کی ذہنی بالیدگی کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ بروشسکی اور فرانسیسی میں گنتی سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ بولنے والے اور سننے والے کو پہاڑے (Tables) حفظ ہوں اور ریاضی کے بنیادی اصول معلوم ہوں تا کہ وہ اعداد کو ضرب دے کر جواب

معلوم کر سکے یا موقف سمجھ سکے۔ گنتی کے اظہار کا یہ طریقہ نہایت پیچیدہ ہے اور اس طریقے میں ذہن کو ہمہ وقت حاضر رکھنا اور درست طریقے سے نتائج نکالنا ضروری ہے اور اس کے لیے معقول حد تک ذہانت بھی درکار ہے۔ اس اصول سے یہ بات واضح ہے کہ ان دونوں قوموں کے تمام لوگ یقیناً پڑھے لکھے تھے اور خواندگی کی سطح سے بلند تر تھے اور دوسری قوموں کی نسبت زیادہ ذہین بھی تھے۔ اس کے بغیر حساب کتاب کا اتنا پیچیدہ نظام اختیار کرنا ممکن نہیں۔ اس تناظر میں دونوں قوموں کی تاریخی ذہانت کا تجزیہ محققین کے لیے تحقیق کے نئے دروازے کھول سکتا ہے۔

بروشسکی اور جاپانی میں مماثلت:

بروشسکی زبان میں انسان، جانور، غیر جاندار اشیاء اور اشیاء کی مقدار کے لیے گنتی کے طریقے مختلف ہیں مثلاً:

ہِس، ایک آدمی اور ہُن، ایک جانور کے لیے ہے جبکہ ہک ایک دفعہ اور اشیاء کی مقدار ناپنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر جاپانی زبان بھی اسی اسلوب کی حامل ہے۔

اردو زبان میں زیر و زبر کے فرق سے لفظوں کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ مثلاً

گئے چار سَن، تراکم تھا سِن کر لیے تھے سُن ترے گھنگھرو
ہوا سینہ چھن گیا دل بھی چھن جونہی بولے چھن ترے گھنگھرو

لیکن زیر و زبر سے پیدا ہونے والا یہ فرق اردو گنتی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اردو میں ایک جانور، ایک انسان، ایک پیالی اور ایک سیر کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے اعراب کے ذریعے آوازیں تبدیل نہیں کی جاتیں۔ اس کے برعکس جاپانی زبان میں بروشسکی کی طرح زیر و زبر سے گنتی کا مفہوم تبدیل ہو جاتا ہے اور مختلف اشیاء کے لیے مختلف الفاظ بھی بولے جاتے ہیں۔ جاپانی زبان میں حفظ مراتب کا بھی خیال رکھا جاتا ہے اور گفتگو میں لفظوں کے استعمال سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جس کے بارے میں گفتگو کی جا رہی ہے اس کا سن و سال کیا ہے۔[۳۵]

زیر زبر کے فرق سے گنتی کے جاپانی اور بروشسکی طریقے میں یہ مماثلت کیا محض اتفاقی ہے، جس طرح عربی اور سنسکرت میں اسم کے اظہار کا طریقہ یکساں ہے اور جس طرح بروشسکی اور فرانسیسی میں گنتی کا طریقہ ایک ہے؟ اس موضوع پر مناسب تحقیق کی ضرورت ہے۔

بروشسکی اور ہنگری میں مشابہت:

قدیم ہنگری باشندوں اور قدیم بروشو افراد کے ناموں میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ مگر کیا یہ مماثلت ذخیرۂ الفاظ یا تلفظ میں بھی موجود ہے؟ اس سلسلے میں ہنگری کے پروفیسر آجر اولا کام کر رہے ہیں۔ ہنگری

زبان جرمنک (Germanic) اور اورال التائی (Ural-Altaic) گروہ سے رابطہ رکھتی ہے۔ بعض ماہرین کے مطابق یہ زبان فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے گہرے اثرات کے باعث قدیم ذخیرۂ الفاظ کھو چکی ہے اور اس کا بنیادی سانچہ اپنی اصل پر قائم نہیں رہا۔ لہٰذا بروشسکی اور ہنگری زبان میں مطابقت کی تلاش ایک کٹھن کام ہے۔ بروشسکی اور ہنگری میں مطابقت تلاش کرنے کے لیے قدیم ہنگری زبان کے مخطوطات پڑھ کر اس کے ذخیرۂ الفاظ میں عہد بہ عہد آنے والی تبدیلیوں کا تجزیہ کر کے ہی کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

بروشسکی زبان اور ماہرین لسانیات:

Grierson کے خیال میں:

"بروشسکی چوتھے گروہ کی واحد نمائندہ زبان ہے۔ جس کے کسی سے الحاق کا اب تک پتہ نہیں ہے۔
اس زبان کو پاکستان کے انتہائی شمال میں واقع گلگت ہنزا یعنی دریائے سندھ کے دو بالائی متوازی دریاؤں کے بیچ کی وادیوں میں ۳۰ ہزار افراد دو لہجوں میں بولتے ہیں۔

اس زبان کی ابتدائی نشوونما کے بارے میں آراء میں اختلاف ہے۔ اس کے بولنے والوں میں دنیا کے چند چنندہ کوہ پیما بھی ہیں۔ ان لوگوں کی عمریں بھی کافی طویل ہوتی ہیں۔

برو[۳۷۵:۱۹۵۴ء] (Burrow) کہتے ہیں کہ یہ غالباً ہمیشہ سے ایک دور دراز کے پہاڑی راستے میں ایک محصور اکائی رہی ہوگی، اور شاید آج سے زیادہ بڑے علاقے پر پھیلی ہوئی بھی ہو۔[۳۶]

Colin P. Masica نے بتایا ہے کہ:

"جب کہ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ ایسے دروں میں یعنی انتہائی بالائی وادیٔ سندھ بشمول نورستان میں پھیلی ہوئی ہوگی جہاں آج دارد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بروشسکی سے داخل ہونے والے الفاظ بھی ان میں سے کچھ زبانوں میں ملتے ہیں مثلاً "زاکن" یعنی "گدھی"۔

دراس کی شینا میں "پھو" یعنی آگ۔ پراسُن میں "ہئل" یعنی پیٹ، اور حیرت انگیز طور پر "لوہے" کے لیے بروشکی زبان کا لفظ "چھومَر" جو کہ کتی، وائیگالی، کلاشا، خووار، گوارتی، پشائے، گوری، توروالی اور شینا زبانوں میں مستعمل ہے۔ یہاں اس بات کو بھی دھیان میں رکھنا چاہیے کہ نہ صرف دراوڑی اور منڈا زبانیں، بلکہ تبتی۔ برمی اور بروشسکی میں بھی قواعد کی خصوصیات یکساں نوعیت کی ہیں جو کہ بعد کی ہند آریائی زبانیں ہیں۔ موخر الذکر کی سب سے واضح خاصیت ان کے فاعل کی مجہولی حالت ہے"۔[۳۷]

David Crystal کی انسائیکلوپیڈیک ڈکشنری آف لینگویج اینڈ لینگویجز کے مطابق:

"شمال مغربی کشمیر، بھارت اور پاکستان کے کچھ حصوں میں بولی جانے والی ایک محصور زبان، تقریباً ۴۰ ہزار افراد بروشو قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ زبان بولتے ہیں اس کا کوئی رسم الخط نہیں ہے"۔[۳۸]

زبانوں کے تعارف پر مشتمل آکسفورڈ پریس کی مشہور کتاب کے مصنف Anatole V. Lyovin نے بروشسکی پر جو تحقیقات کی ہیں اس کے نتائج درج ذیل ہیں:

"بروشسکی ایک محصور زبان ہے جسے تقریباً [ہنزہ اور نگر کے علاقوں میں] ۴۰ ہزار افراد بولتے ہیں۔ یہ زبان داردا ایرانی [ہند یورپی] اور تبتی [چینی۔ تبتی] زبان بولنے والوں کے درمیان گھری ہوئی ہے، لیکن اس کا علاقہ بہت دور اور گھرا ہوا ہے اور اس کا لسانی تعلق بنیادی طور پر دار دا زبانوں خاص کر شینا سے ہے۔

بنیادی طور پر قفقازی زبانوں، اور کچھ دوسری زبانوں سے اس کی صنفی مماثلت کی بنیاد پر روابط ابھی تک مستند نہیں ہیں۔

یہ مانا جاتا ہے کہ کبھی ان علاقوں کے داردا زبانیں بولنے والے ایسی زبان بولتے تھے جو کہ بروشسکی کے مماثل رہی ہوگی۔ یہ ایک فاعلی مجہول زبان ہے، جس میں SOV کا لفظی نظام ہے۔ اس کے علم الاصوات سے متعلق فہرست کافی حد تک اس کی پڑوسی، ہند آریائی اور داردا زبانوں سے مماثل ہے [سوائے سانس لیتے ہوئے پیدا ہونے والی آواز میں رکاوٹ والے الفاظ کے] اور اس میں چھوٹی زبان کی رکاوٹ اور صفیری الفاظ [حروف صحیح جو منہ کم کھلا ہونے کی حالت میں سانس کی رگڑ سے ادا ہوتے ہیں] کی بہتات ہے، جو دوسری ہند آریائی زبانوں میں نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں تین مختلف آوازیں ہیں۔

بروشسکی کے تمام اسم چار مستحکم معنویات کے درجوں میں منقسم ہیں:۔

۱۔ درجہ اسم برائے مذکر

۲۔ درجہ اسم برائے مؤنث

۳۔ درجہ اسم برائے جانور اور غیر انسان اور کچھ اشیاء مثلاً پھل، درخت کے حصے اور لکڑی سے بنی چیزیں اور کچھ قدرتی ماحول خاص کر فلکیاتی اجسام جیسے چاند وغیرہ۔

۴۔ درجہ اسم برائے غیر حیاتی چیزیں۔

یہ تمام درجات فعل کی ساخت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، جہاں سابقے تیسرے شخص فاعل کے ساتھ درجہ متصل بتاتے ہیں جبکہ لاحقے بھی یہی بتاتے ہیں مگر بالواسطہ اور بلاواسطہ مفعول کے ساتھ۔ یہی ایک یادگار عمل ہے جو قفقازی تاریخ۔ داغستانی زبانوں سے مماثل ہے اور عموماً اسی بات کو اپنے قیاس کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے کہ بروشسکی نوعی طور پر ان ہی قفقازی زبانوں سے متعلق ہے۔ دوسرا ایک اور دلچسپ پہلو بروشسکی کا یہ ہے کہ اسم حالتِ اضافی لاحقوں کے طور پر بھی ہوتے ہیں۔ یہ وہ اسم ہیں جنھیں انسانوں اور جانوروں کا قابلِ تقسیم تصرف سمجھا جاتا ہے۔ اس میں جسم کے اعضاء، وہ چیزیں جو اسم کے نام ہیں، وہ اسم جو کچھ خاص جذبات کی طرف اشارہ کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس میں کچھ مختلف اشیاء بھی شامل ہیں، جیسے "چھڑی" اور "تکیہ"۔[۳۹]

بروشسکی زبان کی پیدائش کے متعلق قطعی طور پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی اس لیے کہ ماہرین لسانیات اس زبان کے بارے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتے۔ ماہر لسانیات کی تحقیقات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ ”بروشسکی زبان بولنے والے ایک وقت میں وردا خاندان کی زبانوں کے قریباً تمام علاقے یا پھر اس کے بڑے حصے پر قابض تھے“۔ [گریرسن]

۲۔ ”ہنزہ اور نگر میں دو مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں“۔ [گریرسن]

۳۔ ”ہنزہ اور نگر میں بولی جانے والی دونوں زبانیں ایک دوسری کے مماثل ہیں“۔ [لاشر]

۴۔ ”نگر کے لوگ اپنی زبان کو ’خشکند‘ کہتے ہیں“۔ [مسٹر کوٹوے]

۵۔ ”ایک زبان جو کبھی بہت بڑے حصے پر حاوی تھی آہستہ آہستہ چھوٹے سے چھوٹے حصے میں محدود ہو گئی اور ایسی جگہ پناہ لینے پر مجبور کر دی گئی جہاں اس پر دوسری زبانوں کا اثر نہیں ہو سکتا“۔

[Colonel Lorimer, "Brushuski Language."]

۶۔ ”یہ خطہ ایک عجیب زبان کا جزیرہ دکھائی دیتا ہے جو کہ ہندو یورپی، تبتی اور ترکی زبانوں کے گروہوں کے سنگم پر واقع ہے لیکن اس کا رشتہ ان میں سے کسی سے بھی نہیں۔ بروشسکی ساری ریاست ہنزہ میں نہیں بولی جاتی بلکہ اس کے صرف وسطی حصے میں ہی بولی جاتی ہے“۔ [Barbara Mons,

["High Road to Hunza."

بروشسکی: ناخ داغستانی لسانی گروہ سے مشابہت:

عالمی سطح کے ماہرین لسانیات کی تحقیقات سے یہ بات اس حد تک ثابت ہے کہ بروشسکی زبان کا جینیاتی سلسلہ کسی بھی بڑے لسانی گروہ سے نہیں ملتا۔ لیکن پھر بھی اس کا فاعلی مجہولی انداز دارِدا (Dardic) اور دراوڑی (Dravidian) زبان سے کسی حد تک مماثل ہے۔ قفقازی زبانوں (Caucasian) کے اثرات کی جھلک دیگر زبانوں کے مقابلے میں بروشسکی پر کچھ حد تک نظر آتی ہے کیوں کہ اس زبان کا خطہ جغرافیائی طور پر ان علاقوں سے زیادہ دور نہیں۔ کیوں کہ وادیٔ ہنزہ سے نکلنے والی باریک سی جغرافیائی لسانی پٹی وسطی ایشیا اور مشرق وسطی کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہنگری تک چلی جاتی ہے۔ اور اس لسانی پٹی میں قفقازی زبانیں (Caucasian) بولنے والوں کی کثیر تعداد آباد ہے۔ شاید اس جغرافیائی قربت کے باعث بروشسکی پر ان زبانوں کے اثرات پڑے ہوں اور غالباً اسی لیے ناخ داغستانی لسانی گروہ (Nakh-Dagestani) سے اس زبان کی کچھ مماثلت ماہرین لسانیات کو حیرت زدہ کرتی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مشرقی ایشیا کی تمام زبانوں پر اثر انداز ہونے والی سنسکرت کے اثرات سے بروشسکی محفوظ رہی حتیٰ کہ اپنی قریبی ہمسایہ تبتی اور بلتی زبانوں کا کوئی اثر بروشسکی نے قبول نہیں کیا۔ قریب ترین ہمسایہ زبانوں کے اثرات سے محفوظ

رہنے والی یہ زبان دور دراز کی قفقازی زبانوں (Caucasian) اور ہنگری زبان کے زیر اثر کیسے آ گئی؟ اس اہم سوال کا جواب ڈاکٹر نصیر الدین نصیری کی اس تحقیق میں پنہاں ہے کہ بروشو قوم پہلے ہنگری میں آباد ہوئی تھی۔ لیکن یہ تحقیق بھی مزید تحقیق طلب ہے۔

بروشسکی زبان پر عالمی تحقیقات:

George Morgenstierne نے ۱۹۳۲ء میں بروشسکی زبان پر Lorimar کی تحقیق پیش رفت سے آگاہ کیا تھا۔ اس کے بعد اس زبان میں طویل عرصے تک مزید کسی اہم پیش رفت کی اطلاع نہیں مل سکی۔ تیس سال کے طویل وقفے کے بعد ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی کے ادارہ مطالعہ شرقیہ میں Hermann Berger نے اس موضوع پر تحقیق کر کے اس زبان کے نئے افق دنیا پر روشن کیے۔ ان کے نائب ڈاکٹر وان اسکائی ہاک نے "کسر کی کہانی" بروشسکی سے ترجمہ کی تو بعض نئے گوشے واشگاف ہوئے۔ ٹھیک اسی دور میں ڈاکٹر نصیر الدین بروشسکی زبان میں تحقیقات کے نئے افق روشن کر رہے تھے۔ عربی رسم الخط میں ان کی پہلی مختصر کتاب بائیلم بُرشسکی ۱۹۷۰ء میں اکادمی تحقیقاتِ بروشسکی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ یہ بروشسکی ادب اور زبان کے قواعد پر پہلی کتاب تھی۔ اس کی اشاعت کے ٹھیک چار سال بعد ۱۹۷۴ء میں ماہر لسانیات برگر نے اپنے مطالعات کی بنیاد پر بروشسکی زبان کے تفصیلی قواعد شائع کیے جس کے باعث اس طلسم کدۂ حیرت کا دروازہ دنیا کے لیے کھل گیا۔ ۱۹۹۳ء میں مانٹریال یونیورسٹی کے پروفیسر تفون کی کتاب Hunza Proverbs۔ University of Calgary Press کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ اس کتاب میں پانچ ہزار تیس بروشسکی محاورے جمع کیے گئے ہیں۔ یہ نہایت اہمیت کا حامل کام ہے۔ E.Tiffon نے یہ کتاب مشہور ماہر لسانیات L.Col Dr. Lorimer، ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے مشہور محقق Hermann Berger نیز مانٹریال یونیورسٹی کے محقق Y.Ch. Morin اور ڈاکٹر نصیر الدین ہونزائی کے تعاون سے تیار کی۔

بروشسکی رسم الخط کیا تھا؟ اس بارے میں تاریخ خاموش ہے اور آثار قدیمہ کے مخطوطات، قدیم نوادرات اور اساطیر سے ابھی تک اس زبان کے رسم الخط کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں مل سکا، لہٰذا ہرمن برگر نے بروشسکی الفاظ رومن حروف میں وضع کیے جنھیں بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ پروفیسر ہرمن برگر نے بروشسکی زبان کے الفاظ پر مشتمل پہلی جرمن بروشسکی لغت تیار کی جس میں پچاس ہزار الفاظ کا ذخیرہ جمع کر کے اس زبان کو محفوظ کر دیا گیا۔ یہ لغت ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی اور اس کتاب کی تیاری میں پروفیسر ڈاکٹر نصیر الدین نصیر ہونزائی کا مرکزی کردار ہے جس کا اعتراف ہرمن برگر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

Unter Mitarbeit von Nasiruddin Hunzai

جس کا مطلب ہے "یہ لغت پروفیسر ڈاکٹر نصیر الدین ہونزائی کے تعاون سے تیار کی گئی۔"

زبانیں اور استعماری طاقتیں:

بروشسکی زبان دنیا سے خود مٹی یا اسے مٹا دیا گیا؟ اس بارے میں تاریخ کے دفتر خاموش ہیں، لیکن اس بات کا امکان موجود ہے کہ اس زبان کو طاقت کے زور پر ختم کر دیا گیا ہو لیکن اس زبان کے اندر موجود مخفی طاقت نے اسے زندہ رکھا اور روحانی طاقت نے اسے حیاتِ نو عطا کی۔ گزشتہ تین سو سال کی استعماری تاریخ بتاتی ہے کہ ولندیزی ii] لـDutch، انگریزی (English)، پرتگیزی (Portuguese)، روسی (Russian)، امریکی (American)، فرانسیسی (French) اور ہندو (Hindus) استعمار نے دنیا میں جہاں بھی قبضے کیے وہاں نوآبادیات قائم کیں اور لوگوں کو غلام بنایا۔ لہٰذا اس بات کا امکان موجود ہے کہ بروشسکی زبان کو مٹایا گیا لیکن کئی صدیوں کے بعد اب بروشسکی گرمنس اور نشئس کے مراحل سے گزر رہی ہے اور بروشسکی زبان کی پہلی لغت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ایشیا میں ایک مردہ زبان پھر زندہ ہو رہی ہے۔ اس لحاظ سے اس لغت کی اشاعت ایک اہم موڑ ہے۔ حیاتِ نو کے معاملے میں بروشسکی زبان عبرانی کے مماثل ہے۔ دونوں زبانوں کا احیاء بڑی جدوجہد سے ہوا۔ عبرانی کے احیاء کی کہانی بھی تاریخ، ادبیات ولغات میں خاص اہمیت کی حامل ہے اور اس بات کا استعارہ کہ مری ہوئی زبانیں آج بھی زندہ کی جا سکتی ہیں، صرف عزمِ سفر کی ضرورت ہے۔

زبانیں۔ موت سے احیاء تک:

زبانیں صرف مرتی ہی نہیں ماری بھی جاتی ہیں، قتل بھی ہو جاتی ہیں، انھیں مٹا دیا جاتا ہے لیکن صفحۂ ہستی سے نہیں مٹایا جا سکتا، اگر زبان بولنے والوں کو اپنی زبان سے محبت ہو۔ عبرانی زبان کو مٹنے اور مٹانے کی ایک طویل تاریخ ہے لیکن اسے زندہ کرنے کی بھی ایک سنہری تاریخ ہے جو مٹنے والی زبان بولنے والوں کو ماتم کرنے اور گریاں کناں ہونے کے بجائے حوصلے اور ہمت کی نئی کہانی سناتی ہے۔ کسی قوم اور ملت کے فرد میں اپنی زبان سے محبت کی ایک ننھی سی چنگاری بھی زندہ ہے تو یہ چنگاری کبھی بھی شعلہ بن سکتی ہے۔

عبرانی: مردہ زبان زندہ ہوتی ہے:

اسرائیلیوں نے اپنے محکم ایمان اور اپنے پیہم عمل کی بدولت اپنی مذہبی زبان عبرانی کو موت کے چنگل سے رہائی دلا کر نئی زندگی بخشی۔ ۱۹۴۸ء ہی میں عبرانی کو اسرائیل کی سرکاری زبان بنا دیا۔ صرف پانچ برس بعد ۱۹۵۳ء میں اسرائیلی پارلیمینٹ کے ایک فرمان Act کی رو سے عبرانی زبان کی مجلس کا درجہ بڑھا کر اسے اکادمی کا نام دے دیا۔[۴۰]

عبرانی: کیسے قتل ہوئی؟

عبرانی تقریباً ۲۳۰۰ سال تک یہودی عوام کی بول چال کی زبان تھی۔ اس کا زوال اس وقت شروع ہوا جب ۵۸۶ قبل مسیح میں بابل کے شہنشاہ نبوشاذنظر (Nebuchadnezzer) نے یروشلم فتح کیا۔ یہودیوں کے

معبد اول (First Temple) کو تباہ کر دیا اور یہودیوں کی غالب آبادی کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ بابلی سلطنت عظمیٰ (Babylonian Empire) کی مروجہ، رسمی (formal) زبان آرامی (Aramaic) تھی جسے جلا وطنی میں یہودیوں نے اپنا لیا۔ اس طرح عبرانی یہودیوں کی بول چال کی زبان کے طور پر ختم ہونے لگی۔ آرامی بھی ایک شمال مغربی سامی (Semitic) زبان ہے، جو عبرانی سے بہت مماثلت رکھتی ہے۔ چند عشروں [دہائیوں] کے بعد ایرانی شہنشاہ سائرس (Cyrus) نے بابلی سلطنت پر قبضہ کر لیا تو آرامی (Aramaic) زبان کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کیا۔[۴۱]

عبرانی کا تحفظ: ربی یہوداہاناسی:

تقریباً سو سال بعد جب یہودی جلاوطنی کے بعد اپنے وطن واپس لوٹے تو ایرانی سلطنت کا حصہ ہونے اور آرامی زبان کے سرکاری زبان ہونے کی بنا پر انھیں خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں آرامی زبان عبرانی کی جگہ نہ لے لے۔ اس لیے ربی [امام] یہوداہاناسی (Yahuda Ha-Nasi) نے ۲۰۰ عیسوی میں تالمود کے احکامات کا مجموعہ مشناۃ مرتب کیا، یہودیوں کو اپنی زبان سے غفلت برتنے پر تنبیہ کی۔ ربی یہودا گھر میں ہمیشہ اہتمام سے عبرانی زبان بولتے تھے۔ تالمود میں تحریر ہے کہ ان کی نوکرانی کو عبرانی پر اتنا عبور حاصل تھا کہ ان کے شاگردوں کو جب کوئی لفظ نہ آتا یا بھول جاتا تو اس سے پوچھا کرتے تھے۔[۴۲]

ادب و مذہب کی زبان:

۷۰ عیسوی میں یروشلم اور معبد دوم (Second Temple) کی تباہی کے بعد یہودی دنیا بھر کے ملکوں میں منتشر ہو گئے وہ جس ملک میں بھی گئے، اسی ملک کی زبان اپنا لی۔ تاہم ان کی مذہبی اور ادبی (Literary) زبان عبرانی ہی رہی۔ یہودی مذہبی تعلیم کے دوران عبرانی سیکھتے رہے تا کہ وہ توریت اور تالمود ترجمے کے بجائے اصل زبان میں پڑھ سکیں اور عبادت کے دوران دعاؤں کا مطلب سمجھ سکیں۔ اس رواج نے ایک طرف تو یہودیوں کو خواندہ اور علم دوست بنا دیا، دوسری طرف انھیں بکھراؤ (Dispersion) کے دوران اکثریتی ثقافت میں جذب ہونے سے بچائے رکھا۔ اس طرح وہ دو ہزار سال تک دربدر رہنے کے باوجود اپنا نسلی، مذہبی اور ثقافتی تشخص برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔[۴۳]

عبرانی کا احیاء: آئی ایزر بن یہودا کے ذریعے:

تقریباً دو ہزار سال سے عبرانی محض ایک مذہبی اور کسی حد تک ادبی زبان ہو کر رہ گئی تھی۔ روزمرہ کی بول چال اور زندگی کے دیگر امور میں غیر مستعمل ہو کر نیم مردہ حالت میں تھی۔ انیسویں، بیسویں صدی میں اس کا فلسطین میں، جدید عبرانی کی شکل میں، ادب، سائنس غرض یہ کہ زندگی کے ہر شعبے میں دوبارہ جاری و ساری ہو جانا حیرت انگیز ہے۔ اس کا تمام تر سہرا آئی ایزر بن یہودا (Eliezer Ben-Yahuda) کے سر پہ ہے۔ بن یہودا کو

یہ بہت عجیب لگتا تھا کہ یہودی دنیا کی دیگر ۷۰ زبانیں تو بول سکتے ہیں، لیکن اپنی زبان عبرانی نہیں بول سکتے۔ یہ آزمانے کے لیے کہ عبرانی میں بولے جانے اور احیاء کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں، انھوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ عبرانی میں گفتگو کرنے کی کوشش کی۔ فلسطین میں پہنچتے ہی انھوں نے عہد کرلیا کہ وہ کسی یہودی سے عبرانی کے سوا کسی اور زبان میں بات نہیں کریں گے۔[۴۴]

موت سے زندگی کا سفر: اتمر بن ابی پر تجربات:

۱۸۸۲ء میں جب ان کا پہلا بیٹا بن زائین بن یہودا (Ben Zion Ben-Yahuda) جسے عام طور پر اتمر بن ابی (Itamar Ben-Avi) کہا جاتا ہے، پیدا ہوا تو انھیں تجربہ کرنے کا ایک بہت اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ ایسے گھر میں، جہاں ہر وقت عبرانی بولی جاتی ہو، پلنے والا بچہ جب بولنا سیکھے گا تو وہ حالیہ تاریخ میں پہلا شخص ہوگا جس کی مادری زبان عبرانی ہوگی۔ یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہوگا کہ عبرانی زبان کا مکمل احیاء ممکن ہے۔ جیسا کہ بن یہودا نے اپنی شاہکار لغت [ڈکشنری] کے تعارف میں بھی لکھا "ہماری زبان جو بولی نہیں جاتی، اگر کسی فرد واحد کی زبان بن جائے تو پھر شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ پوری قوم کی بول چال کی زبان (Spoken Language) بھی بن سکتی ہے"۔

بن یہودا اور ان کا عبرانی بولنے والا خاندان لوگوں کے لیے عبرانی زبان کے احیاء کی علامت اور قابل رشک و تقلید مثال بن گئے۔ ان کے بیٹے اتمر بن ابی (Ittamar Ben-Avi) کی خودنوشت سوانح عمری کے مطابق بچے کی زبان کی روزمرہ ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بن یہودا نے مختلف چیزوں مثلاً گڑیا، آئس کریم، جیلی، آملیٹ، رومال، تولیہ، بائیسکل اور سینکڑوں دیگر اشیاء کے متبادل عبرانی نام اختراع کرنے شروع کر دیے۔ جوں جوں بچہ بڑا ہوتا چلا گیا اسی طرح عبرانی زبان ذخیرہ الفاظ و اظہار کے فطری پن کے لحاظ سے ترقی کرتی چلی گئی۔ عبرانی زبان کے احیاء کے لیے انھوں نے جس اصول پر عمل کیا وہ تھا "عبرانی گھر میں"، "عبرانی سکول میں" اور "لفظ بلفظ او رعبرانی لفظ"۔[۴۵]

عبرانی: عربی سے نفرت:

عبرانی بولنے والے علماء اور خصوصاً یہودی علماء لسانیات کا یہ دعویٰ ہے کہ عربی عبرانی زبان کی جدید ترین شکل ہے اور عربی کے حروف تہجی اور ذخیرہ الفاظ عبرانی ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ عبرانی زبان کے احیاء کی جب تحریک شروع ہوئی تو اس وقت عبرانی زبان کا ذخیرہ الفاظ صرف آٹھ ہزار تھا اور ربائے عبرانی ائی یزر بن یہودا (Eliezer Ben Yehuda) کو بے شمار الفاظ خود تخلیق کرنے پڑے یا دنیا کی مختلف زبانوں سے وہ الفاظ انھوں نے اخذ کیے لیکن اسلام سے نفرت کے باعث عربی زبان کے الفاظ اور لغات کو نہ تو ترجیح دی گئی اور نہ ہی الفاظ کے انتخاب اور اخذ کے دوران عربی زبان پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس رویے کے پس پشت ایک تاریخی

عصبیت بھی ہے لیکن یہی عصبیت یہودی علمائے لسانیات کے اس دعوے کی تردید بھی کرتی ہے کہ عربی زبان عبرانی زبان ہی کا ایک جدید نمونہ ہے۔ اس تناظر میں علامہ شبلی نعمانی کا یہ دعویٰ درست نظر آتا ہے کہ عربی عبرانی سے زیادہ قدیم زبان ہے۔

دوسری زبانوں کے ذریعے عبرانی کی تعلیم:

جیسا کہ ۱۹۲۸ء میں اس وقت کے ایک استاد داؤد یودالے ویز David Yudeleviz نے لکھا ہے کہ "لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ حالات کتنے مشکل تھے۔ کتابوں، سینکڑوں الفاظ، اسم، فعل اور محاورات نہ ہونے کے باوجود ہم نے پڑھانا شروع کر دیا۔ ہم نیم گونگوں کی طرح ہکلاتے ہوئے ہاتھوں اور آنکھوں کے اشاروں سے باتیں کرتے تھے"، ایک اور مشہور استاد داؤد ییلین (David Yellin) نے لکھا۔ "ہر استاد کے پاس عبرانی کے بجائے روسی یا فرانسیسی میں کتاب ہوتی تھی اور اسے عبرانی میں پڑھانے کا کام سر انجام دینا ہوتا تھا۔ درسی اصطلاحات موجود نہ تھیں۔ دیہاتی اسکولوں کا ہر استاد عبرانی زبان کی اکادمی کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ اپنی پسند اور ذوق کے مطابق الفاظ وضع کرتا اور اپنی ہی تخلیقات کو پڑھانے کے لیے استعمال کرتا۔ تاہم جوں جوں وقت گزرتا گیا، مسائل خود بخود حل ہوتے چلے گئے۔ ایک نوزائیدہ عبرانی بولنے والی نسل وجود میں آ گئی تو سب کو یقین ہو گیا کہ زبان کا احیا کامیابی سے ہمکنار ہوگا"۔ [۴۶]

سترہ جلدوں پر مشتمل تاریخی لغت:

بن یہودا کو عبرانی زبان کی کم مائیگی کا احساس اس وقت ہوا، جب انھوں نے پیرس میں اپنے دوستوں کے ساتھ عبرانی بولنے کی مشق شروع کی۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے انھوں نے نئے الفاظ وضع کر کے ان کی فہرستیں اخباروں میں چھاپنا شروع کر دیں۔ اس طرح انھوں نے غیر رسمی اور بے قاعدہ طور پر الفاظ سازی اور لغت نگاری کا آغاز اپنے پیرس کے قیام کے دوران کیا۔ لیکن انھوں نے ۱۹۱۰ء میں اپنی معرکتہ الآرا لغت باقاعدہ طور پر مرتب کرنا شروع کی۔ بن یہودا اٹھارہ، اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتے تھے۔ آخر کار ان کی طویل، محنت شاقہ رنگ لائی۔ ان کی مرتب کردہ، سترہ جلدوں پر مشتمل "قدیم اور جدید عبرانی کی مکمل لغت (A Complete Dictionary of Ancient and Modem Hebrew) آج بھی عبرانی لغت نگاری (Hebrew Lexicograhphy) کی تاریخ میں یکتا تصور کی جاتی ہے۔

عبرانی زندہ ہو گئی:

ان کی زندگی ہی میں ایک مردم شماری (Census) کے دوران فلسطین کے ہر یہودی نے اپنی زبان عبرانی درج کی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عبرانی کہیں بھی یہودیوں کی روزمرہ کی زبان نہیں تھی اور مخصوص حالات کے علاوہ بولی بھی نہیں جاتی تھی۔ اس لیے اگر یہ مردہ زبان نہیں تھی تو زندہ بھی نہیں تھی۔ غالباً اسے "نیم مردہ" کہنا

زیادہ مناسب ہوگا۔ عبرانی کے احیاء میں بن یہودا کے کردار کے بارے میں سیمل روتھ (Semil Roth) کے ایک بلیغ مقولے کے مطابق "بن یہودا سے پہلے...... یہودی عبرانی بول [تو] سکتے تھے، لیکن اس کے بعد وہ واقعی بولنے لگے"۔ [۴۷]

عبرانی کا سفر صرف آٹھ ہزار لفظوں سے شروع ہوا:

الفاظ سازی کے میدان میں عبرانی زبان کی مجلس (Hebrew Language Council) کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ عبرانی زبان کا ذخیرہ الفاظ ۸۰۰۰ سے بڑھ کر ۱۲۰۰۰۰ ہو گیا ہے۔ جے ایم پائینز (J.M. Pines) کے مطابق الفاظ سازی کے لیے مجلس کے ارکان اس راز سے بخوبی واقف تھے "کہ کسی نئے لفظ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ نیا نہ لگے"۔

اسرائیل کے اندر ۶ ملین یہودی اور ۲ ملین عرب عبرانی زبان بولتے ہیں۔ فرانس میں ۵ ملین یہودی اور ۵ ملین اسرائیلی تارکین وطن جو زیادہ تر امریکا میں آباد ہیں، گھر میں عبرانی بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ، ارجنٹائین، فرانس، جرمنی، کینیڈا، آسٹریلیا، روس، جنوبی افریقہ، یوکرین، برطانیہ، امریکہ میں جہاں یہودیوں کی خاصی بڑی آبادی ہے، خاص طور پر وہ جو کبھی اسرائیل نہیں گئے، نہ تو عبرانی بولتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ [۴۸]

عبرانی: علمی سفر:

عبرانی کو ذریعہ تعلیم بنانے سے اسرائیل میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا معیار گرا نہیں بلکہ اس وقت وہ ان میدانوں میں صف اول کی قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں ایک اسرائیلی ادیب شمائیل یوسف اگنن (Shmuel Yousef Agnon) کو ادب میں نوبل انعام دیا گیا۔ اس سال علم کیمیا (Chemistry) کا نوبل انعام مشترکہ طور پر دو اسرائیلی بائیو کیمسٹوں، ہارون سیچانووار (Aaron Ciechanovar) اور ابرام ہرشکو (Avram Hershko) اور امریکا کے ارون روز (Irwin Rose) کو ملا ہے۔ [۴۹]

اگلے سو برسوں میں ۹۰ فی صد زبانیں مٹ جائیں گی؟

ایک ایسے عہد میں جب زبانیں مٹ رہی ہیں، عالمگیریت اور سرمایہ داری کے ذریعے زبانیں مٹائی جا رہی ہیں، انگریزی کو مسلط کیا جا رہا ہے، نت نئی ایجادات کے باوجود تحریک تحویر نشاۃ ثانیہ اور خرد افروزی کے تین سو سالوں میں استعماری طاقتوں نے کسی ایک زبان کو جنم نہیں دیا بلکہ زبانوں کو ختم کیا گیا، یہ اعزاز صرف ایشیا کو حاصل ہے کہ یہاں ایک بولی [بروشسکی] زبان بن گئی ہے اس لیے یہ سوال کہ بروشسکی زبان کتنے عرصے تک زندہ رہے گی؟ اس بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ آسٹریلیا کے ممتاز ماہر لسانیات پیٹر ہوسلر نے ایک دلچسپ و اہم پیش گوئی کی ہے کہ اگلے سو برسوں میں نوے فی صد زبانیں صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی اور صرف پانچ یا چھ بنیادی اہم زبانیں باقی رہ جائیں گی، جن میں انگریزی، ہسپانوی، فرانسیسی، جرمن، چینی اور عربی زبانیں شامل

ہیں، جب کہ ملیشیا اور انڈونیشیا میں بولی جانے والی بھاشا (Bahasa) زبان کے بارے میں امکان ہے کہ یہ زبان بھی شاید باقی رہ جائے۔ اس کا موقف ہے کہ زبانیں ہمارے اندازے سے بھی زیادہ تیزی سے فنا ہو رہی ہیں۔ مثلاً آسٹریلیا میں یورپی باشندوں سے پہلے یعنی دو سو سال قبل دو سو پچاس زبانیں بولی جاتی تھیں لیکن اب وہاں کے طول و عرض میں صرف پچاس زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کیوں کہ انگریزی استعمار نے قتلِ عام اور چھوٹی زبانوں کی حوصلہ شکنی کے ذریعے نسلوں کو فنا کر دیا اور زبانوں کو مٹا دیا۔

ایک اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں چھ سے دس ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں مکمل باضابطہ زبانوں کے ساتھ ساتھ بولیاں بھی شامل ہیں۔ ہوسلر کے خیال میں زبانوں کے فنا ہونے کی اصل وجہ بڑے پیمانے پر نقلِ مکانی ہے۔ جس کے نتیجے میں تارکینِ وطن اپنی زبان ترک کر کے جائے سکونت میں بولی جانے والی زبانیں اختیار کر لیتے ہیں تا کہ مقامی آبادی میں جذب ہو جائیں۔ زبان کی تبدیلی ان کے لیے اقتصادی و سماجی اعتبار سے سودمند ثابت ہوتی ہے۔

صرف چار زبانیں باقی رہ جائیں گی؟

دوسرا نقطہ نظر نوبل انعام یافتہ ہسپانوی ادیب کامیلیو خوسے تھیلا (Camillo Jose Cela) کا ہے۔ اس نے پیش گوئی کی ہے کہ اگلی چند صدیوں تک دنیا بھر کے لوگ صرف چار زبانیں استعمال کریں گے۔ یعنی عربی، ہسپانوی، انگریزی اور چینی اس کے سوا تمام زبانیں صرف علاقائی زبانوں کا روپ دھار کر محبت اور شاعری کے لیے رہ جائیں گی۔

زبانیں کیوں ختم ہو جائیں گی؟

عالمگیریت، سرمایہ داری، آزادی اور آزادیٔ اظہارِ رائے کا طوفان مذاہب، تہذیبوں، ثقافتوں اور زبانوں کے لیے ایک خطرہ بن چکا ہے۔ دنیا بھر کے معاشروں میں کروڑوں سال سے موجود تنوع اور رنگا رنگی، عالمگیریت اور سرمایہ دارانہ ثقافت و تہذیب کے استعماری غلبے کے باعث اپنا وجود کھو رہے ہیں جس کے نتیجے میں زبانیں تیزی سے مر رہی ہیں اور تہذیبیں اپنی شناخت کھوتی جا رہی ہیں۔ مذہب، ثقافت اور تہذیب کے تمام ڈھانچے تیزی سے سرمایہ داری کے سانچے میں ڈھالے جا رہے ہیں یا خود بخود ڈھلنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ مغربی تہذیب کے غلبے کے باعث خاندانی نظام زبردست شکست و ریخت کا شکار ہے۔ خواہشاتِ نفس کی ہر صورت میں تکمیل تہذیبِ جدید کا فلسفہ ہے اور اس فلسفے پر عمل کے باعث خاندان اور قبیلے اپنے قدیم مقامات چھوڑ کر رزق کی تلاش میں ترکِ وطن کر رہے ہیں۔ اعلیٰ معیارِ زندگی کی تلاش کے باعث خاندان دن بدن مختصر ہوتے جا رہے ہیں۔ مختصر خاندان آبادی کے خطرے سے بچنے کے لیے اُمید کی علامت سمجھے گئے لیکن اس کے نتیجے میں زبانوں کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔

کم آبادی: زبانوں کو خطرہ

یورپ اور امریکہ میں آبادی کی شرح تیزی سے کم ہونے کے باعث معیار زندگی میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے لیکن دنیا بھر میں سب سے زیادہ زبانوں کے لیے خطرات یورپ اور امریکہ میں پیدا ہوئے۔ افریقہ میں بھی زبانیں ختم ہو رہی ہیں۔ ایک ہزار چار سو زبانوں میں سے صرف آٹھ سو زبانیں باقی رہ گئی ہیں اس کی وجہ مختلف ہے۔ امریکہ کے قدیم باشندوں کی ایک ہزار زبانیں موجود تھیں لیکن اب ان زبانوں کی تعداد صرف ۱۵۰ رہ گئی ہے۔ یورپ کی ۲۲۵ زبانوں میں سے ۵۰ زبانیں سنگین خطرات کا شکار ہیں۔ کینیڈا کی حکومت کئی سالوں سے زبانوں کے تحفظ کے لیے اپنے قومی میزانیے میں بھاری رقومات مختص کر رہی ہے جس کے نتیجے میں کئی زبانیں محفوظ ہو گئی ہیں لیکن مصنوعی حفاظت کا یہ نظام کتنے برس چل سکے گا اس سوال کا جواب بہت مشکل نہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں رومانس زبان (Romance) مسلسل خطرے میں ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں رسم الخط کی جبری اور رضا کارانہ تبدیلی کے باعث وہ قومیں اپنی تاریخ اور ماضی کے علوم و ادبیات دانش و تجربات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کی جا رہی ہیں۔ ایسی قومیں وجود پذیر ہو رہی ہیں جن کا کوئی ماضی نہیں ہوگا نہ تاریخ یہ زندگی کا سفر سرمایہ داری کی ثقافت کے جلو میں طے کریں گی۔ حیرت یہ ہے کہ کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ذرائع ابلاغ کی سہولیات کے باعث نئی زبانیں وجود میں آنے کے بجائے پرانی زبانیں نہایت تیزی کے ساتھ فنا کے گھاٹ اتر رہی ہیں اور اکثر طاقت کے زور پر اس گھاٹ اتاری جا رہی ہیں۔ ثقافتی استعماریت، عسکری استعماریت کے پہلو بہ پہلو دنیا بھر میں تاخت و تاراج میں مصروف ہے۔

عربی زبان کا اعجاز اور کمال:

زبانوں کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ زبانیں عموماً ۵۰۰ سال کے بعد تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ۷۰۰ برس پہلے کی انگریزی کا متن آج کوئی انگریز نہیں پڑھ سکتا۔ مشہور انگریز شاعر چاسر (Chaucer) کی نظمیں اس کے آبائی شہر لندن میں ہر شخص سمجھنے سے قاصر ہے۔ ہندو مذہب کے علماء سنسکرت کے عالم نہیں ہوتے یہودی، عیسائی مذہب کے علما عبرانی و یونانی زبان کے عالم نہیں ہوتے، جو ان کے مذہبی صحائف کی زبانیں ہیں، اس کے برعکس مسلمانوں کے تمام علما عربی اور فارسی زبانوں سے عموماً واقف ہوتے ہیں، یہ واقفیت قرآن و سنت کی برکت سے ابد تک قائم رہے گی۔ عربی دنیا کی واحد زبان ہے جو آج بھی پہلے کی طرح تر و تازہ ہے اور شکست و ریخت کے عمل سے محفوظ ہے۔ اس کا رسم الخط، ذخیرۂ الفاظ قواعد و ضوابط کے اصول آج بھی وہی ہیں، اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کا زندہ تعلق قرآن کریم کے ذریعے امت مسلمہ کی عبادات کا حصہ بن چکا ہے اور عبادات و مناجات کے لیے عربی زبان کا لازمی ہونا اس زبان کے فروغ اور ارتقا کا سبب ہے جس کے باعث قرآن کے متن میں کسی تبدیلی کی کوشش ہمیشہ ناکام رہے گی۔ عربی زبان دنیا کی واحد زبان ہے جس کے دو سو ڈھائی سو الفاظ دنیا کے کسی

بھی خطے میں رہنے والا ایک عام مسلمان بھی سمجھتا ہے خواہ وہ کسی نسل اور کسی زبان سے تعلق رکھتا ہو۔ پیغام رسالت مآبؐ کی طرح عربی زبان بھی زباں و مکاں سے ماورا ہوگئی ہے۔

دنیا کا ہر مسلمان عربی اصطلاحات الفاظ و عبارتوں سے واقف بلکہ ان کا حافظ بھی ہے لہٰذا اذان، سلام، مسنون، وضو، سورہ فاتحہ، تکبیر، الحمد اللہ، استغفر اللہ، ماشاءاللہ، چند بنیادی سورتیں، ایمان و عقائد سے متعلق چند ضروری باتیں، دعائیں، مناجات اور معاشرت کے بعض اہم مسائل سے متعلق عربی اصطلاحات مثلاً نکاح، طلاق، میراث، عدت وغیرہ وغیرہ۔ ہر مسلمان کے لیے عام باتیں ہیں۔ اس کے برعکس انجیل اور تورات جن کی اصل زبان ان مذاہب کے علماء کے مطابق عبرانی تھی مگر اب عام یہودی و عیسائی تو درکنار ان مذاہب کے علماء و فضلا بھی خال خال ہی اس کو جانتے ہیں۔

سنسکرت، قشطالوی، کورنش خطرے میں

یہی حال ہندومت کی زبان سنسکرت کا ہے عبرانی اور سنسکرت کو چند عشروں قبل اسرائیل اور ہندوستان میں زندہ کرنے کی بھرپور کوششیں شروع کی گئیں جس کے نتیجے میں ان زبانوں کے علماء کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور عبرانی اور سنسکرت پر ایک مرتبہ پھر توجہ مبذول ہوگئی ہے۔ بھارت میں ‘‘سنسکرت گرام’’ کے چھوٹے چھوٹے قصبے بنائے گئے جہاں سنسکرت کو رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ قصبے جنوبی بھارت میں بنائے گئے کیوں کہ جنوبی بھارت میں دراوڑ قوم بستی ہے اور وہاں خاندانی نظام بہت مضبوط ہے اور زبانیں خاندانی نظام میں تیزی سے پنپتی ہیں اور زندہ رہتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں زبانوں کے ختم ہونے کا ایک اہم ترین سبب قدیم نسلوں کا بے دریغ قتل عام، خواہشات نفس کا غلبہ، خاندانی نظام کا انہدام اور خاندانی منصوبہ بندی کا فروغ ہے۔ خاندان اور خاندانی نظام سے دوری نے آج دنیا کی اہم ترین زبان ہسپانوی کے ادبی لہجے ‘‘قشطالوی’’ (Castillian) کو معدومی کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ہسپانیہ میں ‘‘ایک ماں ایک بچے’’ کا مغربی فلسفہ مقبولیت اختیار کرچکا ہے۔ جس کے باعث خطرہ ہے کہ سن دو ہزار پچاس تک ہسپانیہ کا یہ معیاری اور معلّیٰ لہجہ ختم ہوجائے گا۔ انگلستان کے جزیرہ (Isle of Man) کی زبان Manx کا خاتمہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے جب کہ کورنش (Comish) کے بولنے والے برائے نام رہ گئے ہیں۔ ثقافتی، فکری اور لسانی استعماریت کی عالمگیر جنگ جو نوآبادی نظام کے قیام کے ساتھ ہی المانوی، فرانسیسی، ولندیزی اور برطانوی استعمار نے شروع کی تھی اب برگ و بار لارہی ہے۔ زبانوں اور ثقافتوں کی موت کا اعلان کررہی ہے۔ ایک زبان کی موت ایک عظیم تاریخی ورثے کی موت ہے لیکن اس موت پر رونے والا کوئی نہیں ہے، کسی کی آنکھ میں کوئی آنسو نہیں ہے۔

تین ہزار زبانیں خطرے میں

دنیا میں اس وقت کل بولی جانے والی پانچ ہزار سے زائد زبانوں میں سے ۳ ہزار زبانیں تیزی کے

ساتھ زوال کا شکار ہیں زبانوں کے تحفظ کے اعتبار سے برعظیم پاک و ہند دنیا بھر میں سرفہرست ہے۔ آریاؤں کی یلغار کے بعد برعظیم کی قدیم ترین نسل دراوڑی تتر بتر کر دیے گئے لیکن اپنی تہذیب، ثقافت اور زبان کی حفاظت کے لیے دراوڑیوں کے منتشر قافلے دور دراز خطوں اور فلک بوس پہاڑوں کے دامن میں آباد ہو گئے۔ سنسکرت کو دراوڑیوں کا رسم الخط ”گرنتھا“ اختیار کرنا پڑا اور دراوڑی سلسلوں کی زبانیں تیلگو، تامل، کنڑ، ملیالم اور براہوی زبانوں کی شکل میں آج بھی محفوظ ہیں اس کی بنیادی وجہ دراوڑیوں کا مضبوط قبائلی اور خاندانی نظام تھا جس نے ان کی اجتماعیت کو شدید ترین حملوں کے باوجود زندہ رکھا اور خاندان کے مضبوط ادارے نے ان کی زبان کو کتبات، کتابوں، مخطوطات، نوشتوں اور مہروں کے بغیر نسل در نسل تک خالہ پھوپھی، چچی، نانی، دادی کے رشتوں کے ذریعے بہ حفاظت دوسری نسلوں تک منتقل کیا۔

زبانوں کی حفاظت: طریقے

بچپن کی لوریاں، سونے سے پہلے سنائی جانے والی خوبصورت کہانیاں، درد و فراق اور ہجر کے گیت، زندگی میں رنگ گھولنے کے لیے خوبصورت داستانیں اور لوک کہانیاں دراوڑیوں کی زبان کو آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ تاملوں (دراوڑیوں) کے مضبوط خاندانی نظام، اجتماعیت اور روایات سے گہرے تعلق نے ان کی ثقافت و زبان سے محبت کو برقرار رکھا جس کی وجہ سے آج تامل زبان ملیشیا، سنگاپور اور سری لنکا کی قومی زبانوں کا درجہ رکھتی ہے۔ مغرب میں خاندان کا ادارہ ختم ہوا تو دادی نانی تو کجا اب تو ماں باپ بھی قصۂ پارینہ بن چکے لہٰذا زبانوں کا خاتمہ ایک فطری عمل ہے جو تہذیب مغرب کا اختیار کرنے کے نتیجے میں لازماً وقوع پذیر ہو کر رہے گا۔

مغرب کا غلبہ: نئی زبان سے محروم

ہماری معلومات کے مطابق سترہویں صدی میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے بعد علوم و فنون اور ابلاغی انقلاب کی عالمگیریت اور سائنس کی زبردست ترقی کے باوجود دنیا میں کسی نئی زبان کا اضافہ نہیں ہو سکا اور قدیم بولیاں تک رسم الخط اختیار کر کے زبان نہیں بن سکیں حالانکہ ذرائع ابلاغیات اور کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد زبانوں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے تھا۔ نئی زبانوں کی اہمیت کو مغرب میں محسوس کیا گیا لیکن تخلیق کے فطری اداروں کو چھوڑ کر مصنوعی طریقے اختیار کر کے مصنوعی زبان تیار کی گئیں۔ اسپرانتو، اوکسی ڈینٹال، انٹرلینگوا، وولاپوک وغیرہ اس کی مثالیں ہیں لیکن ان کا انجام ”ڈولی“ (مصنوعی بھیڑ) اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی طرح اپنے انجام کو پہنچا۔

اس سلسلے میں واحد استثناء بروشسکی زبان کا ہے جو صدیوں تک بولی جاتی رہی لیکن اردو عربی رسم الخط اختیار کرنے کے بعد اب مکمل زبان کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ یہ زبان رومن اور عربی رسم الخط میں لکھی جا رہی ہے۔ لیکن اس زبان کا تعلق بھی برعظیم پاک و ہند سے ہے اور اس زبان کے فروغ میں اسمٰعیلی برادری کا خصوصی حصہ ہے کیوں کہ بروشسکی بولنے والوں کی اکثریت مذہب اسمٰعیلی کی پیروکار ہے۔ جامعہ کراچی میں پروفیسر سحر

انصاری نے ایک علمی نشست میں بروشسکی زبان پر گفتگو کے بعد پروفیسر اسحاق منصوری کے ایک سوال کے جواب میں اس خدشے سے اتفاق کیا تھا کہ بروشسکی کا فروغ ایک اہم معاملہ ہے اور غالباً اسمٰعیلی ریاست کے قیام کے لیے اس زبان پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔

برعظیم کی زبانوں میں ایک نئی زبان کا اضافہ اس دعوے کا ثبوت ہے کہ ایشیا مذاہب تہذیب اور زبانوں کا آج بھی گہوارہ ہے۔

زبانوں کا خاتمہ: مغربی تہذیب و فلسفہ

زبانیں کیوں ختم ہو جائیں گی یا اگر بچ بھی گئیں تو صرف عشق و محبت کے لیے کیوں مخصوص ہو جائیں گی۔ اور صرف چار اہم زبانیں ابلاغ کا ذریعہ کیوں بن جائیں گی؟ ماہر لسانیات کی جانب سے اٹھائے گئے یہ سوالات اہم سوالات ہیں اور ان کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں مغربی فکر و فلسفے کی تین سو سالہ تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ غالباً اس مطالعے اور مشاہدے کے بعد مشہور انگریز نومسلم مارما ڈیوک پکتھال نے اپنے خطبات Islamic Culture میں مغربی تہذیب کو تہذیب تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ مغرب کو Society of Dogs and Pigs قرار دیتے ہیں۔ اسے وحشت و بربریت کی علامت سمجھتے ہیں اور اسے سولائزیشن تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اس فلسفے کے نتیجے میں دنیا بھر میں Streak of Accentricity کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ مشہور فرانسیسی فلسفی Gills Deleuze مغربی تہذیب کو عالمگیر تہذیب تسلیم نہیں کرتا وہ اسے بہیمیت، وحشت و بربریت Savage قرار دیتا ہے، اپنی بعض کتابوں کے سرورق پر وہ لکھتا ہے کہ Capitalism is a Schizophrenic System واضح رہے کہ مشہور فلسفی فوکو Deleuze کے بارے میں کہتا ہے کہ 21st Century will be the Deleuze's century. یہ وہی فوکو ہے جس نے کہا تھا کہ انسان تو اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا ہے۔ مغرب کے خلاف ان خطیبانہ بیانات کے باوجود اس کی اصل حقیقت کو سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم مغربی فکر و فلسفے کی اصلیت، حقیقت، ماہیت حیثیت اور عصری تاریخ میں اس کے مقام سے واقف نہ ہوں۔ اس فلسفے سے واقفیت کے نتیجے میں ہمیں معلوم ہوگا کہ مغرب میں زبانیں کیوں مٹائی گئیں۔ براعظم امریکہ، آسٹریلیا، ایشیا، افریقہ کی نوآبادیات میں زبانیں کیسے قتل کی گئیں؟ مغرب کی مصنوعی زبانیں کیوں زندہ نہ رہ سکیں اور مغرب میں کوئی نئی زبان کیوں وجود میں نہ آ سکی؟ اگر ایشیا میں بروشسکی زبان کی لغت تیار ہو سکتی ہے تو امریکہ، یورپ میں سینکڑوں مٹتی ہوئی زبانوں کی لغت تیار ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید خالد جامعی مرتب جریدہ شمارہ ۲۱ [لسانیات نمبر] اور جریدہ شمارہ ۲۲ [قدیم لسانیات وکتبات نمبر زبانوں کے آغاز اور ارتقاء پر خصوصی اشاعتیں] شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی کا علمی و تحقیقی مجلہ دونوں شماروں میں مولانا ابوالجلال ندویؒ کی لسانی تحقیقات پیش کی گئی ہیں۔ جن میں "ام الالسنہ" کے حوالے سے نئے مباحث ہیں۔ ندویؒ نے عربی کو ام الالسنہ قرار دیا ہے اور وادی سندھ کی مہروں کے نقوش عربی زبان کی مدد سے پڑھنے کا دعویٰ کیا ہے۔

۲۔ ایضاً، جریدہ شمارہ ۲۳ [فلسفہ لسان نمبر] اس شمارے میں وادی سندھ کی مہروں کے حوالے سے ام الالسنہ کی نئی بحث کی گئی ہے اور سنسکرت کے بجائے عربی کو ترجیح دی گئی ہے۔

۳۔ ایضاً، جریدہ شمارہ ۲۴ [قدیم لسانیات و ادبیات نمبر] اس شمارے میں زبانوں کے آغاز کے بارے میں مذہبی روایات کا تحقیقی جائزہ، اقوام عرب و عجم کا اسلوب تحریر و فن لغت نویسی، دنیا بھر میں موجود زبانوں کی تقسیم و تفہیم وغیرہ موضوعات اور مولانا ابوالجلال ندوی کا تحریر نقوش موئن جودڑو شامل ہیں۔

۴۔ ڈاکٹر سہیل بخاری "اردو کی کہانی" فضلی سنز لمیٹڈ کراچی ۱۹۹۴ء

۵۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل مرتب جریدہ شمارہ اکیس [لسانیات نمبر] اس شمارے میں خالد حسن قادری کا تحقیقی مضمون "اردو کا آغاز اور مولد" انگریزی سے ترجمہ کر کے شامل کیا گیا ہے جس میں زبانوں کے آغاز اور ام الالسنہ کے حوالے سے نئے گوشے وا کیے گئے ہیں۔

۶۔ سید خالد جامعی مرتب جریدہ شمارہ ۲۹ [غیر مطبوعہ کتابیں نمبر] معروضات میں صفحہ ایک پر مرتب نے ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی مدیر شب خون کا خط نقل کیا ہے جس میں سہیل بخاری مرحوم کی تحقیقات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۷۔ ڈاکٹر خالد حسن قادری "اردو کا آغاز اور مولد" مشمولہ جریدہ شمارہ ۲۱، ص IX ایضاً

۸۔ ایضاً، ص IX

۹۔ ایضاً، ص X

۱۰۔ ایضاً، ص IX

۱۱۔ ایضاً، ص XIV

۱۲۔ سید خالد جامعی، وادی سندھ کے لوگوں کا مذہب، جریدہ ۲۴، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، ص ۴۷ تا ۵۹۔

۱۳۔ ابوالجلال ندوی، آثار و افکار، سید خالد جامعی، مدیر جریدہ ۳۴، ۲۰۰۴ء، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی۔

۱۴۔ زبانوں کے آغاز کے بارے میں مذہبی روایات کا تحقیقی جائزہ، سید خالد جامعی، جریدہ ۲۴، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی، ص ۱۱۲ تا ۱۳۲

۱۵۔ گروپ کیپٹن فیاض محمود تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند[علاقائی ادب]لاہور پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۳ء
جلد۔ص۵۶......لاہور

۱۶۔ شہباز سلیم[بروشسکی زبان]مشمولہ جریدہ ۲۱،ص XXIV

۱۷۔ ایضاً،ص XXIV

۱۸۔ گروپ کیپٹن فیاض محمود تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند[علاقائی ادب] پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۳ء جلد۵ص
۵۷،۵۸،لاہور

۱۹۔ ایضاً،ص۷۰،۷۱

۲۰۔ ایضاً،ص۶۳تا۶۱

۲۱۔ گروپ کیپٹن فیاض محمود مرتب تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند[علاقائی ادب] پنجاب یونیورسٹی،ص
۷۷۔۷۸،لاہور

۲۲۔ ایضاً،ص۸۰

۲۳۔ ایضاً،۸۰۔۸۱

۲۴۔ ایضاً،ص۸۲

۲۵۔ ایضاً،ص۸۲،۸۳

۲۶۔ گروپ کیپٹن فیاض محمود تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند[علاقائی ادب] پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۳ء جلد۵،ص
۶۹تا۶۵

۲۷۔ جریدہ شمارہ۲۶ ایضاً،معروضات ص۲

۲۸۔ G. Morgenstiern: Report on a liguistic Mission to North West India 1932
OSLO.

۲۹۔ معروضات ڈاکٹر معین الدین عقیل مشمولہ جریدہ ۲۱،ص V.VI

۳۰۔ سید خالد جامعی "بروشسکی تاریخ و تحقیق کی میزان میں" مشمولہ جریدہ شمارہ ۲۱ XXVIII

۳۱۔ ایضاً، XXIX- XXVIII

۳۲۔ ایضاً، XXIX

۳۳۔ ایضاً، XXX

۳۴۔ ایضاً، XXXI

۳۵۔ XXII, XIII

۳۶۔ Grierson 1915 LSI 801-Intronote

۳۷۔ Colin P. Masica: The new liguisitc Environment p.p. 41-42

۳۸۔ David Crystal: *An Encyclopaedic Dictionary of Language & Languages*, p.52, Hudders Field 1992.

۳۹۔ Anatole V. Lyovin: *An Introduction to the Languages of the World,pp.125-126,* Oxford University Press. New York. Oxford.1997.

۴۰۔ پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد ”اسرائیل میں عبرانی زبان کا مقام“ مشمولہ ”اخبار اردو“، جنوری ۲۰۰۵ء، ص۲

۴۱۔ ایضاً، ص۳

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ ایضاً

۴۴۔ ایضاً، ص۴۔۵

۴۵۔ ایضاً، ص۵

۴۶۔ ایضاً، ۶

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ ایضاً، ۵

۴۹۔ ایضاً،

۵۰۔ سید خالد جامعی، استعمار کے ہاتھوں نسلوں اور زبانوں کا قتل عام، جریدہ ۳۰، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، ص۴۸ سے ۴۵ تک۔

دہشت گردی: تاریخ و تحقیق کی روشنی میں

مہذب قوموں کے ہاتھوں پونے دو ارب لوگوں کا قتل

سید خالد جامعی

زبانیں اور استعماری طاقتیں:

گزشتہ تین سو سال کی استعماری تاریخ بتاتی ہے کہ ولندیزی (Dutch)، برطانوی (Birtish)، ہسپانوی (Spanish)، اطالوی (Italian)، بلجیئن (Beligian)، تاتاری (Tatarian)، پرتگیزی (Portuguese)، روسی (Russian)، امریکی (American)، فرانسیسی (French)، المانوی [German]، اور آسٹرین [Austrian] استعمار نے دنیا میں جہاں بھی قبضے کیے وہاں نوآبادیات قائم کیں اور لوگوں کو غلام بنایا۔ یہ تمام طاقتیں Empire کہلاتی تھیں اور امپیریل ازم انہی کا تحفہ تھا جس کا تلخ ذائقہ دنیا آج بھی محسوس کرتی ہے۔ گزشتہ تین سو برس کے عرصے میں پونے دو ارب انسانوں کا قتل عام انہی استعماری طاقتوں نے کیا۔ قتل عام کرنے والی مہذب نسلیں یورپی تھیں۔ اس سے پہلے کی تاریخ میں یونانی [Greeck]، ہندی [Hindai]، ایرانی [Persian]، چینی [Chinese]، اور دیگر استعماری طاقتوں نے دنیا میں قتل و غارت گری کی وحشیانہ رسمیں عام کیں۔ [Emperialism] استعماری طاقتوں کی لوٹ مار، غنڈہ گردی، دہشت گردی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۱۴ء میں برطانوی استعمار [Birtish Emperialism] کی کل آبادی ۸ء۴۰ ملین تھی لیکن اس کی نوآبادیات کی آبادی ۳۹۰ ملین تھی اور ۲۷ ملین کلومیٹر رقبہ اس کے قبضے میں تھا۔ فرانس کی آبادی ۱۹۱۴ء میں ۶ء۳۹ ملین تھی لیکن اس کی نوآبادیات میں ۶۳ ملین لوگ محصور تھے اور رقبہ ۱۱ ملین کلومیٹر تھا۔ جرمنی کی آبادی ۶۳ ملین تھی اور نوآبادیات میں غلام نسلوں کی تعداد ۱۵ ملین تھی اور رقبہ ۵ء۲۶ ملین کلومیٹر تھا۔ اطالوی استعمار کی آبادی ۳۵ ملین تھی اور اس کی نوآبادیات کے لوگوں کی تعداد ۲ ملین تھی اور رقبہ ۲ ملین کلومیٹر تھا۔

Neo-Colonialism کے بانی روس، امریکہ اور برطانیہ کی نوآبادیات اور آزاد کردہ نوآبادیاتی

علاقوں پر ذہنی، فکری اور ثقافتی یلغار کے ذریعے دوبارہ قبضے کی تاریخ کسی اور موقع پر بیان کی جائے گی۔ عموماً لوگ فرانسیسی استعمار [Frech Emperialism] کو ایک شریف استعماری طاقت سمجھتے ہیں لیکن Alistair Home کی کتاب A Savage war of Peace: Algeria 1954-1962۔ اس شرافت کی حقیقت، خصلت، حیثیت اور ماہیت سے بخوبی آگاہ کرتی ہے۔ صرف قتل عام کوئی بات نہیں۔ استعمار نے جس وحشیانہ طریقے سے عورتوں، بوڑھوں بچوں کو قتل کیا جس طرح دہشت گردی کا ارتکاب کیا گیا۔ سترہویں صدی سے پہلے ایسی سفاکی کی مثالیں چینی اور تاتاری علاقوں کے سوا بہت کم ملیں گی۔ امریکا اور آسٹریلیا کے اصل باشندوں کو وحشی قرار دے کر قتل کر دیا گیا اور ان کی زبانیں مٹا دی گئیں۔ جہاں زبانیں نہیں مٹائی جا سکیں وہاں ثقافتی استعماریت کے ذریعے زبانوں کے رسم الخط کو تبدیل کیا گیا تا کہ ان نوآبادیات کو ان کے عظیم الشان تاریخی ورثے سے محروم کر دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں جب یہ نوآبادیات اپنے تاریخی ورثے کو پڑھنے کے قابل نہ رہیں تو ان کے تاریخی آثار و عجائبات وہاں سے منتقل کر کے ماضی کے اس ورثے سے قائم ایک جذباتی تعلق کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر کے ان نوآبادیات کے لوگوں کے لیے ان کی تاریخ کو اجنبی بنا دیا گیا۔ استعماری طاقتوں کے ہاتھوں زبانوں کے قتل عام کی داستان ابھی تک کئی پردوں میں مستور ہے۔ ذیل میں ہم چند پردے ہٹا کر حقائق پیش کر رہے ہیں۔ پہلی مثال براعظم آسٹریلیا پر برطانوی قبضے کے بعد، مقامی لوگوں کا اور ان کی زبانوں کا قتل عام ہے۔

براعظم آسٹریلیا: زبانوں کا قتل عام:

ایشیا سے ملحقہ جنوب میں دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ آسٹریلیا واقع ہے جو ایک براعظم بھی ہے۔ زبانوں کے قتل عام پر مبنی علمی و تحقیقی مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ برطانوی استعمار نے نہ صرف اس براعظم کو لوٹا اور اس کے مکینوں کا قتل عام کیا بلکہ ان کی زبانوں کا بھی قتل عام کیا گیا یہ سلسلہ اس علاقے پر برطانیہ کے تسلط سے شروع ہوا اور ہزاروں زبانوں کی تباہی بربادی اور معدومی پر منتج ہوا۔

ماہرین ارضیات کے مطابق براعظم آسٹریلیا کی سرزمین دنیا کی قدیم ترین ساخت کی حامل ہے جو آج سے تقریباً ۴ ارب ۴۰ کروڑ سال سے ۵۷ کروڑ سال پہلے معرض وجود میں آئی۔

انگریزوں کی آمد سے سینکڑوں سال پہلے یہاں کے شمالی ساحلوں پر چینی اور انڈونیشیائی اقوام کا آنا جانا رہتا تھا۔ انگریزوں کی آمد یہاں ابیل تسمان سے شروع ہوتی ہے۔ ابیل تسمان نے ۱۶۴۲ اور ۱۶۴۴ میں اور جیمز کک نے ۱۷۷۰ میں اس براعظم کو تسخیر کیا لیکن کیپٹن آرتھر فلیپ نے ۱۷۸۸ میں یہاں نوآبادیات قائم کرنے کا سلسلہ حقیقی معنوں میں شروع کیا۔

جزیرہ تسمانیہ کے لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا:

براعظم آسٹریلیا کی زبانوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندوں کے خاتمے کا پہلا قدم جزیرہ تسمانیہ

میں اٹھایا گیا۔ اٹھارہویں صدی کے درمیان ہی جزیرۂ تسمانیہ کے تمام مقامی لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ آسٹریلیا کے اصل باشندوں کے خلاف امتیازی قوانین تیار کیے گئے جو ۱۹۶۰ تک روبہ عمل رہے لیکن ان قوانین کو وہاں کی انسانی حقوق کی تنظیموں کے احتجاج کے بعد ۱۹۶۰ کے عشرے میں منسوخ کرنا پڑا لیکن اس تنسیخ سے کوئنز لینڈ کو مستثنیٰ رکھا گیا۔ آسٹریلیا کی ۸ ریاستیں ہیں۔ مقامی لوگوں کی آبادی آسٹریلیا کے شمال اور شمال مشرقی حصے میں کثرت سے آباد ہے۔

آسٹریلیا کی ۲۳۵ زبانیں موت کی دہلیز پر:

آسٹریلیا کی تقریباً ۲۶۸ زبانوں میں سے ۲۳۵ زندہ ہیں اور ۳۱ مر چکی ہیں لیکن بقیہ ۲۳۵ زبانیں بھی موت کی دہلیز پر آخری سانسیں گن رہی ہیں۔ ان زبانوں میں صرف چند ہی ایسی ہوں گی جن کے بولنے والے ہزار یا ڈیڑھ ہزار کے قریب ہوں گے لیکن باقی تمام زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد تین چار یا دس بیس سے زیادہ نہیں۔

شمالی صوبہ کوئنز لینڈ:

سرکاری سرپرستی میں آسٹریلیا کے اصل مگر نہتے باشندوں کا قتل عام اور استحصال ۱۹۶۰ تک آسٹریلیا میں ہوتا رہا۔ عوامی دباؤ کے باعث حکومت نے مدارس میں داخلے اور دفاتر میں نوکری وغیرہ کے حقوق مجبوراً بحال کیے لیکن شمالی صوبہ کوئنز لینڈ کو اس عمل سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ یہ صوبہ شمال میں ہے جہاں پر آج بھی آسٹریلیا کی معدوم ہونے والی زیادہ تر زبانیں ہیں۔ ریاست وکٹوریہ میں جو جنوب مغرب میں ہے آج بھی ان مقامی لوگوں کو حق ملکیت حاصل نہیں، یہاں جن علاقوں میں یہ لوگ محصور ہیں یا محدود ہیں، ان علاقوں میں اصل باشندے زمین کی ملکیت نہیں رکھ سکتے نہ انھیں خریدنے کی اجازت ہے۔ یہ ریاست یہاں کی امیر ریاست ہے اور سفید فام نسل کے لوگ یہاں زیادہ بستے ہیں۔

قدیم باشندوں کے حقوق ۲۰۰۴ء میں معطل:

دسمبر ۲۰۰۴ء میں رائٹر (Reuters) نیوز ایجنسی نے یہ خبر دی کہ آسٹریلیا کے وزیر اعظم ہاورڈ نے مقامی لوگوں کو تحفظ دینے اور ان کی زبانوں کو بچانے کے لیے ان کے علاقوں میں رات کا کرفیو نافذ کر دیا ہے اور شراب کی فروخت ممنوع قرار دی گئی ہے۔

زبانوں کو مٹانے کے بعد تحفظ کی تحریک:

۱۹۶۰ء میں قائم آسٹریلیائی ادارہ برائے مطالعات باشندگان اصل (Australian Institute of Aboriginal Studies) نے ان مقامی زبانوں پر تحقیق کے کام کا آغاز کیا۔ یہ ادارہ دارالحکومت کینبرا میں ہے۔ یہ ادارہ وقتاً فوقتاً زبانوں کے بچاؤ کے لیے کام کرتا ہے جن میں مختلف زبانوں کو محفوظ کرنا، ان کے نغموں اور لوریوں کو صوتی انداز میں ریکارڈ کرنا وغیرہ شامل ہے۔ دو صدیوں تک زبانوں کا قتل عام کرنے کے بعد ان کی

حفاظت کا انوکھا اور اچھوتا خیال جدیدیت اور انسانیت کی عجیب و غریب شکل ہے۔ پہلے باشندوں کو قتل کیا گیا جو بچ گئے ان کی زبانوں کو مٹایا گیا اور اب عالمی انسانی و تہذیبی ورثے کے تحفظ کے نام پر زبانوں کی حفاظت کے منصوبوں کے ذریعے اپنی انسانیت کے گن گائے جا رہے ہیں۔

آسٹریلیا کی تمام زبانیں ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کافی حد تک مشابہ ہیں۔ ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ آج سے ۵ ہزار سال پہلے یہ تمام زبانیں ایک بڑی زبان تھی۔ ان تمام زبانوں کے لسانی و ثقافتی روابط انڈونیشیائی اور پاپوا نئی گنی (Papua New Guinea) کی زبانوں سے بھی ملتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان دونوں ممالک میں تو یہ زبانیں خوب پھل پھول رہی ہیں لیکن آسٹریلیا میں انھیں تہس نہس کر دیا گیا ہے۔

مٹنے والی زبانوں کی فہرست:

ذیل میں آسٹریلیا کی ایسی زبانوں کے نام دیے جا رہے ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد صرف چند نفوس ہے اور اس مضمون کی اشاعت تک ان میں سے کتنی ہی زبانیں معدوم ہو چکی ہوں گی:

۱۔ ادینیا ماتھن ہا (Adynyamathanha): یہ زبان آسٹریلیا کے جنوب میں بولی جاتی تھی اب وہاں اس کے بولنے والے صرف ۲۰ ہیں۔

۲۔ امی (Ami) اس کے بولنے والے ۳۰ ہیں اور یہ شمال میں ڈارون میں بستے ہیں۔

۳۔ الاوا (Alawa): شمالی علاقے میں بولی جاتی ہے اور بولنے والوں کی تعداد ۱۷ سے ۲۰ تک ہے۔

۴۔ ارابانا (Arabana): سن ۱۹۸۱ میں اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۸ تھی اور یہ لوگ جنوب میں برڈزول جھیل آئری (Lake Eyre) کے مغربی حصے میں بستے ہیں۔

۵۔ النگتھ (Alngith): آسٹریلیا کے شمال مشرق علاقے جزیرہ نما کیپ یارک میں اس کے بولنے والے اب صرف ۳ کی تعداد میں ہیں۔

۶۔ اندے گیرے بن ہا (Andegerebinha): بولنے والوں کی تعداد ۱۰ یا اس سے کم ہے۔ شمالی علاقے میں بولی جاتی ہے۔

۷۔ انتا کارن یا (Antakarinya) جنوبی آسٹریلیا کے شمال مشرق میں یہ لوگ بستے ہیں اور ان کی تعداد ۵۰ کے قریب ہے۔

۸۔ امارگ (Amarag): شمالی علاقہ میں صرف چند بولنے والے ہیں یہ زبان فوری معدوم ہونے والی ہے۔

۹۔ اریبا (Areba): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۱۲ ہے جو شمال مشرق میں کوئنز لینڈ کے جزیرہ نما کیپ یارک میں بستے ہیں۔

۱۰۔ اتمپایا(Atampaya):۴۰، ایلی یٹ کریک(Eliot Creek) کوئنز لینڈ۔

۱۱۔ ایابادھو(Ayabadhu):بولنے والوں کی تعداد ۶ ہے اور یہ لوگ بھی شمالی آسٹریلیا میں جزیرہ نما کیپ یارک کی دریائے کول مین(Coleman) کے شمال میں بستے ہیں۔

۱۲۔ باڈی(Baadi):۲۰، اس زبان کو تحفظ دینے کی غرض سے محصور کیا گیا ہے اور ان کا علاقہ مغربی کمبرلی ریجن Western Kimberley Region مغربی آسٹریلیا میں ہے۔

۱۳۔ بڈی مایا(Badimaya):تقریباً معدوم ہو رہی ہے بولنے والوں کی تعداد ۱ یا ۲ ہے اور یہ مغربی آسٹریلیا میں بستے ہیں۔

۱۴۔ بنجالنگ(Bandjalang)زبان بولنے والے صرف دس ہیں اور علاقہ وڈین بونگ (Woodenbong) نیو ساؤتھ ویلز میں رہتے ہیں۔

۱۵۔ بنجی گلی(Bandjigali):۱، شمالی وہائٹ کلف(White Cliffs)نیو ساؤتھ ویلز۔

۱۶۔ بیرو پوائنٹ(Barrow Point)صرف ایک بولنے والا، کیپ یارک کوئنز لینڈ شمالی آسٹریلیا۔

۱۷۔ بایونگو(Bayungu):۶، ویسٹ ہابا ما کی لینڈن اور مینیلیا دریاؤں کے درمیان، مغربی آسٹریلیا میں یہ لوگ بستے ہیں۔

۱۸۔ بیدیارا(Bidyara):۲۰، کوئنز لینڈ کے تامبو اور اوگانیلا کے علاقوں میں یہ زبان بولنے والے لوگ بستے ہیں۔

۱۹۔ بیری(Biri):۵، جنوب مشرقی چارٹر ٹاورز (Charter Towers) کوئنز لینڈ۔

۲۰۔ بروم پرلنگ (Broome Pearling):۴۰ کے قریب لوگ خلیج بیگل(Beagle Bay)مغربی آسٹریلیا میں بستے ہیں۔

۲۱۔ بُونابا (Bunaba):سو کے قریب لوگ یہ زبان بولتے ہیں جو فزروئے کراسنگ ایریا (Fitzroy Crossing Area)مغربی آسٹریلیا میں بستے ہیں۔

۲۲۔ بُوردونا(Burduna):۳ مغربی آسٹریلیا کی ہنری اور ماریلینڈن دریاؤں کے کنارے یہ لوگ بستے ہیں۔

۲۳۔ جامنجنگ (Djamindjung):۱،۳۰، کوئنز لینڈ، منگاتا کے مغرب میں۔

۲۴۔ جنگون (Djangun): منگاتا، کوئنز لینڈ، صرف ایک زبان بولنے والا باقی ہے۔

۲۵۔ دھرگری(Dhargari):۶ مغربی آسٹریلیا، منیلیا اور دریائے لیون کے زیریں حصے میں بستے ہیں۔

۲۶۔ جاوی(Djawi):۱، مغربی آسٹریلیا، خلیج برنس ویک (Brunswick Bay) کے کنارے۔

۲۷۔ جنبا(Djinba):۹۰ بولنے والے ارن ہیم لینڈ Arnhem Land ناردرن ٹیریٹری۔ اس زبان کا ایک اور لہجہ دابی (Dabi)۱۹۹۱ تک میں معدوم ہو چکا ہے۔

۲۸۔ جنگیلی (Djingili): ۱۰، ایلیٹ، نا ردرن ٹیریٹری۔

۲۹۔ جواِرلی (Djiwarli): اس زبان کو بولنے والا صرف ایک بوڑھا ہے، کوواگسٹسٹ، مغربی آسٹریلیا۔

۳۰۔ دِراری (Dirari): ۱، جنوبی آسٹریلیاں، جھیل آئری کے شمال میں۔

۳۱۔ دھلانجی (Dhalandji): ۲۰، مغربی آسٹریلیا میں ویسٹ پلیا را میں خلیج ایکس ماؤتھ کے کنارے بستے ہیں۔

۳۲۔ دیابوگے (Dyaabugay): ۳، کوئنز لینڈ، پورٹ ڈگلس کے سطح مرتفع پر۔

۳۳۔ ڈارلنگ/ بگونجی (Darling/ Bagundji): ۵، دریائے ڈارلنگ کے کنارے، نیو ساؤتھ ویلز۔

۳۴۔ دیابر دیابر (Dyaberdyaber): ۳، خلیج بنگل، مغربی آسٹریلیا۔

۳۵۔ دیا نگادی (Dyangadi): ۵، دریائے میک لیے، آرمی ڈیل نیو ساؤتھ ویلز۔

۳۶۔ دی ربال (Dyirbal): ۴۰، دریائے ہوبرٹ، کوئنز لینڈ

۳۷۔ دیوگن (Dyugun): ۲، بروم (Broome) مغربی آسٹریلیا۔

۳۸۔ ایرے (Erre): ۱، کوہ ہاؤشپ (Mt. Howship) نا ردرن ٹیریٹری۔

۳۹۔ فلنڈر آئی لینڈ (Flinders Island): ۳، جزیرہ نما کیپ یارک خلیج پرنس شارلٹ، کوئنز لینڈ۔

۴۰۔ گاجی راونگ (Gadjerawang): ۳، یہ لوگ دریائے وکٹوریا کے سرے پر مغربی آسٹریلیا میں بستے ہیں۔

۴۱۔ گگا ڈو (Gagadu): ۶، اوئن پلی، نا ردرن ٹیریٹری۔

۴۲۔ گمبیرا (Gambera): ۶، شمالی کمبر لینز، مغربی آسٹریلیا۔

۴۳۔ گنگ گالی دا (Ganggalida): ۵، بورک ٹاؤن (Bourke Town) کوئنز لینڈ

۴۴۔ گیا ردلت (Gayardilt): ۵۰، خلیج کارپنٹیریا، کوئنز لینڈ۔

۴۵۔ جی یگ (Giyug): ۲، ڈارون کے جنوب مغرب میں نا ردرن ٹیریٹری۔

۴۶۔ گونی یانڈی (Gooniyandi): ۱۰۰، دریائے مارگریٹ مغربی آسٹریلیا۔

۴۷۔ گوگج (Gugadj): ۱، دریائے نورمن، کوئنز لینڈ۔

۴۸۔ گوگو بدھون (Gugu Badhun): ۲، آئی نا سلے (Einasleigh) کوئنز لینڈ۔

۴۹۔ گوگو بیرا (Gugubera): ۱۵، مشن اور مچل دریاؤں کے سرے پر کوئنز لینڈ میں یہ لوگ بستے ہیں۔

۵۰۔ گوگوئی مجر (Guguyimidjir): ۳۰ لوگ یہ زبان بولتے ہیں لیکن ۲۵۰ سے ۳۰۰ کے قریب یہ زبان بولنے والے لوگ اب انگریزی بولنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہوپ ویل (Hopevale) کوئنز لینڈ

۵۱۔ گنگابولا (Gungabula): ۲، انجون (Injune) کوئنز لینڈ۔

۵۲۔ گنیا (Gunya): ۳، ویانڈرا (Wyandra) کوئنز لینڈ۔

۵۳۔ گوراگون (Guragone): ۲۰، ارن ہیم لینڈ، ناردرن ٹیریٹری۔

۵۴۔ گرجر (Gurdjar): ۳۰، دریائے نورمن کے شمال مشرقی کنارے، کوئنز لینڈ۔

۵۵۔ گوامو (Guwamu): ۱، مارانوا دریا، کوئنز لینڈ

آسٹریلیا کی مردہ زبانیں:

مندرجہ بالا زبانیں آسٹریلیا کی وہ زبانیں ہیں جو موت کے قریب ہیں اور اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہی ہیں مگر ذیل میں اس براعظم کی وہ زبانیں دی جا رہی ہیں جو اب مر چکی ہیں۔

اگوامین (Agwamin)
اوابا کال (Awabakal)
بیالی (Bayali)
تجورُرُو (Tjurruru)
ڈھرگا (Dhurga)
کری یارا (Kariyarra)
کلکوٹونگ (Kalkutung)
گنگ گولو (Gangulu)
گوگو ورا (Gugu Warra)
ملگانا (Malgana)
نگان یائے وانا (Nganyaywana)
نے رن یے ری (Narrinyeri)
ونڈارنگ (Wandarang)
وولی وولی (Wuliwuli)

اگھو تھرنگ گالو (AghuThamggalu)
بنگ گرلا (Banggarla)
پرلاتپا (Pirlatapa)
تھراول (Thurawal)
ڈیری (Dieri)
کلارکو (Kalarko)
کنگاراکانی (Kungarakany)
گورینگ گورینگ (Gureng Gureng)
لینن گی تج (Leningitij)
مے کولان (Maykulan)
نگانڈی (Ngandi)
وری ینگ گا (Wariyangga)
ووریمی (Worimi)
یالا رن نگا (Yalamnga)

یوگم بل (Yugambal)[۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲]

کیتھولک استعماریت: رونگو زبان کا خاتمہ:

بحرالکاہل کا جزائر ایسٹر (Easter Islands) جسے ولندیزی سیاح نے ۱۷۲۲ میں دریافت کیا تھا۔ اس جزیرے میں آج کل رومن رسم الخط رائج ہے لیکن ۱۸۶۴ء سے پہلے اس جزیرے کا اپنا رسم الخط تھا جسے ''رونگو رونگو'' کہا جاتا تھا۔ اس خط کو شارک مچھلی کے دانت سے لکھا جاتا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ جب ایک صفحہ یا ایک سطر پڑھ لی جاتی تو اس صفحے کا سرا گھما کر نیچے کر دیا جاتا اور اس طرح دوسری سطریں سامنے آجاتیں یعنی

اس کو پڑھنے کے لیے صفحے کو گھمایا جاتا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں جب کیتھولک عیسائی مبلغین یہاں آئے تو انھوں نے ان لکڑی کی تختیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ یہ لکڑی کی تختیاں مختلف حجم کی تھیں ان میں سے آج صرف ۱۵ تختیاں دستیاب ہیں ان میں سب سے بڑی تختی کا حجم ۶ فٹ ہے۔ یہ رسم الخط قدیم سندھی رسم الخط سے مشابہہ ہے۔ ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ استعماری طاقتوں کے ساتھ ساتھ مذہبی استعماریت نے بھی مختلف زبانوں کو کس طرح ختم کیا۔

ہندی استعماریت اور پالی ومقامی زبانیں:

بودھ مت کا آغاز ۶۰۰ ق م میں ہوا جو دراصل آریہ غلبہ یا (ہندومت) کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ یہ اعلان جنگ لسانی طور پر بھی سنسکرت کا مد مقابل تھا بودھ مت نے سنسکرت کو کسی حد تک اپنایا ورنہ اس کی عوامی زبان ماگدھی تھی اور پالی زبان ادبی حیثیت رکھتی تھی۔ چناں چہ راجا اشوک کے کتبے آج تک اس امر کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ پالی دراصل متن یا سطر کو کہتے ہیں اور یہ لفظ قطار اور حاشیے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پالی بھی سنسکرت کی طرح مختلف رسم الخطوں میں لکھی جاتی تھی۔ سب سے پہلے یہ زبان سنہالا رسم الخط میں حضرت مسیحؑ سے سو سال قبل ضبط تحریر میں لائی گئی۔

ہندومت کا احیاء ہوا تو بدھ مذہب اور پالی زبان خاک و خون کے المناک مناظر سے روشناس ہوئے۔ بدھ دھرم اور اس کی زبان کی درگت بنائی گئی۔ بودھ مت کے علماء کو قتل کر کے ان کے سروں کو اوکھلی میں کوٹا کر ہڈیوں کے سفوف کو ہوا میں اڑا دیا گیا۔ مذہب کے ساتھ زبان بھی مورد عتاب ٹھہری۔ پورے شمالی ہند کی زبانیں بھی زبردست شکست و ریخت سے دوچار ہوئیں۔ طاقت کے بل پر پالی اور دیگر زبانوں کو مٹانے اور سنسکرت کو زندہ کرنے کی بھرپور کوشش ہوئی لیکن سنسکرت عوامی زبان نہ بن سکی۔ اسلام کی پوری تاریخ اس قسم کی عصبیت تشدد وسفاکی اور بہیمت سے پاک ہے۔ ارشاد رسالت مابؐ ہے کہ ”اگر دشمن کے شر سے بچنا چاہتے ہو تو اس کی زبان سیکھ لو“ یہ حکیمانہ قول مسلمانوں میں زبانوں کو سیکھنے کا سبب بنا اور انھوں نے اس حکمت کے ذریعے دشمنوں کو اسلام کے دائرے میں داخل کر لیا اور ان کی زبانوں کو بھی اپنا بنا لیا۔ اس قید میں آنے کے بعد کوئی رہائی پر آمادہ نہ ہوا۔

نو کروڑ سرخ ہندیوں کا قتل عام:

براعظم شمالی امریکا کو یورپی مہم جوؤں نے سولہویں صدی کے اوائل میں دریافت کیا۔ کولمبس کی آمد کے وقت امریکا میں جو لوگ آباد تھے ان کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ بیس تا پینتیس ہزار سال قبل ایشیاء سے امریکا آئے تھے۔ عام طور پر ان لوگوں کو سرخ ہندی کہا جاتا ہے۔

کولمبس کی آمد کے وقت موجودہ براعظم شمالی امریکا میں ایک اندازے کے مطابق تقریباً دس کروڑ

اس پوری آبادی کی نسل کشی اور ان کی جائیداد اور زمینوں پر زبردستی قبضہ کرنا اور ان کو چھپایا تھا۔ مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of Democracy جو ہارورڈ یونیورسٹی سے شائع ہوئی ہے اس کے مطابق یورپی آبادکاروں نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران شمالی امریکا میں تقریباً نو کروڑ سرخ ہندیوں کا قتل کیا یہ قتل عام پچاس سالوں پر محیط ہے۔ اس قتل عام کے لیے ہر ممکن وسائل استعمال کیے گئے اور ہر طریقہ اپنایا گیا۔ قتل و غارت گری، آبادیوں میں بیماریوں کا پھیلانا، عورتوں کو زیادتی کا شکار بنانا وغیرہ عام بات تھی۔ دو صدیوں کی قلیل مدت ایک پورے براعظم کی آبادی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا اور ان کا براعظم ان سے لوٹ لیا گیا۔

کانٹ، مارکس، لاک، ہیوم سرخ ہندیوں کے دشمن:

شمالی اور جنوبی امریکا میں قتل عام کے اس سلسلہ کا آغاز ہسپانیوں نے کیا تھا۔ ہسپانوی مصنف "Tzvetan Todorov" اسے ”انسانی تاریخ کا عظیم ترین قتل عام“ (The greatest genocide in human history) قرار دیتا ہے۔ سولھویں صدی کے ہسپانوی پروفیسر اور ماہر الٰہیات Francisco de Vitoria نے اس قتل عام کا جواز ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

”سرخ ہندی اس قابل نہیں ہیں کہ وہ نظم و نسق قائم کر سکیں اور حکومت کو اپنے بل بوتے پر چلا سکیں وہ پاگلوں اور وحشی درندوں سے بدتر ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی غذا وحشی درندوں کی غذا سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے بلکہ ان کی بے عقلی اور بے وقوفی دوسری قوموں کے بچوں اور پاگلوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔“ مصنف Tzvetan Todorov کے مطابق پروفیسر فرانسس کا سولھویں صدی کی ہسپانوی تحریک انسانیت (پرستی) کے اساطین میں شمار ہوتا تھا۔ (One of the Pinnacles of Spanish Humanism In The Sixteenth Century) غرض پروفیسر فرانسس کے افکار کے مطابق سرخ ہندی اس قابل نہیں تھے کہ انسان کہلا سکیں اس لیے ان کا قتل عام جائز تھا۔

مسئلہ صرف پروفیسر فرانسس کا نہیں تھا، جارج واشنگٹن سرخ ہندیوں کو انسانی لباس میں بھیڑیے کہتا ہے کیوں کہ یہ لوگ انسان کہلانے کے مستحق نہیں تھے۔ مارکس کے فلسفے کے مطابق یہ لوگ People without Hisotry تھے۔ [اس لیے ان کا قتل عام جائز تھا۔]

لاک کے خیال میں:

There is no difference between a buffalo and a native American.

کانٹ کے خیال میں:

Blacks are not human they live in woods.

ہیوم نے ایک کالے کو کسی گورے سے نہایت عالمانہ گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تو اس نے حیرت کا اظہار کیا کہ کالے اتنے عقل مند بھی ہو سکتے ہیں۔

انگریز آباد کاروں کے ہاتھ قتل عام:

جب انگریزوں نے ہسپانیوں کے اس مشن کی وراثت پائی تو انھوں نے اس مشن کو ان بلندیوں تک پہنچایا کہ ہسپانیوں کا قتل عام اس کے مقابلے میں ایک معمولی چیز نظر آتا ہے۔ گو کہ اس قتل عام کو جواز دینے کے لیے جوبات کہی گئی وہ وہی تھی جو پروفیسر فرانسس کے مذکورہ بالا اقتباس سے واضح ہوتی ہے۔ جارج واشنگٹن کے مطابق سرخ ہندی انسانی لباس میں بھیڑیے ہیں۔ تہذیب کے قیام میں سد راہ ہیں اور انسانی تہذیب کی بقاء اور قیام کی خاطر ان کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔ گو کہ جواز ایک ہی تھا لیکن امریکا کے یورپی آباد کاروں نے جس درندگی اور جس مہارت کے ساتھ دو سو سال کے اندر پوری نسل کا خاتمہ کیا وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک کا تعلق درندگی سے ہے دوسری کا مہارت سے ہے۔

قصاب اسکاٹ لینڈ: لارڈ کمبرلینڈ:

جہاں تک مہارت کا تعلق ہے اس میں بھی امریکا میں آباد ہونے والے انگریز، ہسپانوی آباد کاروں سے کئی ہاتھ آگے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکا میں آباد ہونے والے انگریز آباد کاروں کو اس قسم کے قتل عام کا وسیع تجربہ تھا۔ شمالی امریکہ میں وحشی، سرخ ہندیوں کے قتل عام سے پہلے انگریز اسکاٹ لینڈ میں ”وحشی“ کیلٹک (Celtic) باشندوں کا قتل عام کر چکے تھے اور کیلٹک قتل عام کے تجربہ سے شمالی امریکا میں بھرپور فائدہ اٹھایا گیا۔ مثال کے طور پر لارڈ کمبرلینڈ (Lord Cumberland) جسے قصاب اسکاٹ لینڈ کہا جاتا تھا اور جسے اسکاٹ لینڈ میں قتل عام کا وسیع تجربہ تھا۔ بعد ازاں امریکا گیا اور اس نے اپنے تجربے کو ان نئے ”وحشیوں“ کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیا۔ درندگی اور مہارت کے اس امتزاج نے دو سو سالوں میں ایک پوری نسل کا خاتمہ اور ان کے براعظم پر مکمل قبضہ کی شکل اختیار کی جس کی نظیر ساری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ امریکی تحقیق کے تازہ اعداد و شمار کے مطابق یورپی قبضہ سے پہلے شمالی امریکا میں دس کروڑ سرخ ہندی آباد تھے۔ لیکن دو سو سال کے قتل عام کے نتیجہ میں ان کی تعداد محض بیس لاکھ رہ گئی تھی۔

کیلی فورنیا یا زبانوں کا قبرستان

مؤرخین کے مطابق صرف براعظم امریکا میں نو کروڑ ریڈ انڈین باشندوں کو وحشی قرار دے کر ہلاک کر دیا گیا اور ان کی زبانوں نوہاٹلا (Nauhatl)، یوما (Yuma)، چپوا (Chipewa)، توماہاک (Tomahawk)، موہاک (Mowhawk)، موہابے (Mojave)، نباہو (Navajo)، چوکٹا (Choctow) پیما (Pima) اور ہوپی (Hopi) وغیرہ کو فنا کر دیا گیا۔ جب نسل ہی باقی نہ رہی تو زبان کے بچے

کا کیا سوال پیدا ہوتا۔ امریکی ریاست کیلی فورنیا جہاں زبانوں کے کئی بڑے گروہ پائے جاتے تھے وہاں سفاکی اور درندگی کا ایسا مظاہرہ کیا گیا کہ تاریخ نے اس ریاست کا نام جس کا مطلب ہسپانوی زبان میں ”خوابناک سونے کی سرزمین“ تھا، زبانوں کا قبرستان (Cemetery of Languages) رکھ دیا۔ جہاں سترہ بڑے لسانی گروہوں کی دو سو کے قریب زبانیں اور بولیاں بولی جاتی تھیں وہاں آج صرف دو زبانیں باقی رہ گئی ہیں۔ یہ تاریخ ساز کارنامے ان قوموں نے انجام دیے جنھیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ دنیا میں انسانی حقوق کے سب سے بڑے علمبردار ہیں اور انسانیت کی جتنی خدمت انھوں نے انجام دی وہ خدمت کوئی اور انجام نہ دے سکا۔

سرخ ہندیوں کے قتل و غارت گری کی تحقیقی داستانیں:

براعظم امریکہ میں یورپی آباد کاروں نے اس براعظم کے اصل باشندوں سرخ ہندیوں کا قتل عام شروع کیا تو کسی قاعدے، قانون، اخلاق، اصول روایت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک قاعدہ تھا جس کی پیروی کی جاتی تھی کہ سرخ ہندیوں کو Exterminate or Banish کر دیا جائے۔ خون کے دریا بہا کر سونے کے دریا پیدا کیے گئے اس عہد کی المناک داستانوں کو تاریخ نگاروں نے محفوظ نہ رکھا کیوں کہ اس عہد کے تاریخ نگار، روشن خیال، مہذب و متمدن انسان سب اس بربریت اور لوٹ مار کو جائز سمجھتے تھے اور اس پر انھیں کوئی تاسف نہ تھا۔ ان مظالم پر نہ آسمان رویا نہ زمین کی آنکھ نم ہوئی نہ کسی کا سینہ شق ہوا، نہ کسی کا رنگ فق نہ کوئی چہرہ زرد ہوا، تاریخ کا یہ المناک خونی باب اب رفتہ رفتہ روشنی میں آرہا ہے۔ قتال و جدال کی یہ کیفیت غیظ و غضب کی آخری حدود کو چھو چکی تھی، سرخ ہندی عورتوں بچوں کے لیے بھی ان مہذب متمدن تعلیم یافتہ دنیا کی اعلیٰ ترین گوری نسل کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کا ایک شمہ بھی نہ تھا۔ سرخ ہندیوں کے وحشیانہ قتل عام کی عبرتناک داستانیں جو تین سو سال تک پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔ اب رفتہ رفتہ منظر عام پر لائی جا رہی ہیں لیکن کئی چھلنیوں سے چھان کر اس کی تفصیلات Paddison, Nichols, Nash, Stannard, Sheehan, Wallace, Hoxie, La Perousse, Phillips, Hurtado, Heizer, Brown, Churchill, Cocker, Prucha, Madsen, Rommail, Micheal Man, Glain D. Page نے نہایت تفصیل سے اپنی کتابوں میں بیان کی ہیں اس موضوع پر درج ذیل کتابوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

1. Nash, G. 1992. Red, White and Black: The Peoples of Early North America, 3rd ed. Englewood Cliffs, N.J.: Prentice Hall.
2. Stannard, D. 1992. American Holocaust: The Conquest of the New World. New York: Oxford University Press.
3. Sheehan, B. 1973. Seeds of Extinction: Jeffersonian Philanthropy and

the American Indian. Chapel Hill: University of North Carolina Press.

4. Wallace, A. 1999. Jefferson and the Indians: The Tragic Fate of the First Americans. Cambridge, Mass.: Belknap Press.

5. Hoxie, F. 1984. A Final Promise: The Campaign to Assimilate the Indians, 1880-1920. Lincoln: University of Nebraska Press.

6. La Perousse, J.-F. 1989. Monterey in 1786: Life in a California Mission: The Journals of Jean Francois de la Perousse, ed. M. Margolin. Berkeley: Heyday Books.

7. Paddison, J. 1999. A World Transformed: Firsthand Accounts of California Before the Gold Rush. Berkeley, Calif.: Heyday Books.

8. Nichols, D. 1978. Lincoln and the Indians: Civil War Policy and Politics. Columbia: University of Missouri Press.

9. Phillips, G. 1975. Chiefs and Challengers: Indian Resistance and Cooperation in Southern California. Berkeley & Los Angeles: University of California Press.

10. Hurtado, A. 1988. Indian Survival on the California Frontier. New Haven, Conn.: Yale University Press.

11. Heizer, R. 1993. The Destruction of California Indians. A Collection of Documents. Lincoln: University of Nebraska Press.

12. Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.

13. Churchill, Ward. 1997. A Little Matter of Genocide: Holocaust and Denial in the Americas, 1492 to the Present. San Francisco: City Light Books.

14. Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. London: Jonathan Cape.

15. Prucha, F. 1994. "Andrew Jackson's Indian Policy: A Reassessment," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.

16. Madsen, B. 1994. "Mormons, Forty-Niners, and the Invasion of Shoshone Country," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.

17. J. M. Gran The origions of war 2 vols Groningen: Origin Press 1995.

18. Glen D Paige Nonkilling Global Political Science Philadelphia: X Libris Corporation 2002.

19. Allen D. Grimshaw "Encyclopedia of violence, peace conflict 3 volumes N. Y. Academic Press 1999.

20 Chles W. Kegley and Wiltt Kopfe World politics: Trend & Transformation 6th London Macmillan Press LTD 2000.

21. JACK Porter Genocide and Human rights: A Global Anthology Lanham, Maryland, University Press of America 1982.

22. Chalk F. & K. J. The History and Sociology of Genocide, New Haven 1990.

23. Chany I. W. [Ede] Encyclopedia of Genocide Vol. 1 - 2 Santa Barbara California 1999.

24. Horowitz, I.L Taking lives: Genocide and State Power New Brunswick, New Jersy 1997.

25. Kupuer, L. Genocide, Its political use in the Twentieth Century New Haven 1981

براعظم امریکا کی آبادی افریقہ اور یورپ سے زیادہ تھی:

Non Killing Global Political Science کے مقدمہ نگار ڈاکٹر سکندر مہدی کے مطابق: قبل از قتل عظیم [Mega Murder] براعظم امریکہ کی مقامی آبادی اس وقت کی افریقہ اور یورپ کی

مجموعی آبادی کے مقابلے میں زیادہ بڑی تھی۔ امریکہ کے قدیم باشندوں میں سے ۸۰ لاکھ افراد براہ راست جنگ میں موت کا شکار ہوئے یا پھر جنگ اور تشدد سے تعلق رکھنے والے امراض اور شکست کے باعث موت سے ہم کنار ہوئے۔

اسی لاکھ سرخ ہندی اکیس سال میں ہلاک کیے گئے:

سکندر مہدی کی تحقیقات کے مطابق یہ ۸۰ لاکھ سرخ ہندی کولمبس کے امریکہ پہنچنے کے صرف اکیس سال کے اندر ہلاک ہوئے، صرف دو عشروں میں اتنے بڑے پیمانے پر امریکہ کے اصل باشندوں کا قتل عام اس بہیمیت کا منظر نامہ پیش کرتا ہے جو عیسائیت سے انحراف اور مغربی فکر و فلسفے کے فروغ کا لازمی نتیجہ تھا۔

اسٹیرڈ کے مطابق پندرہویں صدی کے اختتام پر کرۂ ارض پر دس کروڑ سے زیادہ افراد بستے تھے اور چند صدیوں کے بعد ان کی تعداد تقریباً ۵۰ لاکھ رہ گئی لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ ساڑھے نو کروڑ لوگ کہاں چلے گئے۔ مائیکل مین کی کتاب Dark Side of Democracy اس موضوع پر ہلکی سی روشنی ڈالتی ہے لیکن یہ روشنی بھی بہت دھندلی ہے اس کے مطابق براعظم امریکہ میں نو کروڑ سرخ ہندیوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ جب کہ سکندر مہدی، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری اور علی محمد رضوی مقتول سرخ ہندیوں کی تعداد صرف اسی لاکھ یا ایک کروڑ بیان کرتے ہیں لیکن مائیکل مین کی تحقیقات نے تاریخی گرد و غبار کو صاف کر کے سرخ ہندیوں کے قتل عام کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔

Encyclopaedia of Violence Peace and Conflict Vol.II میں Genocide and Democide کے موضوع پر تحقیقات میں ثابت کیا گیا ہے کہ بیسویں صدی سے قبل معلوم تاریخ کے ایک ہزار برسوں میں ایک کروڑ سے زیادہ افراد قتل کیے گئے جن میں ۲۲۱ قبل مسیح اور ۱۹ویں صدی کے اختتام کے مابین تین کروڑ چالیس ہزار افراد ہلاک کیے گئے۔ افریقیوں کو غلام بنانے کے نتیجے میں ایک کروڑ ۷۰ لاکھ افراد قتل ہوئے۔

یورپی باشندوں کی آمد سے لے کر ۱۹ویں صدی کے اختتام تک نصف مغربی کرہ میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ افراد قتل کیے گئے۔ اس طرح یہ چار قتل عام تقریباً دس کروڑ افراد کا احاطہ کرتے ہیں۔ [انسائیکلوپیڈیا آف وائلنس، پیس کنفلکٹ تین حصے اکیڈمک پریس، ص ۶۰، ۱۹۹۹ء]

تقابل: ہٹلر کے مقتولین اور براعظم امریکہ کے مقتولین:

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ایک ہزار سال کی تاریخ میں جتنے لوگ ہلاک اور قتل کیے گئے اس سے زیادہ تعداد امریکہ کے یورپی آبادکاروں کے ہاتھوں صرف ایک صدی میں قتل کر دی گئی۔ ایک ہزار سال میں ۶ کروڑ لوگوں کا قتل عام لیکن صرف ایک صدی میں دنیا کے مہذب ترین انسانوں کے ہاتھوں جو نئی روشنی ہنشاۃ ثانیہ، تحریک

تنویر، رومانی تحریک، عقلیت، علم، بنیادی حقوق، لبرل ازم، انسانیت، آزادی اور انسان کی خدائی کے دعوے لے کر اٹھے تھے ان کے ہاتھوں صرف ایک صدی میں نو کروڑ سرخ ہندیوں کے نشیمنوں پر بجلیوں کا کارواں گزر گیا اور دنیا خاموش رہی۔ اعداد و شمار کی جادوگری بھی عجیب ہے۔ براعظم امریکہ میں سرخ ہندیوں کے قتل عام کی تاریخ معلوم کرنے اور اس سلسلے میں اعداد و شمار جمع کرنے کے لیے انٹرنیٹ پر ۲۶ ہزار ویب سائٹس کا مطالعہ کیا گیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ چند ویب سائٹس کے سوا بیشتر سائٹس اس قتل عام کے بارے میں خاموش ہیں اور جن سائٹس پر معلومات مہیا کی گئی ہیں وہ ادھوری، ناقص، نامکمل، محرف، اور نہایت مختصر ہیں اس کے برعکس ہر ویب سائٹ ہٹلر اور زٹکوں کے مظالم کی عجیب و غریب کہانیاں سناتی ہے جب کہ ہٹلر اور زٹکوں نے مجموعی طور پر اتنے لوگوں کا قتل عام نہیں کیا جس قدر قتل عام امریکہ کے اصل باشندوں کا تہذیب جدید کے معماروں نے کیا۔

براعظم امریکہ کے اصل باشندوں کو لوٹنے، برباد کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے اس کی ہلکی سی جھلک مائیکل مین کے درج ذیل بیان میں دیکھی جا سکتی ہے۔

They needed labor, but their early attempts to capture and tie Indians to dependent labor failed. These hunter-gatherers wasted the land; they did not improve it, they were idle. From John Locke to contemporary Israelis dispossessing Palestinians, Europeans have argued that those who work and improve the land are entitled to it. The New World was thus vacuum domicilium or terra nullius, an "empty" home or land, the bounty of God to civilized peoples. They made lesser attempts to employ the natives, convert them to Christianity, intermarry with them, or culturally assimilate them.

Like the frying of Indian men, women, and children in villages they had torched - as "God laughing at his enemies" [page No.84]

یورپی آبادکاروں نے ان معصوم سرخ ہندیوں کو کس طرح تباہ و برباد کیا اس کی ایک جھلک مائیکل مین کے مطابق:

The Indians' environment became degraded and they died, even without wars. The settlers had the political and military power to achieve these dire ends without much risk to themselves. There were forcible mass deportations of sick and hungry natives, whose chances of survival outside their traditional lands were poor. The Indians were crowded on to smaller and smaller hunting lands and reservations. Many Europeans recognized the relentless ethnocide this involved but did nothing. [page No.85]

سرخ ہندیوں کے لیے گالی نما القابات:

یورپی آباد کار مقامی باشندوں کو جاہل، بت پرست، ملحد، پلید، ناپاک، کیڑے مکوڑے، گنوار، کتے، بھیڑیے، سانپ، سور اور بے عقل گوریلے کے نام سے پکارتے تھے۔ بھوک اور پیاس کے باعث ان باشندوں کی قوت مزاحمت ختم کر دی گئی تو ان پر بے شمار بیماریاں حملہ آور ہو گئیں جس سے یہ کیڑے مکوڑوں کی طرح مرنے لگے ان کی موت کا مہذب متمدن یورپی آباد کاروں کو کوئی دکھ تھا نہ افسوس نہ صدمہ اور نہ غم کیونکہ یہ انسان ہی نہیں تھے لہٰذا انسانیت کے زمرے سے خارج لوگوں سے ہمدردی بھی خارج از امکان تھی۔ بیماریوں کے باعث مرنے والوں کی ہلاکت پر یورپی آباد کار خوشی کا اظہار کرتے اور اسے خدا کی عظیم مہربانی اور رحمت کے نام سے یاد کرتے۔ سفاکی، درندگی، بہیمیت کی یہ کہانی مغربی مورخین و مصنفین کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

Europeans perceived an enormous difference in civilizational level between themselves and natives. The natives were illiterate, "idolatrous," "heathen," "naked," and "dirty." Before their own arrival, this had been a land "full of wild beasts and wild men," "a hideous and desolate wilderness." The settlers could distinguish between the proud bearing and military skills of the Plains Indians and the lightly clad hunter-gatherers of California, described as "beasts," "swine," "dogs," "wolves," "snakes," "pigs," "baboons," and "gorillas." But ultimately, Indians were "savages." Divine Providence was there for all to see in the form of disease. John Winthrop described the smallpox epidemic of I6I7 as God's way of "thinning out" the native population "to make room for the Puritans." William Bradford wrote, "It pleased God to visit these Indians with a great sickness and such a mortality that of a thousand, above nine and a half hundred of them died. Followers of the Lord, he said, could only give thanks to "the marvelous goodness and providence of God" (quotes from Nash, 1992: 136; Stannard, 1992: 238). Whatever they did to the natives could be justified ideologically. [Page No.85]

خدا، سائنس سرخ ہندی اور کلیسا:

کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ یورپی آبادکاروں اور سرخ ہندیوں کے درمیان افہام و تفہیم پیدا ہو جاتی، مائیکل مین اس کا جواب نفی میں دیتا ہے اور اس کا ذمہ دار خدا اور سائنس کو ٹھہراتا ہے۔

Civilization might be learned, but race was fixed. God plus science reinforced economic, military, and political power to make it difficult for Europeans and Indians to live among each other. [Page No.86]

افسوسناک بات یہ تھی کہ کلیسا جو انسانیت کا دعوے دار تھا نسل کشی کے اس عمل میں سفید فام باشندوں کا ہم خیال تھا امریکا اور آسٹریلیا میں اس کا کیا کردار رہا؟ اس کی ایک جھلک درج ذیل تحریر میں ملاحظہ کیجیے:

The various churches were much closer to the white settler communities they served. Though local priests and ministers might be more moderate than their congregations, they had little power over them. As in Australia, they played second humanitarian fiddle to missionary movements, which provided the main early pressure group for assimilating rather than eliminating natives. [Page No.87]

سرخ ہندی اجنبی ہی رہے:

سرخ ہندیوں کو اپنی تہذیب، تاریخ اور مذہب میں سمونے کی کوشش کی گئی لیکن سرخ ہندی اپنی تاریخ، روایات اور مذہب سے اتنے پیوست تھے کہ یہ تمام کوششیں ناکام ہو گئیں، روشن خیال امریکی صدور سرخ ہندیوں کو عیسائی بنانا چاہتے تھے لیکن یورپی آبادکار اپنے معاشروں میں سرخ ہندیوں کے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

Presidents Washington and Jefferson, several secretaries of war, and federal Indian agencies all worked closely with missionaries and schools in this assimilation project. They warned that any resistance would meet with certain defeat, but they did not conceive of assimilation as coercive. This was not popular with most settlers, who opposed all assimilation. [Page No.88]

سرخ ہندی یا بھیڑیے:

جن سرخ ہندیوں نے یورپی آبادکاروں کی تہذیب، تمدن، مذہب کو اختیار کر لیا وہ بھی اجنبی رہے اور

سفید فام معاشرے نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا، کیوں کہ سرخ ہندی یورپی آباد کاروں کے خیال میں بنیادی طور پر انسان کے روپ میں بھیڑیے تھے، جانوروں کی کھالوں، ہڈیوں میں ملبوس درندے تھے، جنھیں خدا نت نئی بیماریوں کے ذریعے ہلاک کر رہا تھا تا کہ سفید فام نسلوں کے ہاتھ ان کے خون سے رنگین نہ ہوں اور نسل کشی کا کام زمین کے بجائے آسمان سے قدرتی آفات کے ذریعہ ہوتا رہے۔ سفید فاموں کے اندر شمولیت کی خواہش رکھنے اور کوشش کرنے والوں کا انجام کیا ہوا؟ انھیں نہ سرخ ہندیوں کے معاشرے میں جگہ ملی نہ انھیں سفید فام اقلیت نے قبول کیا۔ یہ طبقہ بے یارومددگار ہو کر تہس نہس ہو گیا۔

Neither community was much interested in intermarriage. Prominent colonials and traders fathered children by Indian women, but they rarely legitimized them. Permanent interracial unions were commoner among frontier traders and laborers in southern colonies with a surplus of males. Mixed blood was accepted in Indian communities, but most of the few Indians or half-breeds who tried to join white society were rejected (Nash, 1992: 280-5). Cherokees who had become private propertied planters were rejected in the 1820s, and when Cherokees acquired permanent political institutions, the State of Georgia would not accept them. It lobbied hard for the deportation of the Cherokee and achieved this in I834 (Champagne, I992: I33, I43-6).

سرخ ہندیوں کی جلاوطنی کا عمل:

سرخ ہندیوں کو اپنی تہذیب و ثقافت میں جذب کرنے، تحلیل کرنے، خلط ملط کرنے [Assimilation] کا عمل جب بری طرح ناکام ہو گیا تو سرخ ہندیوں کے تحفظ کی وکالت کرنے والے اپنے موقف سے دستبردار ہو گئے اور طے کیا گیا کہ سرخ ہندیوں کو مسس سپّی کے مغرب میں نئے قبائلی علاقوں کی طرف جلاوطن کر دیا جائے۔ ۱۸۳۰ء میں جب جلاوطنی کا یہ عمل شروع ہوا تو ہزاروں سرخ ہندی راستے میں ہلاک ہو گئے۔ ہلاکت کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان باشندوں کو دشوار گزار، خطرناک، ناہموار، غیر آباد راستوں کے ذریعے پیدل ہانک دیا گیا تھا، خطرناک جنگلات ہولناک راستوں سے گرتے پڑتے، ہزاروں معصوم لوگ عورتیں، بچے، بوڑھے بھوک پیاس کے ہاتھوں راستے میں مر کھپ گئے، میلوں تک یہ لوگ پیدل منظم مگر جبری اجتماعی نقل مکانی کے لیے چلتے رہے، منزل دشوار راستہ کٹھن نہ ابتداء کی خبر نہ انتہا معلوم، بھوک، پیاس اور افلاس نے ہزاروں کو راستے ہی میں موت کی وادی میں پہنچا دیا۔ یورپی آباد کار انھیں ہمسائے کے طور پر کسی صورت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

تہذیب انسانیت کے علمبردار اپنے سوا کسی کو انسان ماننے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ ہمسایہ تو وہی بن سکتا ہے جو ہم جنس ہو، صحبت نا جنس یورپی آبادکاروں کو گوارا نہ تھی، Hoxie کے مطابق یہ حکمت عملی طے کر لی گئی تھی کہ KILL THE INDIAN SPARE THE MAN اس حکمت عملی کی تفصیل پڑھیے:

The late I9th century eventually saw some moderation into a combination of cultural suppression and segregated assimilation, a policy sometimes known as "kill the Indian, spare the man." Indians were now assimilated as a marginalized underclass on peripheral reservations. [Page No.90]

قبولیت، عیسائیت اور سرخ ہندی:

اس دور میں بعض رحم دل لوگ بھی زندہ تھے جو سرخ ہندی وحشیوں کو انسان بنانا چاہتے تھے لیکن اسے نہایت مشکل کام سمجھتے تھے، ان کے خیال میں سرخ ہندی غیر تعلیم یافتہ، غیر متمدن، مرکزی قیادت سے مبرّیٰ وحشی نسل تھے جو اپنی بھوک مٹانے کے لیے کوئی بھی طریقہ آزما سکتے تھے۔ یہ کام بہت مشکل تھا کہ اس وحشیانہ نسل Savage Race کو ایک ایسے معاشرے میں تبدیل کر دیا جائے جو انسانیت پسند، عیسائی، تمدنی اور صنعتی اثرات کا حامل ہو، رحم دل لوگوں کی نظر میں سرخ ہندی کیا تھے اس کا اندازہ سرخ ہندیوں کے بارے میں ان کے رحم دلانہ خیالات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ یہ رحمدل لوگ جن میں Father Fremin Lasuen جیسے لوگ نمایاں تھے، سرخ ہندیوں کو زندگی کی ضمانت اس بنیاد پر دینا چاہتے تھے کہ انھیں عیسائی بنا لیا جائے اور انھیں اپنی تہذیب و ثقافت میں ضم کر لیا جائے اس کے سوا سرخ ہندیوں کی بقاء زندگی اور حفاظت کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ مائیکل مین کے مطابق:

He wanted to save the Indians through conversion and assimilation. He knew this was difficult. Indians were "without education, without government, religion, or respect for authority, and they shamelessly pursue without restraint whatever their brutal appetites suggest to them." How could he transform "a savage race... into a society that is human, Christian, civil and industrious"? "This can be accomplished only by denaturalizing them. It is easy to see what an arduous task this is, for it requires them to act against nature. But it is being done successfully by means of patience and by unrelenting effort." Indians were in a "state of nature," different from the Spanish gente de razon, people of reason. While in their state of nature, created by God, they were to be treated benignly as free men. Though savages, they could not be exploited, still less driven away or killed. [Page No.87]

عیسائیت کے مظالم سرخ ہندیوں پر:

المناک بات یہ تھی کہ عیسائیت قبول کرنے کے بعد بھی ان کی زندگی غم والم سے نشاط وطرب کی طرف لوٹنے سے قاصر تھی، جلاوطنی کا دکھ سہنے کے بعد طوعاً یا کرہاً یا بہ رضا و رغبت عیسائیت قبول کرنے کے باوجود ان کی زندگی کے شب و روز انسانوں کے شب و روز سے مختلف تھے، عیسائیت قبول کرتے ہی وہ دائمی قیدی بن جاتے تھے۔ انھیں جبری مشقت کے کاموں میں شریک ہونا پڑتا جس میں یہ جبر بھی شامل تھا کہ وہ لاطینی زبان میں طویل مناجات پڑھیں، جن کا ایک لفظ بھی وہ سمجھنے سے قاصر تھے، اگر وہ ان امور سے چھٹکارا پانے کا سوچتے اور وہ کام یا دعا سے فرار اختیار کرتے تو انھیں کوڑے مارے جاتے اور مجبور کیا جاتا کہ وہ لاطینی زبان میں مزید مناجات کا ورد کریں، صرف یہی نہیں ان جرائم کی سزا اور بھیانک تھی، کبھی زنجیروں میں جکڑے جاتے، کبھی ان کے ہونٹ گرم لوہے سے داغے جاتے، ان کے لیے فرار کے تمام راستے بند تھے کیونکہ فرار ہو کر کہاں جاتے، کوئی ان مفلوک، بے بس، درماندہ انسانوں کو پناہ دینے کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ نہایت خراب خوراک اور شدید محنت کے باعث ان کی صحت گرتی ہوئی دیوار تھی، ان کے جسم کے کھنڈرات بتاتے تھے کہ یہ عمارتیں کبھی عظیم الشان بھی رہی ہوں گی، صحت کے ان کھنڈرات پر وباؤں، بیماریوں کا زبردست حملہ جاری رہتا اور ان حملوں میں بچ جانے کا امکان برائے نام ہوتا، لاکھوں سرخ ہندی اسی طرح مرنے پر مجبور کیے گئے۔ یہ موت رحم دلوں کی طرف سے عطا کردہ رحم دلانہ موت تھی، جو قاتلوں کے خیال میں شاید اس موت سے بہتر تھی جو سنگ دلانہ طریقے پر پہلے عطا ہوتی تھی۔

But once Indians were baptized, everything changed. They were now under the authority of the order, and the order became a prison. Long hours of forced work in the fields were followed by hours of forced prayers in Latin, of which they understood not a word. Indians girls were locked up at night. If Indians showed any independence, or refused to work or pray, they were shackled and whipped and forced to recite more Latin. If they ran away, the soldiers forcibly brought them back, shackled them, and whipped them more. Sometimes they would crop off an ear or brand a lip. The Indians had difficulty escaping, since independent Indian villages would not take them in. [Page No.88]

رحم دلی کے آغاز، ارتقاء اور اختتام کی کہانی مائیکل مین نے تین سطروں میں کفنا دی ہے۔ جبر ظلم کی یہ تاریخ اس بات کی شہادت ہے کہ عیسائیت کا زوال اس وجہ سے بھی ہوا کہ وہ نسلی امتیاز کے راستے پر رواں دواں ہوگئی، آج تک کلیسا کا اسقف اعظم افریقہ کا حبشی پادری منتخب نہیں ہو سکا، پوپ پال کی نجی سپاہ جو دنیا کی مختصر ترین فوج ہے اس کے سپاہی ہمیشہ سوئٹزرلینڈ کی گوری نسل سے لیے جاتے رہے، دو سال قبل پہلی مرتبہ سپاہ مختصر میں دو کالے سپاہیوں کو بھرتی کا پروانہ عطا کیا گیا۔

The Franciscans committed local ethnocide, unintentional but devastating. Half of California's Indians died during the mission period, almost all from diseases introduced there amid a population weakened by too much coerced work and too little food. [Page No.88]

سرخ ہندیوں کی عبرت ناک اموات:

۱۸۴۸ء میں کیلی فورنیا کو ملک میکسیکو سے کاٹ کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست بنا دیا گیا جس کے نتیجے میں سرخ ہندیوں کے بالارادہ قتل میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، اس قتل عام کی سب سے بڑی وجہ جبری امراض اور بھوک سے زوال پذیر قوت مزاحمت کے باعث بیماریاں تھیں، صرف دس فی صد سرخ ہندی براہ راست قتل کیے گئے جب کہ ساٹھ سے ستر فی صد مقامی آبادی کو بھوک، قحط، نسل کشی، عورتوں مردوں کی شادیوں پر قدغن، کم شرح افزائش اور خطرناک بیماریوں کے ذریعے جو محض اتفاقی اور حادثاتی نہیں تھیں، قسطوں میں ہلاک کر دیا گیا۔ جبری غذائی قلت کا شکار یہ سرخ ہندی جو سالوں سے قوت مزاحمت کھو رہے تھے، ان بیماریوں کا خاص نشانہ تھے، اگر ان کے جسم تنومند ہوتے، انھیں پیٹ بھر کر مناسب خوراک وقت پر ملتی ان کی صحت قابل رشک ہوتی تو یقیناً یہ بیماریوں کا مقابلہ کر سکتے تھے، لیکن ان کو لاغر، کمزور، ناتواں شاید اسی لیے رکھا گیا تھا تاکہ یہ بیماریوں کے پھیلائے جال میں آسانی سے لقمہ اجل بن سکیں اور ان کی موت کا ذمہ دار گردش سماں کو ٹھہرایا جائے اور قاتل ہر الزام سے بری ہو جائیں۔ بیماریوں، وبائی امراض سے بچاؤ کے لیے حکمران طبقات اور یورپی آبادکاروں نے کوئی اقدام نہیں کیا، سرخ ہندیوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا، یہ مہذبانہ قتل عام تھا، پہلے عیسائی بنایا گیا پھر بھوکا مارا گیا، پھر بیماریوں کے علاج کے لیے سہولت مہیا نہ کی گئی۔ اس کے برعکس حبشی غلاموں کو بیماریوں سے تحفظ کے لیے سفید فام یورپی آبادکاروں نے بھرپور رہنمائی کی، انھیں چیچک سے بچایا گیا کیونکہ وہ قیمتی اور کارآمد تھے، اس کے برعکس سرخ ہندیوں کو مرنے دیا گیا بلکہ حبشیوں کے اتارے ہوئے کمبل سرخ ہندیوں کو دیے گئے تاکہ وہ چیچک سے مر جائیں۔ مائیکل مین کے الفاظ میں اس المناک باب کو پڑھیے:

In California the interlinked categories of disease, malnutrition, and starvation killed somewhere around 60-80 percent of natives, direct killing about 10 percent, with most of the remainder attributable to reproductive failure. Deliberate killings were usually in cold blood or in situations of such an imbalance of force that the appellation murder is applicable. But none of these categories are entirely separable from each other. Malnutrition, starvation, and low fertility often resulted predictably from settler policy, while diseases were not entirely accidental. Diseases spread most rapidly where malnourished natives were herded closely together, as in California missions and the many U.S. Indian reservations located on marginal lands. The settlers were not ignorant of the disease mechanisms involved, yet they rarely took steps against epidemics to which they themselves were immune. Nor were they unhappy with the results. Nash (1992: 300-1) compares the white responses to the spread of disease among Indians and black slaves. Since slaves were valuable, the white community tried to combat epidemics among them. Slaves were inoculated against smallpox. Indians were not. Indeed, some settlers fomented disease. Reports of donations of disease-ridden blankets to Indians have become notorious, though rare. [Page No.89]

کیلی فورنیا: سرخ ہندیوں کا قبرستان

کیلی فورنیا میں سرخ ہندیوں پر گزرنے والی شب ستم، آنسوؤں اور لہو سے تحریر کرنے کے قابل ہے۔ ان انسانوں کو براہ راست قتل کرنے کے بجائے قسطوں میں موت کشید کرنے کے لیے کیسے کیسے طریقے اور تجربے کیے گئے اس کا تصور کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ سرخ ہندیوں کی عورتوں کو مردوں سے الگ کردیا گیا تا کہ نسل میں اضافہ نہ ہو اور سرخ ہندی مرد لواطت کے ذریعے جسمانی عوارض میں مبتلا ہوجائیں۔ عورتوں کو طوائف بننے پر مجبور کیا گیا اور پھر جن طوائفوں کو خطرناک جنسی بیماریاں منتقل ہوئیں انھیں جنسی خدمات انجام دینے کے لیے سرخ ہندی مردوں کے سپرد کردیا گیا تا کہ یہ بیماریاں ان میں منتقل ہوجائیں اور وہ تڑپ تڑپ کر جان دے دیں۔ سرخ ہندیوں کو شراب کا رسیا بنایا گیا تا کہ ان کی اخلاقی اقدار زوال پذیر ہوجائیں اور ان کی ہلاکتوں

میں مزید اضافہ ہو۔ یہ شراب مشنریوں اور حکومتی پابندیوں کے باوجود محنت کے عوض مہیا کی جاتی تھی۔ جنسی بیماریاں، کمزور صحت اور تولیدی صلاحیتوں کے خاتمے کا باعث بن گئیں۔ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۶۰ء تک کیلی فورنیا کی سرخ ہندی آبادی پندرہ لاکھ سے کم ہو کر صرف اکتیس ہزار رہ گئی جب کہ سفید فاموں کی آبادی ۲۵ ہزار سے بڑھ کر ساڑھے تین لاکھ ہو گئی۔ ۱۸۶۰ء میں سرخ ہندیوں کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد میں کمی کا اہم عامل مردوں اور عورتوں کی بالجبر علیحدگی تھی۔ سرخ ہندی عورتیں اپنے دشمنوں کے بچوں کو جنم دیتی تھیں لیکن انھیں اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے بچوں کو جنم دے سکیں اور اپنی نسل کو زمین و آسمان دیکھنے کے لیے دنیا میں آنے دیں نہ اپنے مردوں کے لیے راحت کا سامان بن سکیں، سرخ ہندی جنسی راحت کے لفظ سے نا آشنا ہو گئے تھے۔ ان کی زندگی بدترین زندگی تھی، انھیں محض اپنی زندگی کی بقاء کے لیے محنت کی اجازت تھی تا کہ وہ زندگی اور موت کے مابین معلق رہیں اور آقاؤں کی غلامی کا شرف حاصل کریں۔

جمہوریت اور بہیمیت کا فطری تعلق:

سرحدی علاقوں سے منتخب ہونے والے ریاستی سطح کے افسران انتہا پسندی میں سب سے آگے تھے۔ وہ زمینوں پر ناجائز قبضے اور اس پر مزاحمت کے عمل سے بچنے کے لیے زیادہ سخت حکمت عملی اختیار کرتے تھے۔ ۱۸۲۰ء اور ابتدائی ۱۸۳۰ء کے عرصے میں شمالی قانون ساز ادارے نے کامیابی سے بے دخلی کا عمل شروع کروایا اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ اس سفر کے اختتام پر سرخ ہندیوں پر کیا گزرے گی۔ سرخ ہندیوں کو بے دخل کیے جانے کے بعد ان سے خالی ہو جانے والی زمینوں کی امداد اور محصولات سے حاصل ہونے والی رقوم پر کئی مقامی سیاستدانوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ یہ جمہوری رویہ تھا، جمہوریت اور بہیمیت، وحشت و درندگی لازم و ملزوم ہیں انھیں اس بات پر یقین تھا کہ سرخ ہندیوں کی بے دخلی کے بعد ان علاقوں سے وہ دوبارہ منتخب ہو جائیں گے کیوں کہ سرخ ہندیوں کے حق میں بیانات دینے والے انتخابی عمل میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں پاتے تھے لہٰذا جمہوری عمل کا تقاضہ یہی تھا کہ اپنے حلقۂ انتخاب کی خواہش، تمنا اور آرزوؤں کی صورت گری کی جائے یہی جمہوریت کا سیاہ چہرہ ہے جو لوگوں کو مفاد کا اسیر اور حرص و حسد کا غلام بنا دیتی ہے۔

سرخ ہندیوں کو مارنے کی آزادی:

کیلی فورنیا میں صورت حال واضح تھی۔ ۱۸۵۰ء میں جب جمہوریت اپنی انتہائی جدید شکل میں موجود تھی کیلی فورنیا کے آئین میں سفید فام مردوں کے حق رائے دہی کو یقینی بنایا گیا۔ انھیں اس بات کا بھی اختیار دیا گیا کہ سرخ ہندی اپنے مخصوص علاقوں سے نکل کر کہیں پھرتے ہوئے نظر آئیں تو انھیں طاقت سے بھگا دیا جائے یا مزدور بنا لیا جائے، اس میں بچوں کی بھی تخصیص نہیں تھی۔ قانون سازی کے ذریعے آبادکاروں کی ملیشیا کو پکڑ دھکڑ کی مکمل خودمختاری دے دی گئی اور اس کے لیے ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء میں گیارہ لاکھ ڈالر ادا کیے گئے۔ سرخ ہندیوں

کے لیے مخصوص کیے گئے علاقے انتہائی چھوٹے اور بالکل بے آباد زمینوں پر تھے ان میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ مزید بے دخل کیے جانے والے سرخ ہندی سما سکیں ۔ بے دخل کیے جانے کا مطلب ان کی موت تھا اس پر قانون سازوں نے کبھی بھی تنقید نہیں کی ۔

سرخ ہندیوں کے خلاف، ان کے خاتمے تک جنگ کا اعلان:

گورنر برنٹ Burnett کو اس وقت مشکل صورتحال کا سامنا کرنا پڑا جب اس نے بعض تحفظات کی وجہ سے سرخ ہندیوں کے ساتھ مصالحت سے انکار کردیا اس کے بعد سرخ ہندیوں کے لیے خطرات بڑھنے لگے اور یہ تنازع نسل کشی تک پہنچ گیا ۔ سرخ ہندی زمینوں پر سفید فاموں کا قبضہ اور اس کے جواب میں سرخ ہندیوں کی مزاحمت کی وجہ سے وہ سرخ ہندی جو اب تک منتشر تھے جنگی سربراہوں کے زیر اثر منظم ہونے لگے تھے ۔

[Phillips, G. 1975. Chiefs and Challengers: Indian (Phillip 1975- Chp3-5) Resistance and Cooperation in Southern California. Berkeley & Los Angeles: University of California Press.]

Burnett نے قتل عام کا اعلان کیا اور کہا Not to conciliate but to escalate to genocide برنٹ نے اعلان کردیا کہ:

A war of extermination will continue to be waged between the two races until the indian becomes extinct.

"دو مختلف نسلوں کے درمیان جنگ سرخ ہندیوں کے مکمل خاتمے تک جاری رہے گی اس کے پیش رو Mc Dougall نے اعلان کیا کہ کئی قبائل کا خاتمہ لازمی ضرورت ہے ۔ (Hurtado 1988:134-6) The war must of necessity be one of extermination to many of the tribes. [Hurtado, A. 1988. Indian Survival on the California Frontier. New Haven, Conn.: Yale University Press.]

ہٹلر اور کیلی فورنیا کے گورنروں کا تقابل:

تاریخ بتاتی ہے کہ ہٹلر نے بھی کبھی ان دو انتہاپسند گورنروں کی طرح ایسے بے باکانہ بیانات نہیں دیے وہ جانتا تھا کہ جرمن اس کو مسترد کردیں گے جبکہ ان گورنروں کو یقین تھا کہ سفید فام آبادی ان وحشیانہ. بہیمانہ بیانات کو بخوشی قبول کرے گی ۔ لہٰذا وہ سرخ ہندیوں کے خلاف زہر افشانی کرتے رہے، جبکہ ہٹلر نے ایسا نہیں کیا ۔ ان کے بعد آنے والا گورنر Birglar ان سے مختلف نہیں تھا فوج کے نام ایک خط میں اس نے سرخ ہندیوں کے بارے میں لکھا:

> the acts of these Savages are sometimes signalized by a ferocity worthy of. . . cannibals . . . They seem to cherish an instinctive hatred toward the white race, and this is a principle of their nature, which neither time nor vicissitude can impair. This principle of hatred is hereditary . . . The character and conduct of these Indians . . . [means] . . .that Whites and Indians cannot live in close proximity in peace.

”ان وحشیوں کے افعال آدم خوروں کی طرح خونخوار ہوتے ہیں وہ سفید فاموں سے اندرونی نفرت پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان کی فطرت کا مظہر ہے جسے نہ تو وقت نہ کوئی اور شے تبدیل کر سکتی ہے نفرت کا یہ اصول وراثتی ہے، سرخ ہندیوں کا یہ رویہ اور کردار اس بات مظہر ہے کہ سفید فام اور سرخ ہندی امن کے ساتھ ایک جگہ نہیں رہ سکتے“۔

سرخ ہندیوں کے خلاف نفرت کی تاریخ:

Birglar نے اپنے خط کا اختتام فوج سے اس مطالبے پر کیا کہ وہ چاروں علاقوں [countries] سے تمام سرخ ہندیوں کو نکال باہر کرے۔ کہاں؟ اس بات کا جواب اس نے نہیں دیا اس کام کے لیے اس نے کیلی فورنیا کی ملیشیا کی خدمات پیش کیں۔ (Heizer; 1993:189-91) [Heizer, R. 1993. The Destruction of California Indians. A Collection of Documents. Lincoln: University of Nebraska]

تمام سرحدی ریاستوں کے سیاست دان، آباد کار اور اخبارات اسی قسم کے متشددانہ جذبات رکھتے تھے اور اسی طرز عمل کے زبردست حامی تھے۔ اس قسم کے جذبات کا اظہار Minnesota کے گورنر Ramsey نے کیا اس نے اعلان کیا:

سرخ ہندی: ”شہر بدر کردو یا ختم کردو“:

”سی اُو Sioux سرخ ہندیوں کو لازمی طور پر ختم کر دینا چاہیے یا ان کو ہمیشہ کے لیے ریاست کی سرحد سے نکال باہر کیا جائے۔“ اس زمانے کا مقبول نعرہ تھا "Exterminate or Banish" ”ختم کردو یا شہر بدر کردو“ تھا۔ جنرل سبلی جو کیلی فورنیا میں دبیز کھالوں کا تاجر تھا سرخ ہندیوں اور وفاقی حکومت دونوں کو فریب دینے کے لیے مشہور تھا اس نے سانتی سواتی قبیلے کو ختم کرنے کے لیے جنگ شروع کی اور اس میں کامیاب ہوا اس نے 770 جلاوطن کیے جانے والے سانتی قبیلے کے افراد کو سینٹ پال کی دخانی کشتی کے ذریعے بے دخل کیا سفید فام دریا کے کنارے کھڑے ان پر پتھر برساتے اور ان کے ساتھ بد سلوکی کرتے۔ (Brown 1970;50-65)

[Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.]

اخبارات کی جانب سے قتل عام کی حمایت:

ریاست کولوراڈو کا گورنر بھی اسی قسم کے نفرت انگیز، متشددانہ، غیر انسانی جذبات کا حامل تھا اس کی ریاست کے تمام اخبارات جو آزادیٔ صحافت کے علمبردار تھے اس کے نسلی اور سفلی جذبات کے طرف دار تھے اور اس کی مدح میں رطب اللسان رہتے تھے۔ Denver کے اخبارات نے اس کی تعریف کی۔ ان اخبارات نے ۱۸۶۳ء میں ظلم و جبر کی ستائیس کہانیوں میں سے ۱۰ واقعات جو سرخ ہندیوں کے قتل سے متعلق تھے، ان کی کھلم کھلا حمایت کی۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ اس زمانے کے اخبارات، سیاست دان، عدالتیں، حکومتیں، فوج، مسیحی ادارے، کلیسا اور سوادِ اعظم کی اخلاقی، ذہنی اور نفسی صورت حال کس قدر بدترین تھی۔ (Churchill 1997; 172)

[Churchill, Ward. 1997. A Little Matter of Genocide: Holocaust and Denial ۔(in the Americas, 1492 to the Present. San Francisco: City Light Books.]

چار سفید فاموں کے قتل کا بدلہ: ۱۴۴ لوگوں سے!

۱۸۷۱ء میں مویشی اور سفید گھوڑے چوری کرنے کی دو سرخ ہندی چھاپہ مار کارروائیوں کے جواب میں جس میں چار سفید فام باشندے ہلاک ہوئے Tuscon کے شہریوں کی سربراہی میں ایک ٹیم نے سرخ ہندیوں کے ایک قبیلے اپاچی کے گاؤں پر حملہ کر دیا جس کا اس چھاپہ مار کارروائی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ۱۴۴ لوگوں کو ہلاک کیا گیا جن میں مرد صرف آٹھ تھے باقی ۱۳۶ عورتیں تھیں، اکثر عورتوں کی پہلے عصمت دری کی گئی۔ مقامی اخبار Denver News نے قاتلوں کو مبارکباد دی اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مرنے والوں کی تعداد دگنی ہو سکتی تھی۔

عدالتوں میں بے انصافی کی کہانی:

مشرقی علاقے میں غضب کی اس صورت حال کو "خالصتاً قتل" قرار دیا گیا اور باغیوں کے سربراہ کو عدالت میں پیش کرنے پر دباؤ ڈالا گیا۔ عدالت میں اس کے خلاف کافی شہادتیں پیش کر دی گئیں لیکن عدالت نے ان افراد کو بری کرنے میں صرف انیس منٹ کا وقت لگایا۔ یہ اس زمانے کا انصاف تھا (Brown 1970: ۔ 1)

[Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: 202-5;cocker; 1998:220 An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.]

[Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. London: Jonathan Cape.]

عدالتیں: سرخ ہندی کی شہادت قبول نہیں

بہت ہی کم سفید فام شہری قاتلوں کے طور پر عدالت میں مجرم پائے گئے جبکہ عدالت اس مقابلے میں

مستقل مزاجی سے اس روش پر قائم رہی کہ وہ سفید فاموں کے خلاف کسی سرخ ہندی کی شہادت قبول کرنے پر تیار نہ تھی، یا اس زمانے کی مہذب عدالتیں تھیں۔ (for california, see Heizer, 1993:II-14)

[Heizer, R. 1993. The Destruction of California Indians. A Collection of Documents. Lincoln: University of Nebraska Press.]

سرخ ہندیوں کے خلاف جفرسن اور واشنگٹن کے احکامات:

اگر وفاقی حکومت اور فوج سرخ ہندیوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتی تو مشنری، آباد کار اور اخبارات اس پر خوب شور مچاتے تھے۔ سفید فاموں کے درمیان تمام اختلافات اس وقت ختم ہو جاتے جب کوئی سرخ ہندی مزاحمت کرتا یا کسی سفید فام مرد یا عورت کو قتل کر دیتا۔ Mocdoc قبیلے کے سرخ ہندیوں نے اوریگان اور کیلی فورنیا کی سرحد پر جنرل کیبی کو پکڑ کر قتل کر دیا یہ بات یورپی آباد کاروں کے قومی غم و غصے کا سبب بن گئی اور پوری آبادی میں انتقام کی آگ پھیل گئی۔ جنرل شرمان نے نہ صرف قاتلوں کے گروہ کے قتل کا مطالبہ کیا بلکہ بکھرے ہوئے تمام قبیلوں کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ امریکی فوجیوں اور سواتی لاکوتا قبیلے کے درمیان ایک جھڑپ میں ۸۰ امریکی فوجیوں کی ہلاکت پر جنرل شرمان کو اپنے اس دعوے پر عمل کا موقع مل گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ سواتی قبیلے کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے خاتمے تک ہمیں نہایت سنجیدگی اور مستقل مزاجی سے ان کے خلاف لڑنا ہوگا۔ ایک اور شخص جارج آرسٹرانگ کی موت پر اس قسم کے قومی غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہو گئی جو ۱۸۸۱ء میں تمام سواتی زمینوں پر قبضے اور ان کے مکمل ہتھیار ڈالنے پر ختم ہوئی سرخ ہندیوں کی مزاحمت کو روشن خیال صدور کے دور میں سختی سے کچلنے کے اسباب مہیا کیے گئے اور بے دخلی سے انکار پر نسل کشی کی دھمکی دی گئی۔ بیسویں صدی کے مشہور ترین صدور "تامش جیفرسن" سے "جارج واشنگٹن" تک اس معاملے میں روشن خیالی کو بالکل بھول گئے۔

جارج واشنگٹن: سرخ ہندی بھیڑیے ہیں:

جارج واشنگٹن نے اپنے جنرل کو ہدایت کی تھی کہ وہ اروکوا قبائل Iroquois پر حملہ کر دے اور 'Lay waist all settlement-that the country may not be over run but destroyed and not to listen any over tune of peace before the total ruin of their settlement is effected" "ان کی آبادیوں کو تباہ و برباد کر دیں ان کی تمام باقیات کے خاتمے تک امن کا کوئی نغمہ سننے کی ضرورت نہیں ہے"۔ اس نے سرخ ہندیوں کو بھیڑیوں سے تشبیہ دی کہ دونوں وحشی شکاری ہیں صرف شکلوں کا فرق ہے۔ Indians are wolves both being beasts of prey though they different in shape. اس نے اعلان کیا کہ تمام سرخ ہندیوں کو مسی سپی کے مغرب کی طرف دھکیل دیا جائے اور مزاحمت کرنے والوں کو

طاقت سے کچل دیا جائے۔ جیفرسن نے بھی سرخ ہندیوں کے ساتھ جنگ میں اپنا لہجہ تبدیل کر لیا۔

جیفرسن: سرخ ہندیوں کی جڑیں کاٹ دو

the root-and-branch destruction of hostile tribes or driving them beyond the Mississippi: "nothing is more desirable than total suppression of their savage insolence and cruelties"; "This then is the season for driving them off"; their "ferocious barbarities justified extermination"; "if ever we are constrained to lift the hatchet against any tribe, we shall never lay it down till that tribe is exterminated, or driven beyond the Mississippi . . .. In war, they will kill some of us; we shall destroy all of them."

جیفرسن مسلسل حکم دیتا کہ دشمن قبیلوں کی جڑیں کاٹ دو یا پھر انھیں مسسس پی کے پار دھکیل دو اس کا کہنا تھا کہ ان وحشی قبیلوں کے مکمل خاتمے کے سوا کوئی بات اہم نہیں ہے یہی ان کے نکال باہر کیے جانے کا وقت ہے ان کی وحشی حرکتیں قتل عام کا جواز ہیں۔ اگر ہم ان پر ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئے تو ہم اسے ان کے مکمل خاتمے تک نیچے نہیں رکھ سکیں گے۔ جنگ کی صورت میں وہ ہمارے چند افراد کو قتل کریں گے ہم ان کے تمام افراد کو قتل کر دیں گے۔ ۱۸۱۳ء میں اس کا خیال تھا کہ کریک قبیلہ شکست کے بعد معاف کی یہ شرط قبول کر لے گا کہ وہ اپنی تمام آبادی کو مسسس پی سے باہر لے جائیں ورنہ ہم انھیں مجبور کر دیں گے۔ نہ تو جیفرسن اور نہ ہی واشنگٹن نے برطانیہ جیسے تہذیب یافتہ دشمن کے خلاف یہ زبان استعمال کی۔ جیفرسن نے سفید فاموں کے زمینوں پر قبضے کی مکمل پشت پناہی کی اس کے دور صدارت میں دو لاکھ مربع میل سرخ ہندی زمینوں پر اس کے کارندوں نے قبضہ کیا۔

جیفرسن کے خوں خوار احکامات: تحلیل، بے دخلی یا قتل

اس قبضے کے لیے جیفرسن کا فرمودہ تھا کہ وہ سرخ ہندیوں کو قرضے میں جکڑتے اور پھر اس کے بدلے وہ انھیں اپنی زیر ملکیت زمین بیچنے پر راضی کر لیتے، اس طرح سرخ ہندی اپنی آبائی شکاری زمین سے محروم ہوتے گئے۔ جیفرسن نے اپنے حکام کو حکم دے رکھا تھا:

trick the Indians into debt, forcing them to sell their lands. With inadequate land left for hunting, they would have to learn agriculture and then assimilate. If they resisted this, they must be crushed; if they merely languished and starved, that proved the inevitability of their end.

اگر وہ اس پر مزاحمت کرتے تو ان کو کچل دیا جاتا اور اگر وہ فاقہ کشی کرتے تو ان کا خاتمہ لازمی تھا۔

جیفرسن کی ترجیح Assimiation تھا اس کے بعد وہ بے دخلی Deportation کا قائل تھا اگر یہ بھی t کام ہو جائے اور مزاحمت ہو تو وہ قتل عام کا فیصلہ کرتا جیفرسن کا کہنا تھا کہ وہ ہندی نسل کی سفید فام نسل کے ساتھ برابری کا قائل ہے مگر اعلیٰ تہذیب ہمیشہ کمتر تہذیب پر غالب آتی ہے۔

he believed in the inherent racial equality of Indians (unlike blacks) with whites (Wallace, 1999: 78), but higher must triumph over lower civilizations.

اگر چہ امریکیوں کی اکثریت اس بات سے واقف ہے کہ یہ دونوں صدور واشنگٹن اور جیفرسن غلام رکھتے تھے مگر ہندیوں کے لیے ان کے غیض و غضب کی تاریخ سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

سرخ ہندیوں کے خلاف جیکسن کا اعلان جنگ:

صدر امریکہ اینڈریو جیکسن کے دور صدارت میں صرف تمام سفید فام مردوں کو ووٹ کا حق دیا گیا۔

اگر چہ وہ ہندیوں کا حامی مشہور تھا اصلاً جیکسن محض ایک عقلمند سیاست دان تھا جو کہ شمالی ریاستوں کے دباؤ پر بے دخلی کی قانون سازی پر راضی ہو گیا اور سفید فام اور نا جائز قابضین کے خلاف ہندیوں کے دفاع کے حق میں تھا مگر اس کا خیال تھا کہ بے دخلی سرخ ہندیوں کی حفاظت کا واحد حل ہے۔ (Prucha 1994) [Prucha, F. 1994. "Andrew Jackson's Indian Policy: A Reassessment," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.] یہ دراصل ایک نقاب تھا، سرخ ہندیوں نے بے دخلی پر احتجاج کیا تو وہ غضب میں آ گیا۔ صرف ایک سفید فام عورت کو کریک قبیلے کے افراد نے یرغمال بنا لیا تو اس نے انتہائی اشتعال اور غیض و غضب کی حالت میں اعلان کیا کہ ''میں ان کے قصبوں میں گھس کر یرغمال اور اغوا کرنے والے دونوں کو برآمد کر لوں گا اور مجھے اس بات میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ میں ان کے دیہاتوں کو برباد کر دوں ان کے گھروں کو آگ لگا دوں ان کے جنگجوؤں کو ختم کر دوں، ان کی بیویوں اور بچوں پر قبضہ کر لوں، جب تک کہ یہ ہتھیار نہ ڈال دیں''۔

"I shall penetrate the Creek Towns, until the Captive, with her Captors are delivered up, and think myself justifiable in laying waste their villages, burning their houses, killing their warriors and leading into captivity their wives and children, untill I do obtain a surrender of the Captive, and the Captors." Prucha (p. 212)

جیکسن کے زہریلے ارشادات: سرخ ہندی بھیڑیے

ایک اور موقع پر جیکسن نے سرخ ہندیوں کو ''دھوکہ باز'' اور اذیت پسند'' کا طعنہ دیا اس نے اعلان کیا

کر "ہمارے مقتولین کا سر حفاظت سے رکھا ہے۔ وہ یہ کہتا تھا کہ ہندیوں سے ڈرنا ان سے محبت کرنے سے بہتر ہے۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ سرخ ہندی بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کر دیں۔ ایسا نہ کرنا بھیڑیے کو جھولے میں کھلانے کے مترادف ہوگا یہ جانے بغیر کہ وہ کب بھیڑیا بن کر کچھار میں جا پہنچے۔

"the blood of our murdered countrymen must be revenged. The banditt ought to be swept from the face of the earth." He boasted, "I have on all occasions preserved the scalps of my killed." In principle he believed that "fear is better than love with an Indian." He urged his soldiers to kill women and children. Not to do so would be like pursuing "a wolf in the hammocks without knowing first where her den and whelps were."

اس کے ان بیانات نے اس کے لیے صدارت کی راہ ہموار کی۔ اس نے اپنے دور صدارت میں ہندیوں سے معاہدے کو توڑ ڈالا اور سرخ ہندیوں کی جبری بے دخلی کا عمل شروع کر دیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کا ۱۸۳۰ء کا Removal Act رحم دلانہ تھا۔ جبکہ اس کے نتیجے میں مشہور ٹرائل آف ٹیرز (Trial of Tears) میں کریک قبیلے کے دس ہزار، چیروکی قبیلے کے چار ہزار اور چاکٹا قبیلے کے چار ہزار باشندے ہلاک کیے گئے۔

سرخ ہندیوں کے خلاف لنکن کی مہم جوئی:

سرخ ہندیوں کے معاملے میں لنکن کی بہت زیادہ شمولیت نہیں رہی۔ نوجوان سیاستدان کی حیثیت سے اس نے ہندیوں کے مخالف جنگجو تاثر قائم کرنے کے لیے Black Hawk جنگ میں اپنا عسکری تجربہ استعمال کیا۔ اس نے zenchery Taylor کی وحشیوں کے عسکری استحصال اور winfield scot کے چیروکی قبیلے کی بے دخلی کے اقدامات کی تعریف کی۔ اس کے دور میں ہندی ایک جزوی مسئلہ تھے۔ صرف ایک دفعہ سے سرخ ہندیوں کے خلاف ہولناک بڑا فیصلہ کرنے کی ضرورت پیش آئی جب اس نے Minnesota میں عسکری حملے اور ہندی زمینوں پر قبضے کا حکم جاری کیا۔ اس فیصلے کی وجہ سے ۱۸۶۲ء میں سواقی قبیلہ بغاوت پر مجبور ہوا جس کو فوج نے کچل دیا اور ۳۰۹ سواقی افراد کو گرفتار کر لیا۔ لنکن کو ان افراد کی پھانسی کا فیصلہ کرنا تھا۔ انسانیت پسندوں اور قتل عام کے حمایتوں کی طرف سے دلائل جاری تھے۔ مقامی افراد اور گورنر Ramsey تمام افراد کے قتل کے حامی تھے تاہم اس نے ۳۹ افراد کی پھانسی کا فیصلہ کیا جو کہ امریکی عدالت کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے جب بیک وقت کثیر تعداد میں افراد کی پھانسی کا اعلان کیا گیا۔ جبکہ سزا پانے والوں کے خلاف کافی وشافی ثبوت موجود نہیں تھے۔ لنکن کے اس فیصلے سے کوئی بھی مطمئن نہ تھا مگر وہ خوش تھا کہ وہ ایک پیچیدہ صورتحال سے نکل آیا ہے۔ گرفتار شدگان کی اکثریت جیل کی اذیتوں کی وجہ سے ہلاک ہوگئی۔ لنکن کو یقین تھا کہ سرخ ہندی اعلیٰ نسل کے مقابلے میں جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔ وہ

سرخ ہندیوں سے نفرت کرتا تھا اس نفرت کا اظہار لنکن نے ۱۸۶۳ء میں وائٹ ہاؤس میں ایک قبائلی وفد سے گفتگو کرتے ہوئے کیا۔

”پیلے چہرے والے لوگ لاتعداد اور خوشحال ہیں وہ زمین پر کاشت کاری کرتے ہیں۔ اور اپنی روٹی پیدا کر کے کھاتے ہیں اور وہ شکار کے کھیل کے بجائے زمین کی پیداوار پر انحصار کرتے ہیں۔ وہ سرخ ہندی نسل کے برخلاف ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک دوسرے کو قتل کرنا اور ایک دوسرے سے لڑنا پسند نہیں کرتی“۔

the pale-faced people are numerous and prosperous because they cultivate the earth, produce bread and depend upon the products of the earth rather than wild game for a subsistence. This is the chief reason of the difference; but there is another . . . we are not, as a race, so much disposed to fight and kill one another as our red brethren. (Nichols, 1978: 187)

لنکن کے متعصبانہ خیالات کے چند روز بعد ہی سفید فام مہذب انسانوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی لنکن کے الفاظ تاریخ نے مسترد کر دیے تھے۔ مہذب سفید فام سرخ ہندیوں کے ساتھ ساتھ اب ایک دوسرے کو بھی قتل کر رہے تھے۔ وحشی کون تھے تاریخ اس حقیقت سے نقاب الٹ رہی تھی۔ وحشت کا سفر یہیں ختم نہیں ہوا یہ سفر جاری تھا جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ جب تک کہ تمام دنیا پر اس کا تسلط قائم نہ ہو جائے۔ روزویلٹ کے خیال میں مردہ ہندی بہترین آدمی ہے:

انیسویں صدی کے اختتام پر نسل کشی کا عمل ختم ہو رہا تھا امریکہ کے پانچویں عظیم جمہوریت پسند صدر تھیوڈور روزویلٹ کو اس میں حصہ ڈالنے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی اس نے قتل عام کے بارے میں کہا کہ اس کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ ”It was ultimately beneficial as it was inevitable“ اس نے مزید کہا ”تمام جنگوں میں سب سے عظیم جنگ وہ ہے جو وحشیوں کے خلاف ہے میرے خیال میں بہترین سرخ ہندی وہ ہیں جو مر چکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ دس میں سے نو ہلاک ہو چکے ہیں۔ اور دسویں کے بارے میں مجھے کوئی جستجو نہیں ہے۔

that the noblest of all wars was one of extermination against savages. "I don't go so far as to think that the only good Indians are dead Indians, but I believe nine out of ten are, and I shouldn't like to inquire too closely into the case of the tenth."

[Sheehan, B. 1973. Seeds of Extinction: Jeffersonian Philanthropy and the American Indian. Chapel Hill: University of North Carolina Press.] [Stannard, D. 1992. American Holocaust: The Conquest of the New World. New York: Oxford University Press.] [Wallace, A. 1999. Jefferson and the Indians: The Tragic Fate of the First Americans. Cambridge, Mass.: Belknap Press.] [Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. London: Jonathan Cape.] Sheehan 1973: 206, 29, 244, Stannard (1992, 19-22, 245-6), Wallace (1997:65,235-8 and Cockor (1998: 206)

امریکی صدور کے اعلانات کا جمہوری پس منظر:

وہ جمہوریت پسند صدور جو اپنے حلقۂ انتخاب کی ضروریات سے آشنا تھے ان کے اندر شاہی نسل پسندی زیادہ نظر آتی ہے۔ تا کہ اپنے حلقۂ انتخاب کی زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کر سکیں، اپنے حلقۂ انتخاب میں مقبولیت کا جمہوریت میں صرف ایک ہی طریقہ اور ایک ہی راستہ ہے کہ رائے دہندگان کو ہرگز ناراض نہ کرو، ان کی خواہشات اور مطالبات کو پورا کرنے کے لیے اپنی جان لڑا دو یہ جمہوری عمل کا بنیادی نقص ہے اس نقص کی تلافی صرف انسانیت کے دعووں کے ذریعے ہی ممکن ہے عملاً کچھ نہیں ہو سکتا، لہٰذا جمہوری عمل میں شریک ان صدور نے جمہوریت کے تحفظ کے لیے جمہوری طریقوں کے عین مطابق ایسی حکمت عملیاں مرتب کیں جو اس عبرت ناک جبر سے بھی آگے بڑھ گئیں جو نسل کشی کے لیے اختیار کی گئیں تھیں۔ زمینوں پر قبضہ کرنے کا عمل اور سرخ ہندی مزاحمت، ان آباد کاروں کے بہیمانہ جذبات کا جواز بنا۔

مغربی فکر و فلسفے، سرمایہ دارانہ نظام، سرمایہ دارانہ شخصیت، مذہب دشمن اقدار، تصور نفس کے خود ساختہ نظریات، الوہیت انسانی کے دعووں اور آخرت کے انکار کے باعث جس خلق جدید کی تعمیر سترہویں صدی کے بعد ہوئی جس کے بارے میں فوکو نے کہا تھا کہ انسان تو اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا ہے اس انسان کے کردار اخلاق، تہذیب، شرافت، اصول، روایت اور برتاؤ کی پوری تاریخ پانچ امریکی صدور واشنگٹن، لنکن، جیفرسن، روز ویلٹ اور جیکسن کے بیانات میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مائیکل مین نے ان پانچ امریکی صدور کے بارے میں عجیب بات لکھی ہے:

How many of these presidents would be prosecuted today for genocide by an international war crime tribunal? Four I think excluding Roosevelt. [Page No.91]

نو کروڑ قتل: پچاس برس!

امریکہ میں ریاستی سطح پر امریکہ کے اصل باشندوں کے خلاف ظلم و جبر کے یہ ابواب تحریر کیے جا رہے تھے تو آبادکاروں کی سطح پر سرخ ہندیوں کے خلاف غم و غصہ، اشتعال نفرت کے جذبات بہیمیت کی انتہاء پر تھے۔

براعظم امریکہ کے اصل سرخ باشندوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے، ان کی آبائی زمینوں سے ہٹانے، ان کی نسلوں کو تباہ کرنے، انھیں برباد، تہس نہس کرنے کا یہ عمل پچاس برس میں تکمیل پذیر ہو گیا تھا۔ سرخ ہندیوں کا قتل عام کرنے کے لیے خوبصورت اصطلاحیں، دل فریب نعرے، دفاع کی حکمت عملی، اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورہ اور سرخ ہندیوں کی وحشت و بربریت کی جھوٹی کہانیاں گھڑی جاتی تھیں، اس تمام عمل میں حکومت، ریاست، عدالت، اخبارات، کلیسا سب ہم آواز تھے کسی سرخ ہندی کی بیوی سے جبری زیادتی کی جاتی یا بھوکے سرخ ہندی بھوک سے مجبور ہو کر یورپی آبادکاروں کے جانور چوری کر کے ذبح کر لیتے یا کھا پی لیتے تو قیامت گزر جاتی۔

عدالت میں کیلی فورنیا کے ایک باشندے کو لایا گیا تو اس نے بیان دیا:

I believe for every beef that has been killed by then ten or fifteen Indians have been killed.

سفید فام مہذب آبادکاروں کے ہاتھوں سرخ ہندیوں کی زندگی کتنی اذیت ناک تھی اس کی تصویر درج ذیل ہے:

It editorialized about a man called McElroy who had a deer stolen from him. He retaliated by killing an Indian man and his squaw and wounding a third. Then McElroy was murdered as Indians also retaliated. But the death of a white man brought in the California militia. They found an Indian camp, killed 9 Indian men (the rest fleeing), and then butchered its 40 defenseless women and children. This newspaper reported on another occasion that a 36-strong militia unit looking for the killers of a white man found an Indian village and killed all but 2 or 3 of its 150 inhabitants - men, women, and children. The captain of another army unit wrote proudly, "The number killed I confidently report at not less than 75 and have little doubt it extended to nearly double that number." A captain of different sensibilities criticized a Californian rancher who killed two or three Indians, believing that an Indian had stolen some of his cattle. The next day, the cattle were found. Indians then avenged their dead relatives by killing the rancher. The captain was now trying to prevent further escalation (Heizer, I993: 42-3,63-79, 84-90, 95-7, I56-7, 245, 249-50).

گھوڑے چوری کرنے پر تمام سرخ ہندی واجب القتل ہو گئے:

ریاستِ مزوری Missouri کے تین سفید فاموں کا کہنا تھا کہ وہ ہر اس سرخ ہندی کو قتل کر دیں گے جوان کے سامنے آئے۔ کیوں کہ سرخ ہندیوں، نے ان کے گھوڑے چوری کر لیے تھے۔ ایک کے جرم پر پوری نسل کو معتوب قرار دینا کسی بھی جھگڑے کا نصف سبب ہوتا تھا''۔ (Madsen, 1994:316) Madsen,B. 1994. "Mormons, Forty-Niners, and the Invasion of Shoshone Country," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.]

سرخ ہندیوں کے خلاف عسکری یلغار:

سفید فاموں کا مقصد ہندیوں کا مکمل خاتمہ تھا اور سفید فاموں میں تناؤ کی وجہ محض ہتھیاروں یا ان کے نظم وضبط کی برتری نہیں تھی بلکہ یہ اس غم و غصے کا بھی نتیجہ تھا کہ ایک کمتر، جنگلی اور بدتہذیب قوم ایک برتر قوم کے خلاف کس طرح شدید مزاحم تھی ان کی دنیا خوف، فساد اور ظلم کی وجہ سے گراوٹ کا شکار تھی جیسا کہ مختلف صدور کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سفید فاموں کی اکثریت ہندیوں کے مکمل خاتمے کی حامی تھی۔ اس سلسلے میں مزاحمت کی سب سے بڑی تحریک ۱۸۸۰ء کی سیاہ فاموں کو غلام بنانے کے خلاف ردعمل کی تحریک تھی۔ اگرچہ یہ بہت تاخیر سے شروع ہوئی مگر اس نے بہت سی جانیں بچالیں۔

قتل عام کرنے والی عسکری طاقت میں فوج اور آبادکاروں کی ملیشیا شامل تھی۔ فوج اپنے اسلحہ اور ابلاغی طاقت کے زور پر زیادہ ہندیوں کو قتل کر سکتی تھی۔ فوج کو امن قائم کرنے، سرخ ہندی چھاپہ مار کارروائیوں کو روکنے، سرخ ہندی تحاریک کو کچلنے، اور سرخ ہندیوں کو ان کے مخصوص علاقوں سے بے دخل کرنے کے کام تفویض کیے گئے تھے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے جاتے تھے۔ فوج کے منصوبے کے مطابق سرخ ہندیوں سے مذاکرات کیے جاتے تھے کہ وہ یہ جگہ چھوڑ کر اپنے لیے مخصوص کیے گئے بے آباد خطوں میں چلے جائیں، جو سرخ ہندی مذاکرات پر راضی نہیں ہوتے ان پر سخت تشدد کیا جاتا۔

سرخ ہندیوں کے خلاف بہیمانہ جذبات: قتل کر دو یا نکال دو

خانہ جنگی کے بعد فوج نے دورانِ جنگ سیکھی ہوئی عیارانہ حکمت عملی پر عمل کرنا شروع کیا اور میدانی علاقوں کے قیدیوں پر مقامی نسل کشی کا ارتکاب کرنا شروع کیا اور اپاچی اور دوسرے قبائل کا قتل عام کیا۔ شرمان عسکری چیف آف اسٹاف تھا اس نے ۱۸۶۶ء کی جنگ میں اپنی چالوں کو اس طرح بیان کیا "میرے خیال میں اگر

ہم پچاس سرخ ہندیوں کو آرکنساس اور پلیٹ کے درمیان چھوڑ دیں تو ہمیں ہر اسٹیشن، ہر سڑک، ہر ریل گاڑی کی حفاظت کرنی پڑے گی۔ پچاس شرپسند سرخ ہندیوں کے لیے تین ہزار فوجی تعینات کرنے پڑیں گے۔ اس سے بہتر ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو ان سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کو بہلا پھسلا کر بے دخل کر دیا جائے یا پھر قتل کر دیا جائے"۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

My opinion is, if fifty Indians are allowed to remain between the Arkansas and the Platte we will have to guard every stage station, every train, and all railroad working parties . . . fifty hostile Indians will checkmate three thousand soldiers, Rather get them out as soon as possible, and it makes little difference whether they be coaxed out by Indian commissioners or killed.

سرخ ہندیوں کا وحشیانہ قتل عام:

اس کا مقصد ان سرخ ہندیوں سے مقابلہ کرنا تھا جو متحرک اور چھوٹے گروہوں کی صورت میں جنگ کرنے کے ماہر تھے۔ لہٰذا ان سے اس وقت جنگ شروع کی جاتی جب وہ سردیوں کے لیے بنے ہوئے رہائشی دیہاتوں میں چلے جاتے، ان کی نقل و حرکت محدود ہو جاتی اور وہ خاص علاقوں میں محصور ہو جاتے اس وقت ان جنگجوؤں کو اپنی عورتوں، بچوں اور املاک کی حفاظت کی خاطر ایک جگہ کھڑے ہو کر مقابلہ کرنا پڑتا۔ آباد کاروں کی فوج کو یقین تھا کہ منجمد جنگ کی صورت میں قتل عام کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے اور دشمن کو زیر دست نقصان پہنچا کر اس کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ (Uttely:1994) تاہم ان کی جنگی صلاحیت ان مردوں، عورتوں اور بچوں کے خلاف براہ راست استعمال ہوتی تھی جو اپنے دیہاتوں سے بھاگنے کی کوشش کرتے اگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے تو انھیں اپنی املاک سے ہاتھ دھونا پڑتا اور ایسی جگہوں کو زندگی بسر کرنے کے لیے منتخب کرنا ہوتا جہاں زندہ رہ جانے کی امیدیں بہت کم ہوتیں اور اگر وہ فرار میں ناکام ہوتے تو انھیں ایک ساتھ ہی قتل کر دیا جاتا۔

وحشیانہ قتل عام پر ایک جنرل کا شدید احتجاج:

شرمان کے ماتحت افسر جنرل Sanbom نسل کشی کی اس حکمت عملی پر سخت برہم تھا۔ سیکریٹری داخلہ کو ایک خط میں اس نے لکھا:

> ”ہماری جیسی طاقت ور قوم کے لیے، چند خانہ بدوشوں سے ایسے حالات میں گھرے ہوئے لوگوں سے جنگ جاری رکھنا قابل شرم ہے یہ ایک ایسا عمل ہے جس نے ہمیں، ہماری آئندہ نسلوں اور پوری انسانیت کی نظروں میں ہمیشہ کے لیے گرا دیا ہے“۔

For a mighty nation like us to be carrying on a war with a few straggling nomads, under such circumstances, is a spectacle most humiliating, an injustice unparalleled, a national crime most revolting, that must, sooner or later, bring down on us or our posterity the judgement of Heaven.

مظالم پر تنقید کرنے والوں کو مسترد کر دیا گیا:

جنرل سن بورن جیسے غیرت مند جنرل بہت کم تھے تاریخ نے انھیں بھلا دیا۔ ایک جنرل کی جانب سے نہتے مظلوموں کے خلاف وحشیانہ جنگی کارروائیوں پر احتجاج کے باوجود آج تک ان جرائم پر سرخ ہندی باشندوں سے کبھی معذرت نہیں کی گئی شاید یہ تہذیب کا تقاضہ ہے۔

مگر جنرل شری دان نے خود پر تنقید کرنے والوں کی تنقید کو مسترد کرتے ہوئے انھیں ایسے "متقی کلیسائی" قرار دیا، جو ان وحشیوں کے مددگار اور ہمدرد ہیں جنھوں نے مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہے۔ اس کی وضاحت ایک ردعمل کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ شری دان کی شخصیت، ہتھیار ڈالنے والے سرخ ہندیوں کے ساتھ ایک مکالمے میں ظاہر ہوتی ہے جس میں ان کے سربراہ نے خود کو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں متعارف کراتے ہوئے کہا Tosawi, good Indian کہا تھا، جنرل شری دان نے جواب دیا "مرا ہوا سرخ ہندی ہی میری نظر میں اچھا سرخ ہندی ہے" بعد ازاں اس کے بدنام زمانہ الفاظ مشہور ہو گئے کہ:

> The only good Indian I ever saw is dead Indian"
>
> (Broown, 1970: 157-8, 170-I)
>
> [Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.]

سرخ ہندیوں کے خلاف عسکری کارروائیاں:

شری دان اور شرمان سرخ ہندیوں کے خلاف جنگ میں کمان کے سربراہ رہے اور ان کی ظالمانہ تدبیریں آباد کاروں اور سیاستدانوں میں پسندیدہ رہیں اور انھوں نے انتہائی اطمینان سے اپنے مقاصد حاصل کیے عسکری حکمت عملی کی اخلاقیات کا انحطاط قاتلانہ نسل کشی کا حصہ رہا۔

دشمن سے نفرت اس قسم کی عسکری حکمت عملی کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ اس میں دشمن کی ضروریات کی فراہمی کے ذرائع کو منقطع کر دیا جاتا ہے جو کر لڑائی نہ کرنے والے لوگ لیے انھیں فراہم کرتے ہیں یہ چالیں انیسویں صدی میں میدانی سرخ ہندیوں کے ساتھ جنگ میں استعمال کی گئیں۔ بہادر جنگجو کوئی مخصوص یونیفارم نہیں پہنتے تھے لہٰذا ہر سرخ ہندی مرد دشمن ہو سکتا تھا۔ محفوظ طریقہ یہ ہے کہ تمام سرخ ہندی مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے

علاوہ جنگی حکمت عملی کے طور پر دشمن کو ایسے مقام پر دفاع پر مجبور کر دیا جاتا جہاں مرد عورتیں اور بچے اکٹھا ہوں۔ اس قسم کی عسکری چالیں شدید ظالمانہ تھیں۔

آبادکاروں کی ملیشیا کو ریاست اور مقامی حکومتوں کی طرف سے امداد دی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے اندر نسل کشی کا جذبہ اور بھی تازہ رہتا تھا۔ یہ جنگجو جز وقتی ملازم ہوتے، اور انھیں سرخ ہندیوں کے سر کے بدلے اجرت دی جاتی تھی۔

ہر سرخ ہندی کو قتل کردو:

کرنل شونگٹن جو کولوراڈو کی تیسری ملیشیا کا کمانڈو اور سابق ضابطہ پرست وزیر تھا اس کا کہنا تھا کہ "میرا مقصد ہر اس سرخ ہندی کو قتل کرنا ہے جو میرے سامنے آئے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ چھوٹے سے اس کی مراد بچے تھے جیسا کہ وہ کہتا تھا انڈے ہی جوں بنتے ہیں۔

"kill and scalp all, little and big." "Little" meant children, for as he said, "Nits make lice."

ایک عسکری افسر سرخ ہندیوں کے ساتھ مذاکرات کا خواہش مند تھا جب اس نے شونگٹن کی ملیشیا کے بارے میں استفسار کیا تو اس کے گورنر نے جواب دیا:

> "انھیں سرخ ہندیوں کو ختم کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا اور وہ انھیں قتل کر کے ہی چھوڑیں گے"۔

سپاہی عورتوں کے اعضاء کے تمغے اٹھائے پھرتے تھے

۱۸۶۴ء میں Sand Creek میں کرنل شونگٹن نے ایسا ہی کیا اس کی فوج نے ۱۰۵ سرخ ہندی عورتوں اور بچوں اور ۲۸ مردوں کو قتل کیا اور ان کے اعضاء کاٹ ڈالے۔ اس کی فوج کے سپاہی جو تمغے اٹھائے پھر رہے تھے وہ عورتوں کی فرج [vagina] سے بنائے گئے تھے۔ یہ مہذب متمدن یورپی آبادکاروں کا حال تھا جو آج دنیا کو انسانیت اور اخلاقیات کا درس دے رہے ہیں۔ (Brown 1970:86-93 Stannard 1992-171-4) [Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.] [Stannard, D. 1992. American Holocaust: The Conquest of the New World. New York: Oxford University Press.]

قاتل اخبارات میں ہیرو کے طور پر پیش کیے جاتے:

بعض لوگوں کی کوشش تھی کہ وہ شونگٹن کو عدالت میں لائیں مگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے۔ شونگٹن ہمیشہ Denver کے اخبارات و رسائل و جرائد کا ہیرو رہا (1999:218) Wallace کا خیال ہے کہ آبادکار خود

ایک فوج بن چکے تھے جس کا غصہ ہر اس سیاستدان پر ابل پڑتا جو ان کی رائے کے خلاف جانے کی کوشش کرتا۔

[Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. 1998-187-8 London: Jonathan Cape.]

مصنف کوکر (Cocker) نے Sugarfoot Jack کی سوانح بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ بین الاقوامی سطح کا قاتل تھا اور اسے برطانیہ سے تسمانیہ کی اصل آبادی کو قتل کرنے کے لیے لے جایا گیا اس کے بعد وہ کیلی فورنیا کی ملیشیا کا رکن بنا اور آخر میں اپاچی قبیلے کے نومولود بچوں کا اذیت پسند قاتل بنا۔

اس سے پہلے کہ ہم امریکی ریاست کے سرخ ہندیوں پر مظالم کی داستان کے بعض اوراق پلٹیں ضروری ہے کہ ۱۷ویں صدی سے پہلے اور کے بعد کے معاشروں کی جنگجویانہ تصویر کی اصل حقیقت بھی آپ کے سامنے پیش کردیں۔ یہ حقیقت اعداد و شمار کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے جو کسی تفسیر تشریح کی محتاج نہیں ہے۔

براعظم امریکہ: سرخ ہندیوں کی زبانوں کا قتل عام

سرخ ہندیوں پر مظالم اور قتل عام کی داستان ۱۵ویں صدی کے اختتام سے شروع ہو کر ۱۹ویں صدی تک جاتی ہے اس کی تفصیلات شروع میں پیش کر دی گئی ہیں ظلم کی یہ سیاہ رات انیسویں صدی کے آخر میں کچھ کم ہوئی جب امریکی حکومت نے بچے کھچے اصلی امریکی باشندوں کی تعلیم و صحت کے لیے اپنے وہ دروازے کھولے جو اس سے پہلے صرف اینگلو سیکسن (Anglo-Saxon) عوام یا گوری چمڑی والوں کے لیے مخصوص تھے۔ مولانا ظفر علی خان بابائے صحافت نے غالباً یورپی آبادکاروں اور سفید فاموں کے انہی مظالم کی بنیاد پر زمیندار میں اپنے اداریوں اور تقریروں میں انھیں "گوری چمڑے والے مہذب ڈاکو" کہتے اور لکھتے تھے۔

سرخ ہندیوں کی زبانوں کا خاتمہ:

جب یورپی اقوام نے ۱۴۹۶ء میں امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو وہاں کی مقامی آبادی کو وحشی، جنگلی اور حقیر قرار دیا گیا چوں کہ ان کی زبان لکھی نہیں جاتی تھی جس کی وجہ سے ان زبانوں کو ختم کرنے میں امریکی استعمار کو زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تحریر سے محرومی کے باوجود یہ زبانیں صدیوں سے لوک کہانیوں، قصوں، نغموں اور لوریوں کے ذریعے سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہی تھیں اس طرح تصوراتی قصوں کے ذریعے ان تمام زبانوں کی انفرادیت اور خوبصورتی قائم تھی۔ اگر کسی زبان کا قصہ گو اپنے علاقے اور اپنی زبان میں مشہور ہوتا تو اسے اس خوبصورت انداز بیان کی وجہ سے دوسرے قبائل میں بھیجا جاتا تا کہ وہ اُس خاص زبان کی دلکشی سے دوسری زبان والوں کو متاثر کرے۔ لیکن ۱۴۹۶ء سے شروع ہونے والی اس بقا کی جنگ نے جس کا اختتام آج بھی نہیں ہوا ہے سرخ ہندیوں کی تمام زبانوں اور ان کی پوری تہذیب کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔

سرخ ہندی قصہ گو اور ان کی کہانیاں:

قصہ گو کہانی دلچسپ انداز سے شروع کرتے جس طرح اردو میں ہر کہانی کے آغاز سے پہلے عموماً یہ جملہ کہا جاتا ہے ’’ایک دفعہ کا ذکر ہے‘‘ اسی طرح یہ مقامی لوگ جب اپنی کہانی شروع کرتے تو ان جملوں سے عموماً کہانی کا افتتاح ہوتا ’’لوگوں کے آنے سے پہلے......‘‘ یا ’’جب کویوتے جوان تھا......‘‘۔

سرخ ہندی: ریچھوں کو نہیں مارتے تھے:

ان کی کہانیاں سادگی کا نمونہ ہوتیں اور ان میں عموماً جرأت اور بہادری کا پہلو نمایاں رہتا تھا یہ کہانیاں سبق آموز ہوتیں تھیں اور سرخ ہندیوں کی تہذیبی و تمدنی خصوصیات، الہامی روایات، مذہبی کرداروں کے احکامات بیان کرتی تھیں۔

ان کی کچھ کہانیاں مافوق الفطرت بھی ہوتی تھیں جیسا کہ ایک کہانی میں دو لڑکیاں ہر رات ستاروں کو دیکھ کر یہ خواہش کرتی تھیں کہ ان کی شادی ان ستاروں سے ہو جائے۔ ان کی یہ خواہش کسی طرح پوری ہو جاتی ہے اور اس دوران ان کے سفرِ آسمان اور وہاں زندگانی میں نئے نئے سبق آموز اور حیران کن واقعات جنم لیتے ہیں اور مزید کہانیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جن والدین کی اولاد پیدا ہوتے وقت یا بعد میں مر جاتی تو ان کی دل جوئی کے لیے بھی کہانیاں کہی جاتی تھیں جن میں ایسے والدین کے لیے نئے بچوں کی ولادت کی خوش خبری ہوتی جو ایسی طاقتوں کے حامل ہوتے جن سے مرنے والے بچے محروم تھے جنھیں بھوت پریت یا بلاؤں نے کھا لیا تھا۔

مقامی لوگ ریچھ کو کبھی نہیں مارتے تھے بلکہ انھیں جب ریچھ نظر آتا تھا وہ دعائیہ کلمات ادا کرتے تھے۔ کیوں کہ سرخ ہندی نہایت مہذب متمدن اور محبت کرنے والے لوگ تھے وہ انسان تو کیا جانوروں کو بھی مارنا پسند نہیں کرتے تھے۔

کیلی فورنیا زبانوں کا قبرستان:

مؤرخین کے مطابق صرف امریکا میں تقریباً نو کروڑ سرخ ہندی باشندوں کو وحشی قرار دے کر ہلاک کر دیا گیا اور ان کی زبانیں نوہاٹلا (Nauhuatl)، یوما (Yuma)، چپوا (Chipewa)، توماہاک (Tomahawk)، موہاک (Mowhawk)، موہابے (Mojave)، چوکٹا (Choctow)، پیما (Pima) اور ہوپی (Hopi) وغیرہ کو فنا کر دیا گیا۔ جب نسل ہی باقی نہ رہی تو زبان کے بچنے کا کیا سوال پیدا ہوتا۔ امریکی ریاست کیلی فورنیا جہاں زبانوں کے کئی بڑے گروہ پائے جاتے تھے وہاں سفاکی اور درندگی کا ایسا مظاہرہ کیا گیا کہ تاریخ نے اس ریاست کا نام جس کا مفہوم ہسپانوی زبان میں ’’خوابناک سونے کی سرزمین‘‘ تھا، زبانوں کا قبرستان (Cemetery of Languages) رکھ دیا۔ جہاں سترہ بڑے لسانی گروہوں کی دو سو کے قریب

زبانیں اور بولیاں بولی جاتی تھیں وہاں آج صرف دو زبانیں باقی رہ گئی ہیں۔ کیلی فورنیا میں ۱۷۶۹ء تک تین لاکھ ریڈ انڈین تھے، ایک سو سال کے بعد ان کی یہ تعداد بیس ہزار تک رہ گئی۔ یہاں پر ۱۸۴۸ء میں سونا دریافت ہوا جس کے بعد مقامی لوگوں کے قتل عام میں اور تیزی آ گئی تا کہ سونے کے حصہ داروں کی فہرست میں مقامی باشندوں کے نام شامل نہ کیے جا سکیں۔ یہ تاریخ ساز کارنامہ اس قوم نے انجام دیا جسے اس بات پر فخر ہے کہ وہ دنیا میں انسانی حقوق کے سب سے بڑی علمبردار ہے اور انسانیت کی جتنی خدمت اس نے انجام دی وہ خدمت کوئی اور انجام نہ دے سکا۔

سرخ ہندیوں کی دو سو تیس زبانیں: مختصر جائزہ:

ریاست ہائے متحدہ امریکا میں لسانیات کے ماہرین نے سن دو ہزار میں ۲۳۰ زبانوں کی فہرست تیار کی ہے جن میں سے ۱۶۶ مقامی زبانیں سرخ ہندی بولتے ہیں جو آج بھی بولی جا رہی ہیں۔ سرخ ہندی لوگوں کی اکاون زبانیں جو ۱۹۷۷ء تک مر چکی تھیں ان معدوم زبانوں کو شامل کر کے مقامی لوگوں کی زبانوں کی تعداد ۲۱۷ بن جاتی ہے۔ ۱۴۴ زبانوں میں سے اس مضمون میں ایسی زبانوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً ہزار ہے اور ایسی زبانوں کی تعداد ۱۳۴ ہے۔ نباخو اور چیروکی ایسی زبانیں ہیں جن کے بولنے والے ۲۲ ہزار سے زیادہ ہیں اور غالباً اب امریکا میں سرخ ہندیوں کی یہی دو بڑی زبانیں باقی رہ گئی ہیں۔ ان مقامی زبانوں کے علاوہ بقیہ ۱۳ زبانوں میں انگریزی اور ہسپانوی زبان جنھیں سرکاری اور غیر سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے شامل ہیں ان زبانوں کے علاوہ جرمن، فرانسیسی، بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔

صرف ایک ہزار سرخ ہندی قبائل باقی ہیں:

سرخ ہندیوں کے زبردست قتل عام کے باوجود آج بھی امریکہ میں ایک ہزار کے قریب قبائل باقی رہ گئے ہیں جن میں سے صرف ۵۶۲ قبائل کو حکومت کی جانب سے آبرومندانہ زندگی گزارنے کی اجازت ملی ہے لیکن ان مقامی لوگوں نے گوری اور سیاہ فام اقوام میں شادی بیاہ اور دیگر روابط استوار کر لیے ہیں اب ان کا تشخص خود بہ خود ختم ہوتا جا رہا ہے اور حکومت ایسے لوگوں کو خاص قبیلے کا فرد یا رکن ماننے سے گریز کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں امریکہ میں جینیاتی کشمکش نے ایک نیا روپ دھار لیا ہے وہاں کے لوگ اب اپنا جینیاتی تجزیہ کرا رہے ہیں تا کہ ان کا قدیم قبیلے سے تعلق ثابت ہو جائے اس سلسلے میں کئی ادارے وجود میں آ چکے ہیں جو جینیاتی تعلق کو جانچنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

سرخ ہندی: پچیس ہزار قبل مسیح سے امریکہ میں آباد تھے:

محققین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ امریکا میں مقامی لوگوں کی آبادکاری کا سراغ ۱۰ ہزار سال قدیم سے ملتا ہے لیکن کچھ سرخ ہندیوں کے بعض علاقوں میں ۲۵ ہزار سال قدیم کی انسانی آبادی کے آثار بھی کثرت سے

ملا اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ کے اصل باشندے سرخ ہندی دس ہزار قبل مسیح سے اس سرزمین پر آباد تھے جنھیں قتل و غارت گری کے ذریعے تہس نہس کر دیا گیا۔

براعظم امریکہ کے بڑے لسانی گروہ:

براعظم امریکہ میں یورپی قابضین کی آمد کے وقت کئی بڑے لسانی گروہ موجود تھے لیکن یورپی قابضین کی تاخت و تاراج کے بعد شمالی امریکا کے مشہور لسانی و ثقافتی گروہ مسکوجی ین (Muskogean)، الگون کیان (Algonkian)، کاڈوئی (Caddoan)، اروکوآئی (Iroquoian)، سی اُو (Sioux)، ہوکان (Hokan)، پینوتی ان (Penutian)، اتاپاسکان (Athapascan) اور ازٹیکا (Azteca) اقلیت کا درجہ اختیار کر گئے یہ گروہ سخت جانفشانی کے ساتھ ظلم و تشدد کا مقابلہ کرتے رہے اور آج بھی اپنے وجود کے ذریعے اپنی عظیم روایات کی نمائندگی کر رہے ہیں انھیں گروہوں کی زبانیں باقی ہیں یہ وہ بڑے لسانی خاندان ہیں جو آج شمالی امریکا میں اپنی کچھ زبانوں کے ساتھ بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

قتل عام کے بعد تحفظاتی علاقوں کا قیام:

امریکی حکومت نے بیسویں صدی کے اوائل میں ''انسانیت کے بے پناہ جذبے'' کے تحت یہ محسوس کر لیا کہ اگر ان مقامی لوگوں کے ساتھ ظالمانہ جابرانہ برتاؤ مسلسل جاری رکھا گیا تو ان کی ثقافت، زبان اور قبیلے ختم ہو جائیں گے ''انسانیت کا تقاضہ تھا'' کہ ان بچے کھچے لوگوں کو بچایا جائے اور دنیا کو بتایا جائے کہ ہم زبانوں اور ثقافتوں کے تنوع پر یقین رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں کوشاں بھی ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کو تحفظ دینے کے لیے تحفظاتی علاقوں Reserved Areas یا Reservation کی اصطلاحات شروع کی گئیں۔ یہ ایسے علاقے ہوتے ہیں جہاں ایک خاص قبیلے کے لوگوں کو ان کے قدیم رسم و رواج کے ساتھ رکھا جاتا ہے، انھیں عطیات حکومت فراہم کرتی ہے۔ یہ لوگ باہر کے علاقوں میں آمد و رفت کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں۔ ان کے علاقوں میں شراب نوشی کی ممانعت ہے۔ اس طرح کے علاقوں کے قیام کا مقصد ایک طرف تو ان سرخ ہندی لوگوں کو سفید فاموں سے ثقافتی تحفظ مہیا کرنا تھا تا کہ ماضی کے مظالم کی تاریخ کو دھندلا دیا جائے۔

سرخ ہندیوں کا اصل مرکز: اوکلاہوما:

ان علاقوں میں حکومت ان مقامی لوگوں کو روزگار کے حصول کے لیے اور زندگی کے نئے طرز اپنانے کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ ۱۹۳۰ء تک جو اعداد و شمار ملتے ہیں، اس کے مطابق امریکا کے ہر صوبے میں ان لوگوں کی آبادی تین ہزار سے شروع ہوتی تھی اور خاص خاص صوبوں کی تعداد لاکھ سے اوپر چلی جاتی ہے، خاص کر اوکلاہوما میں جب کہ دیگر صوبوں میں ان کی تعداد ۲۰ ہزار سے ۶۰ ہزار کے درمیان ہے۔

۱۹۷۵ء تک سرخ ہندیوں کی تعلیم، معیار زندگی، حالات، زبانوں، طرز زندگی کے بارے

میں امریکی حکومت کی جانب سے اعداد و شمار دستیاب نہ تھے پہلی مرتبہ ان کے حالات پر مبنی اعداد وشمار U.S. Bureau of the Census نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیے اور تمام مقامی افراد کو Hispanic کے زمرے میں رکھا جب کہ اس زمرے میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو ہسپانوی زبان بولتے ہیں اور یہ لوگ یا تو مقامی ہوتے ہیں، یا میکسیکو کے یا پھر کیوبائی (Cuban) لوگ ہوتے ہیں۔ اس طرح امریکی سرخ ہندی مقامی باشندوں سے متعلق اعداد و شمار سے واضح معلومات نہیں مل سکتیں۔

آنسوؤں کا سفر: کبھی ختم نہ ہو سکا:

انیسویں صدی کے آخر تک امریکی استعماری ریاست نے زیادہ تر قبائل اور زبانوں کو بزور شمشیر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ چیروکی (Cherokee) زبان بولنے والے اس ظلم کے دور کو (Trail of Tears) کہتے ہیں، جس میں ان لوگوں کو ان کے اپنے آبائی علاقوں سے جبراً نکال دیا گیا۔ آنسوؤں کا یہ سفر کبھی ختم نہ ہوگا خون کے گھونٹ جو پی لیے گئے جبر کی اس تاریخ کو ہچکیوں اور سسکیوں کے ذریعے یاد رکھیں گے کیوں کہ سرخ ہندیوں کی تاریخ لکھنے کی جرات کسی کو نہیں ہے مائیکل مین جیسے جری شخص نے اس خونی تاریخ کو ڈرتے ڈرتے صرف گیارہ صفحات میں تحریر کیا ہے لیکن ترکوں کے ہاتھوں ۱۸ لاکھ آرمینیائی باشندوں کے قتل پر دو ابواب تحریر کیے ہیں۔

سرخ ہندی: آہنی شخصیت کے مالک:

کالوسا (Calusa) قوم مسکوجی زبان بولتے تھے۔ ۱۵۰۰ کے ابتدائی سالوں میں ان کا بڑا ہی خون ریز مقابلہ ہسپانویوں سے رہا جس کے نتیجے میں انھوں نے ۱۵۲۱ء کے مشہور کونکیس تادور (Conquestador) پونچھ ڈی لیون (Ponce de Leon) کو قتل کر دیا۔ سیمی نولے (Seminole) زبان بولنے والوں کی امریکی استعماری طاقت سے بڑی مشہور جنگیں رہی ہیں۔ پہلی سیمی نولے جنگ ۱۸۱۷ء سے ۱۸۱۸ء تک، دوسری سیمی نولے جنگ ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۲ء تک۔ سیمی نولے غالباً ہسپانوی زبان کے لفظ Cimarron کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب ''آہنی شخصیت'' ہے۔

امریکہ کی واحد بڑی سرخ ہندی زبان: اپاچی:

نباخو (نباحو) (Navajo) ریڈ انڈین لوگوں کی کہانیاں نظریہ ہوا کرتی تھیں اور ان کا تعلق ایک اور قبیلے اپاچی (Apache) سے بہت گہرا تھا۔ یہ دونوں قبائل اتاپاسکان لسانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپاچی زبان اور قبیلہ مزید ذیلی گروہوں میں منقسم ہے۔ نباخو قبیلہ آج بھی امریکا میں ایک مضبوط قبیلہ ہے جنھوں نے اپنی کوششوں سے اپنی زبانوں کو تحفظ دیا ہے اور آج ان کی زبان امریکا میں واحد بڑی سرخ ہندی زبان کے طور پر بولی جا رہی ہے۔

اپاچی طرزبیاں ختم ہوگیا:

اپاچی قبیلے کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو کہانیاں صرف علی الصبح اور مغرب کے وقت سناتا تھا یا پھر شدید سردیوں کے موسم میں بیان کی روایت تھی۔ جی کاریہ (Jicarilla) اپاچی کی کہانیوں میں تحکمانہ انداز ہوا کرتا تھا۔ لیکن ان قبائل کو ہسپانوی استعمار نے جب عیسائیت کا لبادہ پہنایا تو ان کی زبان نے اپنی لوک کہانیاں اور طرز بیان کو ترک کر کے ہسپانوی اور انگریزی زبان اور تہذیب کو اختیار کر لیا اس طرح پوری کی پوری تہذیب وثقافت برباد ہوئی اور ایسی کہانیوں کو جان بوجھ کر فراموش کر دیا گیا جن میں قدیم مقامی مذاہب کی جھلک یا ان کے کرداروں کا منظرنامہ ہوتا تھا۔

پینوتی آئی (Penutian) زبان بولنے والے انیسویں صدی تک ۱۴۰۰۰ تھے۔ یہ لوگ کیلی فورنیا میں رہتے تھے لیکن یورپی نژاد سے روابط نے ان میں نئی نئی بیماریاں پیدا کر دیں اور معاشرتی نظام کی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔

ہوکان لسانی خاندان کی یانا (Yana) زبان بولنے والے ۱۸۶۴ء تک ختم ہو چکے تھے۔ اس زبان کا لوگوں کو علم بھی نہ ہوتا اگر اس زبان کا ایک فرد جو بھوکا اور سردی سے ٹھٹھرا پڑا تھا ۱۹۱۱ء میں اورول (Orville) کیلی فورنیا سے ملا۔ اس شخص سے اس زبان اور ثقافت کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں اور اس کی موت ۱۹۱۶ء تک اسے میوزیم میں رکھا گیا لیکن اس سے پہلے اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے اسے جیل میں بھی رکھا گیا۔

سرخ ہندی باشندے نفرت وحقارت کا نشانہ:

ان مقامی لوگوں کو بڑے ہی برے القاب بھی دیے گئے، موہاک (Mohawk) کے معنی اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری ۱۷۱۱ء کے مطابق وہ بدمعاشوں کی ایک جماعت جو راتوں کو لندن کی گلیوں میں اٹھارہویں صدی کے اوائل میں گند پھیلاتے تھے“

۱۹۰۱ء میں فرانسیسی مؤقر جریدہ لی فگارو (Le Figaro) کے صحافی ایمیلے ڈارسی (Emile Darsy) نے امریکا کی دس مقامی زبانوں اور قبائل کے ناموں کی فہرست تیار کی تاکہ انھیں فرانس میں غلیظ اور ناپسندیدہ عناصر کے لیے استعمال کیا جائے جو بدمعاشی کرتے اور افراتفری پھیلاتے ہیں۔

اس فہرست میں اپاچی کا انتخاب کیا گیا جسے پولیس کے افسر ایم لیپین (M. Lepine) نے استعمال کیا اور یہ لفظ ۱۹۲۴ء میں AcademieFrancaise نے فرانسیسی زبان میں بدمعاشی کے معنوں قبول کر لیا۔

چےروکی زبان: ۸۶ حروف تہجی:

اِروکوآ (Iroquois) قبائل تمام سرخ ہندی قبائل میں زیادہ منظم گروہ تھا صرف شمالی امریکا میں یہ پانچ اقوام پر مشتمل گروہ تھا جنھوں نے ایک ریاست قائم کی ہوئی تھی، ان کے مذہبی عقائد اور کہانیاں مستحکم بنیادوں

پر تھیں ۔ اس لسانی خاندان کی ایک زبان چے روکی (Cherokee) ایسی زبان ہے جسے لکھا جاتا ہے ۔ اس زبان کے حروف تہجی اس کے ایک خیر خواہ "سے کواویاہ" (Sequoyah) نے ۱۲ سال کی محنت کے بعد ۱۸۲۱ء میں ترتیب دیئے ۔ یہ ۸۶ حروف پر مشتمل ہے جو اس زبان کے تمام تلفظ کو ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں ۔ ۱۸۲۴ء میں ان لوگوں نے اس رسم الخط میں اپنا ایک اخبار بھی نکال لیا ۔ ان کی تعداد آج کل دس ہزار ہے ۔ یہ لوگ ریاست اوکلاہوما اور شمالی کیرولائینا میں بستے ہیں ۔

موہاک زبان نسل کا جبری انخلاء:

سی نے کا (Seneca) زبان بھی اروکوآ گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور نیویارک کے تحفظاتی علاقے میں پنپ رہی ہے ۔ لیگ اوف اِروکوآ (League of Iroquois) میں شامل ایک اور طاقتور قوم (زبان) موہاک (Mohawk) ہے چوں کہ اس قوم نے امریکی جنگِ آزادی میں برطانیہ کا ساتھ دیا تھا اس وجہ سے اسے آزادی کے بعد امریکی حکومت نے کینیڈا کی جانب دھکیل دیا ۔

چوکٹا سے ان کا آبائی علاقہ چھین لیا گیا:

چوکٹا (Choctaw) نے امریکی استعمار کے خلاف دیگر قبائل چی کاسا (Chickasaws)، سمی نولے (Seminoles)، کریک (Creek) اور چے روکی (Cherokee) کے ساتھ مل کر "پانچ تہذیب یافتہ قبائل" کے نام سے اپنی ایک تنظیم بنائی ۔ ۱۹۰۷ء تک یہ اتحاد قائم رہا ۔ ۱۸۳۰ء میں امریکا نے ان کا آبائی علاقہ جو جنوبی مس سس سی پی دریا کے کنارے آباد تھا، ان سے چھین لیا اور ۱۹۰۷ء تک اس علاقے کی آبادی مکمل طور پر ختم کر دی گئی اور ان کا علاقہ اوکلاہوما، ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ایک ریاست کے طور پر شامل کر لیا گیا ۔ یہ زبان چی کاسا سے بہت ملتی جلتی ہے ۔ ساک (Sac) جسے دوسرے نام فوکس (Fox) سے بھی جانا جاتا ہے کے بولنے والے بہت کم رہ گئے ہیں ۔ یہ الگون کیان لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے ۔

کریک اور گوروں کی کشمکش:

کریک (Creek) زبان بولنے والوں کی گورے نوآبادکاروں سے دائمی کشمکش جاری رہتی تھی ۔ یہ لوگ جیورجیا اور الاباما ریاستوں میں رہتے تھے لیکن آج کل انھیں تحفظاتی علاقوں میں محصور کر دیا گیا ہے ۔ ۱۴۔۱۸۱۳ء کی جنگوں میں اس زبان کے بولنے والے قبیلے کو امریکیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی اور ان کے آبائی علاقے ان سے جبراً چھین لیے گئے ۔

ڈی لاویر نسل کا انخلاء:

ڈی لاویر (Delaware) زبان بولنے والے کبھی نیو جرسی، نیویارک، پین سلے وینیا اور ڈی لاویر ریاستوں میں رہا کرتے تھے ۔ ۱۷۲۰ء میں امریکی استعماری ریاست نے انھیں مغرب کی طرف دھکیل دیا جہاں

اب یہ لوگ تحفظاتی علاقوں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ زبان الگون کیان (Algonkian) لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

ہوائی زبان کا تیزی سے خاتمہ:

ہوائی زبان بحر الکاہل میں واقع جزائر ہوائی میں بولی جاتی ہے۔ یہ زبان بہت تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ وہاں کی آبادی کا اب صرف ۵ء۱ فی صد حصہ یہ زبان بولتا ہے۔ اس زبان کی انفرادیت کے تحفظ کے لیے وہاں کے چند خیر خواہوں نے جزیرہ نی آئی ہو (Niihau) میں کچھ سو لوگوں کو خاص کر بسایا ہے اور ان کے روابط دیگر زبانوں (خاص کر انگریزی) سے کم سے کم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ اس زبان کی خالصیت کو قائم رکھا جا سکے۔ یہ زبان پولی نیشیائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

تلنگت زبان کا حال:

تلنگت (Tlingit) زبان اتاپاسکان لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ قدیم تلنگت اقوام کا دعویٰ ہے کہ حضرت نوحؑ کے طوفان کے بعد ان کی قوم انٹارکٹک کے علاقے میں اتری تھی۔ یہ زبان آلاسکا کے علاقوں میں بولی جاتی ہے یہ زبان بولنے والوں کی تعداد اب صرف ایک ہزار رہ گئی ہے۔

اتاپاسکان اور الگون کیان: خاموشی کے سمندر میں:

اتاپاسکان (Athapscan) اور الگون کیان (Algonkian) شمالی امریکا کے دو بڑے اہم لسانی خاندان ہیں جن کی کئی زبانیں اب مر چکی ہیں اور چند ایک بچ گئی ہیں۔ ان کے علاوہ زبانوں کے دیگر اور بھی بڑے خاندان ہیں لیکن ان خاندان کے بارے میں مغرب کی دو اہم قاموسوں انسائیکلوپیڈیا امریکانا اور انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا نے سکوت اختیار کیا ہے اور ان کے صفحات اس بابت معلومات مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔

سرخ ہندیوں کی بہت جلد مٹنے والی زبانیں:

ذیل میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ایسی زبانوں کا مختصر تعارف دیا جا رہا ہے جن کے بارے میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ کچھ عرصے میں یہ زبانیں فنا، معدومی اور گمنامی کے صحراء میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جائیں گی۔

۱۔ مشرقی ابناکی (Eastern Abnaki): اس زبان کو بولنے والا صرف ایک آدمی باقی ہے، جو ریاست مین (Maine) کے بنگور گاؤں میں مقیم ہے۔

۲۔ اچوماوی (Achumawi): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد صرف دس ہے، یہ لوگ شمال مشرقی کیلیفورنیا میں آباد ہیں۔

۳۔ آہتنا (Ahtena): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۸۰ ہے، جو صرف آٹھ گروہوں میں

بٹ کر رہ گئے ہیں۔

۴۔ الاباما(Alabama): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۲۵۶ ہے۔ ٹیکساس اور اوکلاہوما سے اس کے تمام بولنے والے اب ختم ہو چکے ہیں۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں کبھی ان کی کثیر آبادی رہا کرتی تھی۔ یہ لوگ امریکی حکومت کے محصور کردہ علاقے الاباما۔ کوشا تا تحفظاتی علاقے" (Alabama-Cushatta Reservation) میں رہتے ہیں جو جنوب مشرقی ٹیکساس کے لونگسٹن (Livingston) شہر میں واقع ہے۔

۵۔ جی کاریہ اپاچی(Jicarilla Apache): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد آٹھ سو بارہ ہے۔ یہ لوگ نیو میکسیکو کے شمالی علاقے دولسے (Dulce) میں رہتے ہیں۔

۶۔ کیووا اپاچی(Kiowa Apache): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد اٹھارہ ہے۔ یہ لوگ کاڈو کاؤنٹی (Caddo) مغربی اوکلاہوما میں رہتے ہیں۔

۷۔ لی پان اپاچی (Lipan Apache): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو ہے۔ یہ لوگ میس کالے دو تحفظاتی علاقے، نیو میکسیکو میں محصور کیے گئے ہیں۔

۸۔ اراپا ہو(Arapaho): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار اڑتیس ہے۔ یہ لوگ دریائے ونڈ کے تحفظاتی علاقہ، ریاستِ ویومنگ میں رہتے ہیں۔

۹۔ اری کارا (Arikara): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد نوے ہے۔ یہ لوگ فورٹ برتھ ہولڈ (Fort Berthold) کے تحفظاتی علاقہ شمالی ڈکوٹا میں رہتے ہیں۔

۱۰۔ اسی نی بوئی نے (Assiniboine): یہ بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ریاستِ مونٹانا میں دو تحفظاتی علاقوں فورٹ بیلک نیپ اور فورٹ پیک (Fort Belknap, Fort Peck reservations) میں مقیم ہیں۔

۱۱۔ ات سوگے وی(Atsugewi): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چار ہے۔ نسلی طور پر ان کی تعداد دو سو کے قریب ہیں۔ لیکن حالات نے انھیں اپنی زبان فراموش کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ لوگ شمال مشرقی کیلیفورنیا میں بستے ہیں۔

۱۲۔ بلیک فوٹ (Blackfoot): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار باسٹھ ہے۔ یہ لوگ ریاستِ مونٹانا کے تحفظاتی علاقے میں رہتے ہیں۔

۱۳۔ کاڈو (Caddo): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو اکتالیس ہے۔ نسلی طور پر ان لوگوں کی تعداد اٹھارہ سو ہے یہ لوگ اوکلاہوما کے مغرب میں بستے ہیں۔

۱۴۔ کاہوئی یا (Cahuilla): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھتیس ہے۔ یہ لوگ جنوبی کیلی فورنیا کے صحرائے موہابے کے علاقے میں رہتے ہیں۔ یہ زبان ازٹیکا (Aztec) لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کی تہذیب دنیا کی عظیم الشان تہذیبوں میں سے ایک ہے۔

۱۵۔ کاٹاوبا (Catawba): یہ زبان معدوم ہو چکی ہے۔

۱۶۔ کایوگا (Cayuga): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے۔ نیویارک کے مغربی حصے میں کاٹاروگس تحفظاتی علاقے (Cattaraugus Reservationa) میں یہ لوگ بستے ہیں۔

۱۷۔ چے ہالس زیریں (Lower Chehalis): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے۔ یہ ریاستِ واشنگٹن کے جنوب مغربی ساحل پر آباد ہیں۔

۱۸۔ چے ہالس بالائی (Upper Chehalis): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو ہے۔ یہ ریاست واشنگٹن کے پوجٹ ساؤنڈ (Puget Sound) کے جنوب میں رہتے ہیں۔ نسلی طور پر ان لوگوں کی تعداد ۱۵۰ سے بھی کم ہے۔

۱۹۔ چیٹ کو (Chetco): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے۔ یہ ریاستِ اوری گن (Oregon) کے جنوبی ساحل پر بستے ہیں۔

۲۰۔ شائین (Cheyenne): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار سات سو اکیس ہے۔ یہ لوگ شمالی شائین تحفظاتی علاقہ (Nothern Cheyenne reservation) جنوب مشرقی مونٹانا میں بستے ہیں۔

۲۱۔ چی کاسا (Chickasaw): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار ہے۔ جب کہ نسلی طور پر ان کی تعداد ۳۵ ہزار ہیں۔ یہ لوگ اوکلاہوما میں پھیلے ہوئے ہیں۔

۲۲۔ چی نوک (Chinook): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بارہ ہے۔ یہ لوگ ریاستِ اوری گن اور واشنگٹن میں آباد ہیں۔

۲۳۔ چی نوک واوا (Chinook Wawa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سترہ ہے۔ کسی زمانے میں یہ لوگ ریاستِ اوری گن سے لے کر کینیڈا اور الاسکا تک پھیلے ہوئے تھے لیکن اب دیگر علاقوں میں منتشر ہو چکے ہیں۔

۲۴۔ کلالم (Clallam): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے۔ یہ لوگ جزیرہ نما اولمپک، ریاستِ واشنگٹن شمالی مغربی امریکہ میں بستے ہیں۔

۲۵۔ کوکوپا (Cocopa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین سو اکتیس ہے۔ یہ لوگ یوما (Yuma)

ریاست اری زونا (Arizona) میں بستے ہیں۔

۲۶۔ کور دالین (Coeur D'Alene): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے۔ کوردالین تحفظاتی علاقے، ریاستِ آئیڈاہو (Idaho) میں آباد ہیں۔

۲۷۔ کولمبیا وینا چی (Columbia-Wenatchi): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچھتر ہے۔ ان لوگوں کی تعداد نسلی طور پر ۵۰۰ کے قریب ہیں یہ لوگ کول ول (Colville) تحفظاتی علاقہ، شمال وسطی ریاستِ واشنگٹن میں رہائش پذیر ہیں۔

۲۸۔ کمانچے (Comanche): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد آٹھ سو چون ہے۔ نسلی طور پر یہ لوگ تقریباً 6 ہزار ہیں جو اوکلاہوما میں رہتے ہیں۔ اس زبان کا تعلق ازٹیکا سے ہے۔

۲۹۔ کوس (Coos): اس زبان کو بولنے والا اب صرف ایک رہ گیا ہے۔ مگر نسلی طور پر یہ لوگ دو سو کے قریب ہیں اور اوریگن کی جنوبی ساحلی پٹی میں محصور ہیں۔

۳۰۔ کاؤلز (Cowlitz) اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو ہے۔ نسلی طور پر یہ لوگ اب دو سو سے بھی کم ہیں یہ ریاستِ واشنگٹن کے جنوب مغرب میں رہتے ہیں۔

۳۱۔ کرے میدانی (Plains Cree): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار ستر ہے۔ یہ لوگ شمال وسطی ریاستِ مونٹانا میں رہتے ہیں۔

۳۲۔ کوپین ئیو (Cupeno): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد نو ہے ان کی کل آبادی صرف ایک سو پچاس ہے۔ یہ لوگ کیلی فورنیا کے جنوب کے تحفظاتی علاقے میں آباد ہیں۔ یہ زبان معدومی کے قریب ہے اس زبان کا تعلق ازٹیکا لسانی گروہ سے ہے۔

۳۳۔ ڈی ہے زِت آن (Degexit' An): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چالیس ہے جب کہ نسلی طور پر یہ لوگ ڈھائی سو کے قریب ہیں یہ لوگ دریائے یوکون (Yukon) کے اطراف ریاستِ آلاسکا میں بستے ہیں۔

۳۴۔ ایاک (Eyak): اس زبان کو بولنے والا اب صرف ایک رہ گیا ہے جو انکوراج، آلاسکا میں مقیم ہے۔ یہ زبان معدوم ہو چکی ہے۔

۳۵۔ گویچ اِن (Gwich'in): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین سو ہے۔ جب کہ گیارہ سو کے قریب نسلی لوگ زندہ ہیں۔ دریائے یوکون کے اطراف ۶ گاؤں میں یہ لوگ آباد ہیں۔

۳۶۔ ہائیدا (Haida): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پندرہ ہے۔ جب کہ چھ سو کے قریب ان کی آبادی ہے یہ لوگ آلاسکا کے جنوبی کونے میں بستے ہیں۔

۳۷۔ گروس ینترے (Gros Ventre): ۱۱۰ افراد یہ زبان بولتے ہیں اور شمال وسطی مونٹانا کے بلک ناپ تحفظاتی علاقے میں مقیم ہیں۔

۳۸۔ ہان (Han): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سات ہے۔ یہ آلاسکا کے جنوب میں آباد ہیں۔

۳۹۔ ہواسوپائی۔ ولاپائی۔ یاواپائی (Havasupai-Walapai-Yavapai): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار سات ہے۔ یہ لوگ وسطی اری زونا میں گرینڈ کین۔ین (Grand Canyon) کے اطراف میں بستے ہیں۔

۴۰۔ ہوائی (Hawaiian): امریکی حکومت نے اس زبان کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا جس کی وجہ سے یہ زبان اپنی ہی ریاست میں اجنبی زبان کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ آج نسلی طور پر یہ زبان بولنے والوں کی تعداد جزیرے میں ڈھائی لاکھ کے قریب ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کے دوسرے علاقوں میں بھی یہ لوگ آباد ہیں لیکن زبان بولنے والے اب صرف ایک ہزار رہ گئے ہیں۔ ۱۷۷۸ میں جزائر ہوائی میں اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ لاکھ سے اوپر تھی۔ اس زبان کا تعلق پولی نیشیائی خاندان سے ہے۔

۴۱۔ ہداتسا (Hidatsa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سو ہے۔ فورٹ برتھ ہولڈ تحفظاتی علاقہ، شمالی ڈکوٹا میں یہ لوگ آباد ہیں۔

۴۲۔ ہوکاک (Hocak): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو سو پچاس ہے۔ یہ لوگ چھ ہزار کے قریب ہیں جو ریاستِ وسکون سن (Wisconsin) اور نیبراسکا (Nebraska) میں پھیلے ہوئے ہیں۔

۴۳۔ ہولی کاچوک (Holikachuk): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بارہ ہے۔ یہ دریائے یوکون، آلاسکا میں رہتے ہیں۔

۴۴۔ ہوپا (Hupa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد آٹھ ہے۔ یہ لوگ کیلیفورنیا میں مقیم ہیں۔

۴۵۔ جے میز (Jemez): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار تین سو ایک ہے یہ لوگ شمال وسطی نیو میکسیکو میں رہتے ہیں۔

۴۶۔ کالا پویا (Kalapuya): اس زبان کو بولنے والا اب صرف ایک ہے جو شمال مغربی اوریگن (Northwest Oregon) میں رہتا ہے۔

۴۷۔ کالیسپل۔ پینڈ دورے (Kalispel-Pend D'Oreille): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو سو ہے۔ یہ لوگ کالیسپل تحفظاتی علاقے ریاستِ واشنگٹن میں رہتے ہیں۔

۴۸۔ کانسا (Kansa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد انیس ہے۔ جب کہ اس نسل کے زندہ لوگوں

کی تعداد ۲۵۰ ہے۔ یہ زبان بولنے والے او کلاہوما کے شمال اور وسط میں بستے ہیں۔

۴۹۔ کاروک (Karok): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو چھبیس ہے۔ جب کہ تین ہزار سات سو کیاسی افراد پر مشتمل ان کی آبادی ہے۔ شمالی مغربی کیلی فورنیا میں کلاتھ دریا کے اطراف یہ لوگ بستے ہیں۔

۵۰۔ کاشایا (Kashaya): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچاس ہے۔ یہ لوگ آلاسکا میں بستے ہیں۔

۵۱۔ کاتو (Kato): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ کیلیفورنیا کے لے ٹن ول (Laytonville) تحفظاتی علاقے میں رہتے ہیں۔ اتاپاسکان لسانی گروہ سے اس کا تعلق ہے۔

۵۲۔ کاوائی سو (Kawaiisu): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے۔ یہ لوگ صحرائے موہابے (MojaveDesert) میں رہتے ہیں۔ ازمیکا لسانی گروہ سے اس کا تعلق ہے۔

۵۳۔ کی کاپو (Kickappo): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ سو اڑتالیس ہے۔ جو کینیڈا اور امریکہ کے سرحدی علاقوں میں آباد ہیں۔

۵۴۔ کیووا (Kiowa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار بانوے ہے یہ لوگ ریاستِ اوکلاہوما (Oklahoma) میں رہتے ہیں۔

۵۵۔ کلامت۔موڈوک (Klamath-Modoc): اس زبان کا بولنے والا صرف ایک ہے یہ اوری گن (Oregon) میں مقیم ہے۔

۵۶۔ کوآساتی (Koasati): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھ سو ہے۔ یہ لوگ لوئی زیانا، الاباما اور ٹیکساس کی ریاستوں کے تحفظاتی علاقوں میں رہتے ہیں۔

۵۷۔ کویوکون (Koyukon): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین سو ہے۔ اتاپاسکان لسانی گروہ سے اس کا تعلق ہے۔

۵۸۔ کومی آئی (Kumiai): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ستانوے ہے جو سان ڈیے گو (San Diego) کیلی فورنیا میں رہتے ہیں۔

۵۹۔ بالائی کُس کوک وِم (Upper Kuskok Wim): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چالیس ہے۔ یہ لوگ آلاسکا میں رہتے ہیں۔

۶۰۔ کوتے tائی (Kutenai): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو دو ہے۔ یہ لوگ فلیٹ ہیڈ تحفظاتی علاقے Flathead Reservation, Montana ریاستِ مونٹانا میں رہتے ہیں۔

۶۱۔ لوئی سے نیو (Luiseno): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تینتالیس ہے یہ لوگ جنوبی

کیلیفورنیا میں رہتے ہیں۔ اس زبان کا تعلق ازتیکا لسانی گروہ سے ہے۔

۶۲۔ لوشوت سید (Lushootseed): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ساٹھ ہے یہ لوگ پوجٹ ساؤنڈ ریاستِ واشنگٹن (Washington) میں رہتے ہیں۔ اس زبان کے کبھی دو لہجے ہوا کرتے تھے لیکن معدومی کے کنارے پر آنے کے بعد یہ ایک لہجہ بن چکا ہے۔

۶۳۔ شمال مشرقی مائدو (Northeast Maidu): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ کیلیفورنیا میں رہتے ہیں۔

۶۴۔ شمال مغربی مائدو (Northwest Maidu): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ وسطی کیلیفورنیا میں رہتے ہیں۔

۶۵۔ ماکاہ (Makah): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے، یہ لوگ اولمپک جزیرہ نما (Olympic Peninsula) کی شمالی سطح پر رہتے ہیں۔

۶۶۔ مالی سیتے پاسا ماکودی (Malecite-Passamaquoddy): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد آٹھ سو پچھتر ہے۔ یہ لوگ ریاستِ مین (Maine) میں رہتے ہیں۔

۶۷۔ مان دان (Mandan): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھ ہے یہ لوگ فورٹ برتھولڈ تحفظاتی علاقے (Fort Berthold reservation, North Dakota) شمالی ڈکوٹا میں رہتے ہیں۔

۶۸۔ ماری کوپا (Maricopa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو اکاسی ہے۔ یہ لوگ ریاست اریزونا (Arizona) میں رہتے ہیں۔

۶۹۔ مینومنی (Menomini): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد اناتالیس ہے۔ یہ لوگ شمال مشرقی وسکون سن (Northeastern Wisconsin) میں رہتے ہیں۔ اس زبان کے نسلی لوگوں کی تعداد ۳۵۰۰ ہے۔ اس زبان کو بچانے کے لیے ان کی نئی نسل یہ زبان تیزی سے سیکھ رہی ہے اور اس کی تدریس پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔

۷۰۔ مِس کواکی (Mesquakie): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین سو نوے ہے یہ لوگ اوکلاہوما کے فوکس تحفظاتی علاقے (Oklahoma Fox Reservation) میں رہتے ہیں۔

۷۱۔ می شیف (Michif): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین سو نوے ہے۔ یہ لوگ شمالی امریکہ اور جنوب مشرقی کینیڈا میں بستے ہیں اس زبان پر فرانسیسی زبان کا گہرا اثر ہے۔

۷۲۔ مِک ماک (Micmac): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بارہ سو ہے۔ یہ لوگ شمالی

مین (Northern Maine) میں رہتے ہیں

۷۳۔ می کا سوکی (Mikasuki): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چار سو چھیانوے ہے۔ جنوبی فلوریڈا میں یہ لوگ بستے ہیں۔

۷۴۔ وسطی سی یرا می ووک (Central Sierra Miwok): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے یہ لوگ کیلیفونیا (California) میں رہتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں ایک سو پانچ تھی۔

۷۵۔ می ووک ساحلی (Coast Miwok): اس زبان کو بولنے والا صرف ایک ہے۔ یہ زبان خلیج سان فرانسسکو سے خلیج بودیگا کی ساحلی پٹی پر کبھی بولی جاتی تھی اسی وجہ سے اسے ساحل می ووک کہتے ہیں۔

۷۶۔ تالابی می ووک (Lake Miwok): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد آٹھ ہے۔ یہ زبان کلیر جھیل (Lake Clerar) کے اطراف بولی جاتی ہے۔ اس وجہ سے اسے تالابی لہجہ کہتے ہیں۔

۷۷۔ می ووک شمالی سی یرا (Northern Sierra Miwok): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے۔ یہ زبان دو دریاؤں موک لیومنے (Mokelumne) اور کالا ویراس (Calaveras) کے بالائی حصے کے میدان میں بولی جاتی ہے۔

۷۸۔ میدانی می ووک (Miwok, Plains): اس زبان کو بولنے والا ایک فرد باقی ہے۔ یہ دریائے خوارکس کے ڈیلٹا میں رہتا ہے۔ اور یہ زبان اب مر رہی ہے۔

۷۹۔ می ووک جنوبی سی یرا (Southern Sierra Miwok): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے۔ یہ لوگ کیلیفورنیا (California) میں رہتے ہیں۔

۸۰۔ موہابے (Mohave): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو سو چونتیس ہے۔ یہ لوگ فورٹ موہابے اور دریائے کولوراڈو کے تحفظاتی علاقوں (Fort Mohave and (Colorado RiverReservations) کیلی فورنیا میں رہتے ہیں۔

۸۱۔ موہاک (Mohawk): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار چھ سو تریسٹھ ہے۔ یہ لوگ علاقہ سینٹ ریجس تحفظاتی علاقہ نیو یارک (St. Regis Reservation) میں رہتے ہیں۔

۸۲۔ مونو (Mono): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تیس ہے۔ نسلی طور پر ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے یہ مشرقی وسطی کیلی فورنیا میں بستے ہیں۔ اس زبان کا تعلق ازٹیکا سے ہے۔

۸۳۔ نیز پرس (Nez Perce): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھ سو تانوے ہے۔ یہ لوگ شمالی آئیڈاہو (Idaho) میں رہتے ہیں۔

۸۴۔ نی سے نان (Nisenan): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد صرف بارہ ہے یہ لوگ وسطی

کیلیفورنیا California میں رہتے ہیں۔

۸۵۔ اوکاناگان (Okanagan): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو بارہ ہے یہ لوگ علاقہ کول ویل تحفظاتی علاقہ واشنگٹن (Colville Reservation) میں رہتے ہیں۔

۸۶۔ اوماہاپونکا (Omaha-Ponca): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچاسی ہے۔ یہ لوگ مشرقی نیبراسکا اور شمال مشرقی اوکلاہوما کے تحفظاتی علاقوں میں رہتے ہیں۔

۸۷۔ اونی ڈا (Oneida): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچاس ہے یہ لوگ وسطی نیویارک میں رہتے ہیں۔

۸۸۔ اونون ڈاگا (Onondaga): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پندرہ ہے اور یہ لوگ وسطی ریاستِ نیویارک میں رہتے ہیں۔

۸۹۔ اوساج (Osage): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے یہ لوگ اوکلاہوما (Oklahoma) میں رہتے ہیں۔

۹۰۔ شمالی پائیوت (Northern Paiute): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار چھ سو اکتیس ہے یہ لوگ نیواڈا اور آئیڈاہو (Idaho) میں رہتے ہیں۔

۹۱۔ پانامنت (Panamint): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ ریاستِ نیواڈا (Nevada) میں رہتے ہیں سازمیکا لسانی گروہ سے اس کا تعلق ہے۔

۹۲۔ پاونی (Pawnee): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد 4 ہے۔

۹۳۔ پومو وسطی (Central Pomo): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چالیس ہے یہ لوگ شمالی کیلیفورنیا میں رہتے ہیں۔

۹۴۔ پومو شمال مشرقی (Northeastern Pomo): اس زبان کے بولنے والا اب صرف ایک رہ گیا ہے۔

۹۵۔ پومو جنوب مشرقی (Pomo, Southeastern): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے۔

۹۶۔ پومو جنوبی (Pomo Southern): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چالیس ہے۔ اس زبان کو ہسپانوی لوگ گالی نومیرو (Gallinomero) کہا کرتے تھے۔ کیلیفورنیا میں یہ لوگ آباد ہیں۔

۹۷۔ پٹاواتومی (Potawatomi): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھتیس ہے۔

۹۸۔ کواپاؤ (Quapaw) اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چونتیس ہے یہ لوگ اوکلاہوما میں رہتے ہیں۔

۹۹۔ کے چان (Quechan): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین سو چھتالیس ہے یہ لوگ فورٹ

یوما کے تحفظاتی علاقہ، کیلیفورنیا (Fort Yuma Reservation) میں رہتے ہیں۔

۱۰۰۔ کی لے اُتے (Quileute): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے۔ یہ لوگ اولمپک جزیرہ نما، واشنگٹن (Olympic Peninsula) میں رہتے ہیں۔

۱۰۲۔ کی نولت (Quinault): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھ ہے یہ لوگ اولمپک جزیرہ نما، واشنگٹن میں رہتے ہیں۔

۱۰۳۔ شمالی پوجت ساؤنڈ سالش (Southern Puget Sound Salish): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو سات ہے۔ یہ لوگ واشنگٹن میں رہتے ہیں۔

۱۰۴۔ سے نی کا (Seneca): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔ یہ لوگ کینیڈا اور امریکہ کے سرحدی علاقے میں بستے ہیں۔

۱۰۵۔ سیرانو (Serrano): اس زبان کو بولنے والا اب صرف ایک رہ گیا ہے۔ یہ ازتیکا گروہ کی زبان ہے۔

۱۰۶۔ شاستا (Shasta): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بارہ ہے۔ شمالی کیلی فورنیا میں یہ زبان بولنے والے بستے ہیں۔

۱۰۷۔ شاونی (Shawnee): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو سو چونتیس ہے اور یہ لوگ اوکلاہوما (Oklahoma) میں رہتے ہیں۔

۱۰۸۔ اسکاجت (Skagit): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سو ہے۔ یہ لوگ واشنگٹن (Washington) میں رہتے ہیں۔

۱۰۹۔ سنوہومش (Snohomish): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ تولالپ تحفظاتی علاقہ Tulalip Reservation میں رہتے ہیں۔

۱۱۰۔ اسپوکانے (Spokane): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچاس ہے۔ یہ لوگ شمالی مشرقی واشنگٹن میں رہتے ہیں۔

۱۱۱۔ تاناکروس (Tanacross): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پینسٹھ ہے یہ لوگ ریاست الاسکا (Alaska) میں رہتے ہیں۔

۱۱۲۔ تنا ئنا (Tanaina): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچھتر ہے اور یہ لوگ آلاسکا (Alaska) میں رہتے ہیں۔

۱۱۳۔ تنانا زیریں (Lower Tanana): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تیس ہے۔ یہ لوگ الاسکا میں رہتے ہیں۔

۱۱۴۔ تنانا بالائی (Upper Tanana): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو پانچ ہے۔ ان کی نسلی آبادی تین سو ہے۔ یہ لوگ آلاسکا میں رہتے ہیں۔

۱۱۵۔ تے نی نو (Tenino): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو سو ہے۔ یہ لوگ وارم اسپرنگ تحفظاتی علاقے Warm Springs Reservation ریاستِ اوریگن میں رہتے ہیں۔

۱۱۶۔ تلنگت (Tlingit): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سات سو ہے۔

۱۱۷۔ تولووا (Tolowa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے۔

۱۱۸۔ سِم شیان (Tsimshian): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ستر ہے یہ لوگ آلاسکا میں رہتے ہیں۔

۱۱۹۔ توباتولابل (Tubatulabal): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھ ہے یہ لوگ کیلیفورنیا میں بستے ہیں۔

۱۲۰۔ توسکارورا (Tuscarora): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ Tuscarora Reservation Niagara Falls, New York, میں بستے ہیں۔

۱۲۱۔ توتوت نی (Tututni): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ ریاستِ اوریگن Oregon میں بستے ہیں۔

۱۲۲۔ اوماتیہ (Umatilla): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچاس ہے یہ لوگ اوماتیہ تحفظاتی علاقے Umatilla Reservation میں بستے ہیں۔

۱۲۳۔ اونامی (Unami): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے۔ یہ لوگ اوکلاہوما میں بستے ہیں۔

۱۲۴۔ والاوالا (Walla Walla): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سو ہے یہ لوگ Umatilla Reservation اوماتیہ تحفظاتی علاقے میں بستے ہیں۔

۱۲۵۔ واپ پو (Wappo): اس زبان کو بولنے والا صرف ایک رہ گیا ہے۔ یہ کیلیفورنیا میں رہتا ہے۔

۱۲۶۔ واسکو وشرام (Wasco-Wishram): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد اٹھتر ہے یہ لوگ شمال وسطی اوریگن North Central Oregon میں رہتے ہیں۔

۱۲۷۔ واشو (Washo): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے اور یہ لوگ کیلیفورنیا میں بستے ہیں۔

۱۲۸۔ وچیتا (Wichita): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ ریاستِ اوکلاہوما کے مغربی وسط میں بستے ہیں۔

۱۲۹۔ ونٹو(Wintu):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ کیلیفورنیا میں بستے ہیں۔

۱۳۰۔ یاکی(Yaqui):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چار سو چھ ہے۔ یہ لوگ اریزونا میں بستے ہیں۔

۱۳۱۔ یوکٹ(Yokuts):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد اٹھتر ہے۔ یہ لوگ کیلیفورنیا میں رہتے ہیں۔

۱۳۲۔ یوچی(Yuchi):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بارہ ہے۔ یہ لوگ اوکلاہوما میں رہتے ہیں۔

۱۳۳۔ یوکی(Yuki):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھ ہے یہ لوگ Round Valley Reservation راؤنڈ ویلی تحفظاتی علاقے، شمالی کیلی فورنیا میں بستے ہیں۔

۱۳۴۔ یوروک(Yurok):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ Northwestern California شمالی مغربی کیلی فورنیا میں بستے ہیں۔

سرخ ہندیوں کی معدوم شدہ زبانیں

۱) ال سیا(Alsea): یہ زبان ۱۹۳۰ء میں ختم ہوگئی، ریاست اوری گن اس کا علاقہ تھا۔

۲) اٹاکاپا(Atakapa):لوئی زیانا اور ٹیکساس میں بولی جانے والی یہ زبان ۱۹۷۷ء میں ختم ہوگئی۔

۳) باربارینیو(Barbareno): جنوبی کیلی فورنیا۔

۴) بی لوکسی(Biloxi): دریائے مس سس پی کی زیریں وادی میں یہ زبان کبھی بولی جاتی تھی۔

۵) چی ماریکو(Chimariko): کیلی فورنیا

۶) چیتی ماچا (Chitimacha): ۱۹۷۷ تک یہ زبان ختم ہوگئی حالاں کہ اس زبان کے نسلی لوگ ۳۰۰ کے لگ بھگ موجود ہیں یہ ریاستِ لوئی زیانا کے جنوب میں بستے ہیں اور انگریزی زبان بولتے ہیں۔

۷) چوماش(Chumash): کیلی فورنیا

۸) کوکیہ(Coquille): اتاپاسکان ریڈ انڈین کی یہ زبان ریاستِ اوری گن کے جنوب مغرب میں بولی جاتی تھی۔

۹) شمالی کوستانوآن(NorthernCostanoan): یہ کیلی فورنیا کے شمالی ساحلی پٹی پر بولی جاتی تھی۔

۱۰) جنوبی کوستانوآن (SouthernCostanoan): جنوبی ساحلی پٹی کیلی فورنیا۔

۱۱) کروسینیو(Cruzeno): جنوبی کیلی فورنیا

۱۲) پجن ڈیلاویر(Pidgin Delaware): بحر اوقیانوس سے ملحقہ امریکا کی شمالی ساحلی پٹی پر یہ زبان

بولی جاتی تھی۔

۱۳) ایسے لین (Esselen): وسطی کیلی فورنیا

۱۴) گالی سے (Galice): اوری گن

۱۵) انے سینیو (Ineseno): سانتا باربرا کیلی فورنیا

۱۶) آیووا۔ اوتو (Iowa-oto): یہ زبان ۱۹۹۶ء میں ختم ہوئی لیکن اس زبان کے بولنے والے نسلی طور پر ۴۳۰۰ کی تعداد میں آج بھی موجود ہیں۔

۱۷) کارکن (Karkin): ریاست کیلی فورنیا

۱۸) کتسائی (Kitsai): ریاست اوکلاہوما۔

۱۹) لمبی (Lumbee): ۳۰۰۰۰ لوگ نسلی طور پر اس زبان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس زبان کو اب کوئی نہیں بولتا۔ یہ لوگ کیرولائینا اور میری لینڈ میں بستے ہیں۔

۲۰) وادی مائے دو (Valley Maidu): کیلی فورنیا

۲۱) مت تو لے (Mattole): اتاپاسکان لسانی گروہ سے اس کا تعلق تھا۔ کیلی فورنیا۔

۲۲) میامی (Miami): ۱۹۹۶ء تک یہ زبان ختم ہو چکی تھی جب کہ اس کے بولنے والے نسلی لوگ دو ہزار کی تعداد میں ہیں۔ ان کا مرکز ریاست انڈیانا اور اوکلاہوما ہے۔

۲۳) خلیجی می ووک (Bay Miwok): کیلی فورنیا۔

۲۴) موبی لی ین (Mobilian): دریائے مس سس پی کی زیریں وادی میں یہ لوگ بستے تھے۔

۲۵) موہے گان۔ مون تو ک۔ نرا گان ست (Mohegan-Montauk- Narragansett): ۱۴ سو کی لسانی آبادی میں اب اس زبان کو جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ ریاست کونیک ٹی کٹ، جزیرہ روڈ (Rhode is)۔

۲۶) مولالے (Molale): ریاست واشنگٹن اور اوری گن۔

۲۷) نانتی کوکے (Nanticoke): ریاست ڈی لاویر۔

۲۸) نا ت چیز (Natchez): ریاست اوکلاہوما۔

۲۹) نوک سا ک (Nooksack): ریاست واشنگٹن، نسلی طور پر یہ لوگ تین سو پچاس کی تعداد میں ہیں۔

۳۰) اوبس پینو (Obispeno): کیلی فورنیا۔

۳۱) اوفو (Ofo): زیریں مس سس پی۔

۳۲) پیرو (Piro): ریاست نیو میکسیکو۔

۳۳) مشرقی پومو (Eastern, Pomo): کیلی فورنیا

۳۴) شمالی پومو (Northern, Pomo): کیلی فورنیا

۳۵) پوہاتان (Powhatan): نسلی طور پر تین ہزار افراد ہیں لیکن زبان بولنے والا کوئی نہیں۔ اس زبان کے لیے بھی تحفظاتی علاقہ قائم کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود اسے بچایا نہ جا سکا۔ یہ علاقہ رانکوکس انڈین ریزرویشن (Rankokus Indian) ریاست نیو جرسی میں قائم کیا گیا تھا۔

۳۶) پوری سے مینو (Purisimeno): کیلی فورنیا۔

۳۷) سالی نان (Salinan): کیلی فورنیا۔

۳۸) سیوسلاؤ (Siuslaw): اوری گن۔

۳۹) سوس کے ہان نوک (Susquehannock): دریائے سوس کے ہان نوک کے اطراف یہ لوگ بسا کرتے تھے۔

۴۰) تاکیل ما (Takelma): ریاست اوری گن۔

۴۱) تلاموک (Tillamook): ریاست اوری گن۔

۴۲) تون کاوا (Tonkawa): ریاست اوکلاہوما۔

۴۳) تونی کا (Tunica): ایک سو پچاس افراد کی آبادی میں کوئی اس زبان کو نہیں جانتا۔

۴۴) توتیلو (Tutelo): دریائے مس سسی پی کی زیریں وادی۔

۴۵) توانا (Twana): تین سو پچاس لوگوں کی آبادی ہے لیکن زبان کو جاننے والا کوئی نہیں۔

۴۶) وینچوریو (Ventureno): کیلی فورنیا

۴۷) وائے لاکی (Wailaki): اسے بھی تحفظ دینے کے لیے اس زبان کے بولنے والوں کو خاص علاقے میں محصور کیا گیا لیکن یہ زبان محفوظ نہ ہو سکی۔ ناپاسکان زبان سے اس کا تعلق تھا، کیلی فورنیا۔

۴۸) وامپانوآگ (Wampanoag): ۱۲۰۰ کے قریب اس زبان کے نسلی لوگ ہیں جو ریاست میساچوسیٹ (Massachusetts) میں بستے ہیں۔

۴۹) وی یوت (Wiyot): ۱۴۰ کی آبادی میں کوئی بولنے والا نہیں۔

۵۰) ویان دوت (Wyandot): اوکلاہوما۔

۵۱) یانا (Yana): کیلی فورنیا۔

قدیم امریکی توسیع پسندی کی تاریخ پڑھنے کے بعد اب ہم جدید امریکی توسیع پسندی کا جائزہ لیتے ہیں:

جدید امریکہ: توسیع پسندانہ عزائم کی جھلک

ڈاکٹر جاوید آر لغاری کی تحقیق کے مطابق جو ۲۶/ستمبر ۲۰۰۱ء کو انٹرنیٹ پر جاری کی گئی [laghari@szabist.edu.pk] یہ فہرست ڈاکٹر شاہدہ وزارت کی ویب سائٹ shahid@szabist.edu.pk سے ۲۷/ستمبر ۲۰۰۱ء کو حاصل کی گئی۔ اس تحقیق کے مطابق دنیا بھر میں امریکی کارروائیوں کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

A) Ever since the United States Army massacred 300 Lakotas in 1890, American forces have intervened elsewhere around the globe 100 times. Indeed the United States has sent troops abroad or militarily struck other countries' territory 216 times since independence from Britain.

B) Since 1945 the United States has intervened in more than 20 countries throughout the world.

C) Since World War II, the United States actually dropped bombs on 20 countries. These include:

1. China 1945-46,
2. Korea 1950 53,
3. China '1950-53,
4. Guatemala 1954,
5. Indonesia 1958,
6. Cuba 1959-60,
7. Guatemala 1960,
8. Congo1964,
9. Peru 1965,
10. Laos 1964-73,
11. Vietnam 1961-73,
12. Cambodia 1969-70,

13. Guatemala '1967-69,
14. Grenada 1983,
15. Lebanon 1984,
16. Libya 1986,
17. EI Salvador 19808,
18. Nicaragua 1980s,
19. Panama -1989,
20. Iraq 1991-1999,
21. Sudan '1998,
22. Afghanistan 1998. and
23. Yugoslavia 1999,

D) Post World War II, the United States has also assisted in over 20 different coups throughout the world, and the CIA was responsible for half a dozen assassinations of political heads of state.

The following is a comprehensive summary of the imperialist strategy of the United States over the span of the past century:

1. Argentina - 1890 - Troops sent to Buenos Aires to protect business interests.
2. Chile - 1891 - Marines sent Chile and clashed with nationalist rebels.
3. Haiti - 1891 - American troops suppress a revolt by Black workers.
4. United States-claimed Navassa Island.
5. Hawaii - 1893 - Navy sent to Hawaii to overthrow the independent kingdom.
6. Hawaii annexed by the United States.
7. Nicaragua - 1894 - Troops occupied Bluefield, a city on the Caribbean Sea for a month.

8. China - 1894-95 - Navy, Army, and Marines landed during the Sino-Japanese War.
9. Korea - 1894-96 - Troops kept in Seoul during the war.
10. Panama - 1895 - Army, Navy, and Marines landed in the port city of Corinto.
11. China - 1894-1900 - Troops occupied China during the Boxer Rebellion.
12. Philippines - 1898-1910 - Navy and Army troops landed after the Philippines fell during the Spanish-American War; 600,000 Filipinos were killed.
13. Cuba - 1898-1902 - Troops seized Cuba in the Spanish-American War; the United States still maintains troops at Guantanamo Bay today.
14. Puerto Rico - 1898 - present. Troops seized Puerto Rico in the Spanish-American War and still occupy Puerto Rico today.
15. Nicaragua - 1898 - Marines landed at the port of San Juan del Sur.
16. Samoa - 1899 - Troops landed as a result over the battle for succession to the throne.
17. Panama - 1901-14 - Navy supported the revolution when Panama claimed independence from Colombia.
18. American troops have occupied the Canal Zone since 1901 when construction for the canal began.
19. Honduras - 1903 - Marines landed to intervene during a revolution.
20. Dominican Republic 1903-04 - Troops landed to protect American interests during a revolution.
21. Korea - 1904-05 - Marines landed during the Russo-Japanese War.

22. Cuba - 1906-09 - Troops landed during an election.

23. Nicaragua - 1907 - Troops landed and a protectorate was set up.

24. Honduras - 1907 - Marines landed during Honduras' war with Nicaragua.

25. Panama - 1908 - Marines sent in during Panama's election.

26. Nicaragua - 1910 - Marines landed for a second time in Bluefields and Corinto.

27. Honduras - 1911 - Troops sent in to protect American interests during Honduras' civil war.

28. China - 1911-41 - Navy and troops sent to China during continuous flare-ups.

29. Cuba - 1912 - Troops sent in to protect American interests in Havana.

30. Panama - 1912 - Marines landed during Panama's election.

31. Honduras - 1912 - Troops sent in to protect American interests.

32. Nicaragua - 1912-33 - Troops occupied Nicaragua and fought guerrillas during its 20-year civil war.

33. Mexico - 1913 - Navy evacuated Americans during revolution.

34. Dominican Republic 1914 - Navy fought with rebels over Santo Domingo.

35. Mexico - 1914-18 - Navy and troops sent in to intervene against nationalists.

36. Haiti - 1914-34 - Troops occupied Haiti after a revolution and occupied Haiti for 19 years.

37. Dominican Republic 1916-24 - Marines occupied the Dominican Republic for eight years.

38. Cuba - 1917-33 - Troops landed and occupied Cuba for 16 years;

Cuba became an economic protectorate.

39. World War I - 1917-18 - Navy and Army sent to Europe to fight the Axis powers.

40. Russia - 1918-22 - Navy and troops sent to eastern Russia after the Bolshevik Revolution; Army made five landings.

41. Honduras - 1919 - Marines sent during Honduras' national elections.

42. Guatemala - 1920 - Troops occupied Guatemala for two weeks during a union strike.

43. Turkey - 1922 - Troops fought nationalists in Smyrna.

44. China - 1922-27 - Navy and Army troops deployed during a nationalist revolt.

45. Honduras - 1924-25 - Troops landed twice during a national election.

46. Panama - 1925 - Troops sent in to put down a general strike.

47. China - 1927-34 - Marines sent in and stationed for seven years throughout China.

48. El Salvador - 1932 - Naval warships deployed during the FMLN revolt under Marti.

49. World War II - 1941-45 - Military fought the Axis powers: Japan, Germany, and Italy.

50. Yugoslavia - 1946 - Navy deployed off the coast of Yugoslavia in response to the downing of an American plane.

51. Uruguay - 1947 - Bombers deployed as a show of military force.

52. Greece - 1947-49 - United States operations insured a victory for the far right in national "elections".

53. Germany - 1948 - Military deployed in response to the Berlin blockade; the Berlin airlift lasts 444 days.

54. Philippines - 1948-54 - The CIA directed a civil war against the Filipino Huk revolt.

55. Puerto Rico - 1950 - Military helped crush an independence rebellion in Ponce.

56. Korean War - 1951-53 - Military sent in during the war.

57. Iran - 1953 - The CIA orchestrated the overthrow of democratically elected Mossadegh and restored the Shah to power.

58. Vietnam - 1954 - The United States offered weapons to the French in the battle against Ho Chi Minh and the Viet Minh.

59. Guatemala - 1954 - The CIA overthrew the democratically elected Arbenz and placed Colonel Armas in power.

60. Egypt - 1956 - Marines deployed to evacuate foreigners after Nasser nationalized the Suez Canal.

61. Lebanon - 1958 - Navy supported an Army occupation of Lebanon during its civil war.

62. Panama - 1958 - Troops landed after Panamanians demonstrations threatened the Canal Zone.

63. Vietnam - 1950s-75 - Vietnam War.

64. Cuba - 1961 - The CIA-directed Bay of Pigs invasions failed to overthrow the Castro government.

65. Cuba - 1962 - The Navy quarantines Cuba during the Cuban Missile Crisis.

66. Laos - 1962 - Military occupied Laos during its civil war against the Pathet Lao guerrillas.

67. Panama - 1964 - Troops sent in and Panamanians shot while protesting the United States presence in the Canal Zone.

68. Indonesia - 1965 - The CIA orchestrated a military coup.

69. Dominican Republic 1965-66 - Troops deployed during a national election.

70. Guatemala - 1966-67 - Green Berets sent in.

71. Cambodia, - 1969-75 - Military sent in after the Vietnam War expanded into Cambodia.

72. Oman - 1970 - Marines landed to direct a possible invasion into Iran.

73. Laos - 1971-:75 - Americans carpet-bomb on the countryside during Laos' civil war.

74. Chile - 1973 - The CIA orchestrated a coup, killing President Allende who had been popularly elected. The CIA helped to establish a military regime under General Pinochet.

75. Cambodia - 1975 - Twenty-eight Americans killed in an effort to retrieve the crew of the Mayaquez, which had been seized.

76. Angola - 1976-92 - The CIA backed South African rebels fighting against Marxist Angola.

77. Iran - 1980 - Americans aborted a rescue attempt to liberate 52 hostages seized in the Teheran embassy.

78. Libya - 1981 - American fighters shoot down two Libyan fighters.

79. EI Salvador - 1981-92 - The CIA, troops, and advisers aid in EI Salvador's war against the FMLN.

80. Nicaragua - 1981-90 - The CIA and NSC directed the Contra War against the Sandinistas.

81. Lebanon - 1982-84 - Marines occupied Beirut during Lebanon's civil war; 241 were killed in the American barracks and Reagan "redeployed" the troops to the Mediterranean.

82. Honduras - 1983-89 - Troops sent in to build bases near the Honduran border.

83. Grenada - 1983-84 - American invasion overthrew the Maurice Bishop government.

84. Iran - 1984 - American fighters shot down two Iranian planes over the Persian Gulf.

85. Libya - 1986 - American fighters hit targets in and around the capital training camps.

86. Yugoslavia - 1999 - Bombings and missile attacks carried out by the United States in conjunction with NATO in the 11 week war against Milosevic.

87. Iraq - 1998-2001 - Missiles launched into Baghdad and other large Iraqi cities for four days. American jets enforced "no-fly zone" and continued to hit Iraqi targets since December-1998.

E) These hundreds of instances of Ametican military intervention did not include times when the United States:

1. deployed military police overseas;
2. mobilized the National Guard;
3. sent Navy ships off the coast of numerous countries as a show of strength;
4. sent additional troops to areas where Americans were already stationed;
5. carried out covert actions where American forces were not under the " direct rule of an American command;
6. used small hostage rescue units;
7. used American pilots to fly foreign planes;

8. carried out military training and advisory programs which did not involve direct combat.

F) U. S. Government Assassination Plots.

Following is a list of prominent foreign leaders whose assassination (or planning for same) the United States has been involved in since the end of Second World War. The list does not include several assassinations in various parts of the world carried out by anti-Castro Cubans employed by CIA and headquartered in the United States:

LIST A: NON MUSLIMS

1. 1949 - Kim Koo, Korean opposition leader
2. 1950's - CIA/Neo-Nazi hit list of numerous political figures in West Germany
3. 1955 - Jose Antonio Remon, President of Panama
4. 1950's Chou En-lai, Prime Minister of China, several attempts on his life
5. 1951 - Kim il Sung, Premiere of North Korea
6. 1950s (mid) - Claro M. Recto, Philippines opposition leader
7. 1955 - Jawar Lal Nehru, Prime Minister of India
8. 1959 and 1963 - Norodom Sihanouk, leader of Cambodia.
9. 1950s-70s - Jose Figueres, President of Costa Rica, two attempts on his life:
10. 1961 - Francois "Papa Doc"Duvalier, leader of Haiti
11. 1961 - Patrice Lumumba , Prime Minister of Congo (Zaire)
12. 1961 - Gen. Rafael Trujillo, leader of Dominican Republic
13. 1963 - Ngo Dinh Diem, President of South Vietnam
14. 1960s - Fidel Castro, President of Cuba, more than 15 attempts on his

life.

15. 1960s - Raul Castro, high official in government of Cuba
16. 1965 - Francisco Caamanao, Dominican Republic opposition leader.
17. 1965 - Pierre Ngendandumwe, Prime Minister of Burundi.
18. 1965-6 - Charles de Gaulle, President of France.
19. 1967 - Che GL'GVara, Cuban leader.
20. 1970 - Salvadore Allende, President of Chile.
21. 1970 - General Rene Schneider, Commander-in-Chief of Army, Chile.
22. 1970s and 1981 - Gen. Omar Torrijos, leader of Panama
23. 1972 - General Manuel Noriega, Chief of Panama Intelligence.
24. 1975 - Mobutu Sese Seko, President of Zaire.
25. 1976 - Michael Manley, Prime Minister of Jamaica.
26. 1983 - Miguel d'Escato, Foreign Minister of Nicaragua.
27. 1984 - The nine commandantes of the Sandanista National Directorate
28. 1980s - Dr. Gerald Bull, Canadian Ballistics Scientist assassinated by Massad in Belgium.

G) Partial List of Muslim Leaders Assassinated or Attempted Assassinations:

1. 1950's Sukarno, President of Indonesia.
2. 1957 Gamal Abdul Nasser, President of Egypt
3. 1960 Brigadier General Abdul Karim Kassem, Leader of Iraq.
4. 1980-86 Muammar Qaddafi, Leader of Libya, several plots and attempts upon his life.
5. 1982 Ayatullah Khomeini, Leader of Iran.

6. 1983 General Ahmed Dlimi, Moroccan army Commander
7. 1985 Sheikh Mohammed Hussein Fadlullah, Lebanese Shiite Leader (80 people killed in that attempt)
8. 1991 Saddam Hussein, Leader of Iraq [Reference: Blum, William, "KILLING HOPE " U.S. Military and CIA Interventions Since World War II," Appendix III U.S. Government Assassination Plots, page 453, Common Courage Press, Monroe, Maine 1995. ISBN 1-56751-052-3]

امریکہ: دنیا بھر میں خفیہ جیلیں:

اے ایف پی نے ۵/ جون ۲۰۰۵ء کو ایمنسٹی انٹرنیشنل کے حوالے سے دنیا بھر میں امریکہ کی خفیہ جیلوں کی تفصیلات اخبارات کو جاری کیں جہاں لے جائے جانے والے واپس نہیں آئے خبر درج ذیل ہے:

WASHINGTON, June 5: The US government is operating an "archipelago" of prisons around the world many of them are secret camps into which people are being "literally disappeared", a top Amnesty International (AI) official said on Sunday.

AI Executive Director William Schulz criticized the administration of US President George W. Bush for holding alleged battlefield combatants in "indefinite incommunicado detention" without access to lawyers in an interview with Fox News on Sunday.

Schulz was pressed to substantiate Amnesty's claim in a May 25 report that the US prison camp at the Guantanamo Bay, Cuba naval base - where hundreds of foreign terror suspects are being held indefinitely - represents the "gulag of our times".

The gulag claim, referring to the notorious prison camp systems of the Soviet Union, has drawn withering criticism from the US president, who called it "absurd". Vice President Richard Cheney and Defence Secretary

Donald Rumsfeld have also slammed the rights group's claim.

Russian 1970 Noble Prize winner Aleksandr Solzhenitsyn described the Soviet prison camp system in his best-selling book "The Gulag Archipelago".

Schulz said the gulag reference was not "an exact or a literal analogy".[AFP]

بیسویں صدی جمہوری اور لبرل معاشروں کے کمالات

۸۹ تا ۹۸ دس سال میں ۱۰۷ خانہ جنگیاں

۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۸ء کے درمیان ۱۰۷ خانہ جنگیاں ہو چکی ہیں جنھیں uncivil war کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ریاستوں کے درمیان صرف سات جنگیں ہوئیں۔ ۱۹۸۸ء کے آغاز میں ایک سرحد پار جنگ کے مقابلے میں ۳۲ خانہ جنگیاں ہو رہی تھیں۔ ۱۸۱۶ء سے ۱۹۹۸ء کے درمیان ۲۳۱ خانہ جنگیاں ہوئیں جس سے واضح طور پر یہ اشارہ ملتا ہے کہ ۱۹۸۹ء کے بعد بڑی تیزی سے بہت زیادہ خانہ جنگیاں ہوئی ہیں۔ ولیم جے، ایکہارڈ اور اس کے جانشینوں نے اندازہ لگایا تھا کہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۹۵ء کے دوران بیسویں صدی میں جنگ سے متعلق ہلاکتوں کی تعداد مجموعی طور پر کم از کم ۱۰۶۱۱۴۰۰۰ ہے، جس میں ۶۲۱۹۴۰۰۰ شہری اور ۴۳۹۲۰۰۰۰ فوجی ہلاک شدگان شامل ہیں (سیوارڈ ۱۹۹۶ء:۱۹)۔ ”سرد جنگ“ کے ”پرامن“ دور میں قتل عام جاری رہا اور ۱۹۴۵ء اور ۱۹۹۲ء کے درمیانی عرصہ میں ۱۴۹ جنگوں میں اندازاً کم از کم ۲۲۰۵۷۰۰۰ لوگ ہلاک ہوئے جن میں ۱۴۵۰۵۰۰۰ شہری اور ۷۵۵۲۰۰۰ فوجی تھے (سیوارڈ ۱۹۹۳ء ۱۔ ۲۰)۔ صرف ۱۹۹۶ء میں کم از کم تیس لڑائیاں جاری تھیں۔

اکیس سال میں ۸۰ لاکھ سرخ ہندی مارے گئے:

ڈیوڈ اسٹینرڈ کے مطابق، قبل از قتال عظیم، براعظم امریکہ کی مقامی آبادی اس وقت کی افریقہ اور یورپ کی مجموعی آبادی کے مقابلے میں زیادہ بڑی تھی۔ امریکہ کے ان قدیم باشندوں میں سے تقریباً ۸۰ لاکھ افراد براہِ راست جنگ میں موت کا شکار ہوئے یا پھر جنگ اور تشدد سے تعلق رکھنے والے امراض اور دل شکستگی کے باعث موت سے ہم کنار ہوئے۔ یہ تمام لوگ کولمبس کے امریکہ پہنچنے کے بعد ۲۱ سال کے اندر مرے تھے۔ اسٹینرڈ نے تخمینہ ان اعداد و شمار سے قائم کیا کہ پندرہویں صدی کے اختتام پر کرہ ارض پر ۱۰ کروڑ سے زیادہ افراد بستے تھے اور چند صدیوں کے بعد ان کی تعداد تقریباً ۵۰ لاکھ رہ گئی تھی۔ انسانی قتل پر ایک اور مطالعہ میں جو آر رومیل نے داخلی اور بین الاقوامی جنگوں میں حکومتی قتل کا شکار بننے والوں کی تعداد کی تین عشروں تک دستاویز تیار کرنے کے بعد

۱۹۹۴ء میں مرتب کیا تھا، چار عدد قتل عام (Democides) کا اندازہ لگایا ہے جس میں بیسویں صدی سے قبل معلوم تاریخ کے ایک ہزار برسوں میں ایک کروڑ سے زیادہ افراد قتل کیے گئے تھے۔ ان کا اندازہ ہے کہ چین میں ۲۲۱ قبل مسیح اور ۱۹ویں صدی عیسوی کے اختتام کے درمیان تقریباً تین کروڑ ۴۰ لاکھ افراد کو قتل کیا گیا، افریقیوں کو غلام بنانے کے نتیجے میں ایک کروڑ ۷۰ لاکھ افراد قتل ہوئے، اور یورپی باشندوں کی آمد سے لے کر ۱۹ویں صدی کے اختتام تک نصف مغربی کرہ میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ افراد کو قتل کیا گیا۔ اس طرح یہ چار قتل عام تقریباً ۱۰ کروڑ افراد کے قتل کا باعث بن جاتے ہیں۔ (لیکن رومیل نے ۲۰۰۵ء میں ان اعداد و شمار میں حیرت انگیز اضافے کیے ہیں اور بتایا ہے کہ سترہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک کے قتل عام میں پونے دو ارب انسان ہلاک کیے گئے۔

[فروری ۲۰۰۵ء میں رومیل کی ویب سائٹ پر دیے گئے اعداد و شمار]

خانہ جنگیوں کی شدت ۱۸۱۶ء_۱۹۹۸ء

	خصوصیات	ریاستوں کی تعداد	خانہ جنگیوں کی تعداد	ہلاکتیں	فیصد شرح
۱۸۱۶_۱۸۴۸	یورپ کی شکست میں بادشاہتوں کے ذریعے کچلے گئے انقلاب	۲۸	۱۲	۹۳۲۰۰	۳(۲۵ فیصد)
۱۸۴۹_۱۸۸۱	ابھرتی ہوئی قوم پرستی اور خانہ جنگیاں	۳۹	۳۰	۲۸۹۱۲۰۰	۱(۵ فیصد)
۱۸۸۲_۱۹۱۴	سامراجیت اور نو آبادیت	۴۰	۱۸	۳۸۸۰۰۰	۳(۱۷ فیصد)
۱۹۱۵_۱۹۴۵	عالمی جنگیں اور معاشی درماندگی	۵۹	۱۴	۱۹۳۱۴۶۰	۴(۲۹ فیصد)
۱۹۴۶_۱۹۸۸	سرد جنگ کے دوران ابھرتے ہوئے عالمی جنوب کے ممالک کا نوآبادیت سے چھٹکارا اور آزادی	۱۱۷	۶۰	۹۲۲۳۰۲۰	۱۴(۲۳ فیصد)

۱۹۸۹-۱۹۹۸	ناکام ریاستوں اور خانہ جنگیوں کا عہد	۱۹۲	۱۰۷	۱۹۵۰۰۰۰	۱۰ (۹ فیصد)
مجموعی تعداد		۱۹۲	۲۳۱	۱۳۳۱۶۰۰۰	۳۳ (۱۴ فیصد)

Source: Chales W. Kegley, Jr, & Eugene R. Wittkopfe (eds), World Politics: Trend and Transformation, 8th ed., London: Macmillan press Ltd, 2001, P.436.

بیسویں صدی: انیسویں صدی کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ اموات:

رتھ لیگر سیورڈ کے اندازے کے مطابق ۱۹۱۰ء سے ۱۹۸۵ء کے دوران لڑی گئی ۲۰۲ جنگوں میں تخمیناً ۷ کروڑ ۸۰ لاکھ جانیں تلف ہوئیں۔ دوسرے الفاظ میں، بیسویں صدی میں ہونے والی اموات انیسویں صدی کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ تھیں۔ صرف ان دو جنگوں میں، ۱۰۰ سال سے کم عرصے کے دوران، اہم شریک ملکوں کے ۶۰ کروڑ شہری قتل ہوئے۔ یہ تعداد کئی یورپی ملکوں کی کل تعداد سے زیادہ ہے۔ پہلی عالمی جنگ میں ۸۰ لاکھ فوجی اور ایک لاکھ شہری ہلاک ہوئے جب کہ ۱۹۱۸ء میں انفلوئنزا کی وباء پھیلنے سے ایک کروڑ اسی لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک سوویت یونین تھا جہاں ہلاک ہونے والوں کی تعداد کل ہلاکتوں کا ۴۰ فیصد تھی۔

بیسویں صدی: ۱۸ ویں صدی سے سات گنا زیادہ ہلاکتیں:

ہال کین نے ۱۹۹۵ء میں لکھتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا تھا کہ ”ایک تجربے کے مطابق ۱۹۴۵ء کے بعد ہونے والی جنگوں میں ہلاکتوں کی تعداد انیسویں صدی سے دوگنی اور ۱۸ ویں صدی سے سات گنا زیادہ تھی“۔ اس حیرت انگیز اضافے کی وجہ کیا تھی؟ اس اضافے کی وجوہات تاریخ، فکر اور فلسفہ میں ہی تلاش کرنے کے لیے ہمیں یونانی فکر و فلسفہ سے لے کر مغربی فکر و فلسفے تک کے اہم مباحث کو پیش نظر رکھنا ہوگا کیونکہ طرز زندگی میں تبدیلی کا براہ راست تعلق الہیات، مابعد الطبیعیات، علمیات سے ہے۔ یہ اگر تبدیل ہوں تو سب تبدیل ہو جاتا ہے۔ مغربی فکر و فلسفے کے فروغ نے دنیا میں تشدد کو جنم دیا ہے جو سعت پذیر ہو رہا ہے۔

افلاطون: جنگ سیاسی زندگی کی بنیادی حقیقت:

افلاطون (۴۲۷-۳۴۷ ق م) کی مثالی ”جمہوریہ“ (Republic) میں، فلسفی حکمران (سرپرست) کو جنگجو طبقے سے لیا گیا تھا جو (ضمنی طور پر) استبداد اور ترغیب کے ذریعے پیداوار کرنے والوں اور غلاموں پر حکومت کرتے تھے۔ لیون ہیرالڈ کریگ نے اشارہ کیا ہے، ”ایک غیر متعصب ناظر یہ نتیجہ اخذ کرنے سے شاید ہی بچ سکے کہ (افلاطون کی ”جمہوریہ“ میں) جنگ کو سیاسی زندگی کی بنیادی حقیقت سمجھنا چاہیے اور در حقیقت پوری زندگی کے لیے اور یہ کہ ہر اہم فیصلہ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جانا چاہیے“۔

۱۷ویں صدی سے پہلے دنیا کی تاریخ میں صرف ۳۶ کروڑ لوگ مارے گئے اس صدی کے بعد جب دنیا بہت مہذب ہوئی تھی انسان نیا فلسفہ نیا مذہب، نئی سائنس پیدا ہوئی اس کے بعد دہشت گردی جنگیں طاعون کی طرح پھوٹ پڑیں اور روميل کے مطابق صرف تین سو سال میں پونے دو ارب لوگ مارے گئے۔ اس کی وجوہات فلسفیوں کے متشدد افکار میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ تمام مغربی فلسفیوں کے افکار آخر کار حرص و حسد کی عالمگیریت کو ممکن بناتے ہیں۔ یہ عالمگیریت، عالمگیر تشدد، جنگی جنون کا باعث ہے، بنیادی حقوق، آزادی، انسانی حقوق، نیشنل ازم، جمہوریت، لبرل ازم کے فلسفے تشدد کے فروغ کا اصل سبب ہیں کیونکہ یہ نفرت، حرص و حسد اور بہیمیت کو فروغ دینے کا باعث ہیں۔ سیاست میں یہ عمل جمہوریت کے ذریعے ممکن ہوتا ہے اور معیشت میں سرمایہ دارانہ نظم معیشت کے ذریعے یہی دو ذریعے دنیا میں جنگوں کی دائمی موجودگی کو ممکن بناتے ہیں۔

ارسطو: ہتھیار صاحب جائیداد رکھے گا

ارسطو (۳۸۴۔۳۲۲ ق م) کی ''سیاست'' (Politics) میں، پسندیدہ سیاسی نظام میں......حکمرانی چاہے ایک کی ہو چند کی یا کئی کی ہو......ہتھیاروں پر اختیار صاحب جائیداد لوگوں کا ہوگا اور غلاموں کو تابع بنائے رکھنے اور دشمن کے قبضے میں جانے سے محفوظ رہنے کے لیے فوجیں ضروری ہیں۔ فوجوں کی اس مستقل ہلاکت آفریں موجودگی کو نہ افلاطون موضوع بحث بناتا ہے اور نہ ارسطو اس بارے میں سوال اٹھاتا ہے۔

میکیاویلی: حکمرانوں کو ہلاکت خیز قوت کی اجازت

مشہور و مقبول میکیاویلی (۱۵۲۷۔۱۴۶۹) کی مشہور تصنیف ''دی پرنس'' میں حکمرانوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے اور اپنی ریاستوں کی طاقت، شہرت اور وقار میں اضافے کے لیے قتل کرنے کو حق بہ جانب ثابت کرنے کے لیے واضح جواز فراہم کیا گیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ''لومڑی'' کی مکاری کے ذریعہ حکومت کی جائے، لیکن بہ وقتِ ضرورت حکمرانوں کو ''شیر'' کی بے باک ہلاکت آفرینی سے پہلو تہی نہیں کرنا چاہیے۔ جمہوری ریاست کی قوت کو استحکام بخشنے کے لیے وہ شہری ملیشیا قائم کرنے کی تجویز پیش کرتا ہے۔

ہابس: حکمران کو اختیار رہے کہ عوام کو قتل کر سکے

تھامس ہوبس (۱۶۷۹۔۱۵۸۸) اپنی کتاب Leriathan میں سماجی نظم و ضبط کو قائم رکھنے اور جنگ میں فتح کے لیے حکومتوں کی جانب سے قتل کرنے کے لیے مزید جواز پیش کرتا ہے۔ انسان چونکہ قاتل ہے لہٰذا فطری حالت میں غیر منظم زندگی کا نتیجہ ایک سفاک بدنظمی کی صورت میں سامنے آتا ہے لیکن انسان سلامتی کا جویا اور متلاشی بھی ہے چنانچہ اسے ایک مرکزی حکمران کی اطاعت کرنی چاہیے اور اسے یہ اختیار دینا چاہیے کہ وہ ان کی سلامتی کے لیے قتل کر سکے اور اپنی حفاظت کے لیے دوسرے کو ہلاک کرنے کا حق انھیں اپنے لیے محفوظ رکھنا چاہیے۔ ہوبس نے مسلح بغاوت کو جائز قرار دینے سے گریز اختیار کیا ہے۔

یہ کام جان لاک (۱۶۳۲۔۱۷۰۴) نے اپنی کتاب Two Treaties of Government (حکومت کے دو اصول) میں انجام دیا ہے۔ وہ افلاطون، ارسطو، میکیاویلی، اور ہوبس کے ساتھ اس امر پر متفق ہے کہ سیاسی حکمرانی ہلاک کرنے کے لیے تیار رہنے کو ضروری بنا دیتی ہے۔ لیکن وہ مزید آگے بڑھ کر انقلابی ہلاکت آفرینی کو حق بہ جانب قرار دیتا ہے۔ جب اقتدار اعلیٰ پر فائز حکمراں مطلق العنان بن جاتا ہے اور ملکیت، آزادی اور زندگی کے خلقی حقوق پامال کرتا ہے......تو جبر و استبداد کے شکار شہریوں کو یہ حق حاصل ہے اور یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ اسے تباہ کر دیں۔ جیسے فطری صورت حال میں قاتل کو ہلاک کیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح سول سوسائٹی کے شہری ایک جابر حکمراں کو تباہ کر سکتے ہیں۔

مارکس اینگلز: عبوری دور میں غارت گری کی اجازت ہے

ہوبس اور لاک کے، حاکموں اور محکوموں کی ہلاکت آفرینی کے دوہرے جواز کو کارل مارکس (۱۸۱۸۔۱۸۸۳) اور فریڈرک اینگلز (۱۸۲۰۔۱۸۹۵) نے ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' میں معاشی طبقے کی جنگ تک وسعت دے دی۔ صاحب جائیداد طبقوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ اور مفادات میں اضافے کے لیے ہلاکت آفرین قوت کا استعمال کریں۔ لیکن جب مادی اور سماجی تعلقات نازک مرحلے پر پہنچ جائیں تو استحصال زدہ طبقات متوقع طور پر سوسائٹی کے معاشی اور سیاسی ڈھانچے کی تبدیلی کے لیے پرتشدد بغاوت برپا کر سکتے ہیں۔ جدید انتخابی جمہوریت کی بعض مخصوص حالتوں میں پرامن تبدیلی ممکن ہو سکتی ہے۔ مستقبل میں جب بھی معاشی استحصال ختم ہو جائے گا تو طبقاتی بنیاد پر قائم ہلاکت آفرین صورت حال بھی معدوم ہو جائے گی۔ لیکن عبوری دور میں معاشی عوامل کی بناء پر لوگوں کا میلان طمع و غارت کی جانب رہے گا۔

روسو: زندگی ریاست کی جانب سے مشروط تحفہ ہے

لاک اور مارکس کے درمیانی عرصے میں، ہوبس کے خیالات کی بازگشت کے طور پر ژاں ژاک روسو (۱۷۱۲۔۱۷۷۸) اپنی تصنیف ''عمرانی معاہدہ'' "The Social Contract" میں ریاست کی سیاسی تنظیم کی بنیاد کے طور پر ''عمرانی معاہدے'' کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ شہری مجموعی طور پر ریاست کے حاکم اعلیٰ بھی ہیں اور رعایا بھی ہیں۔ وہ خود ہی اس برسر اقتدار حکومت کی اطاعت کے پابند ہو جاتے ہیں جو ''عوامی خواہش'' سے ماخوذ قوانین بناتی اور ان کا نفاذ کرتی ہے۔ معاہدے کے تحت ریاست جنگ اور صلح کے حق کی دعویدار ہوتی ہے، غداروں کو سزائے موت دی جا سکتی ہے اور مجرموں کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ برسر اقتدار حکومت شہریوں کو حکم دے سکتی ہے کہ وہ ریاست کے لیے اپنی زندگیاں قربان کریں:

جب برسر اقتدار حکومت ایک شہری سے کہہ دے: ریاست کے مفاد میں تمہارا مرنا ضروری ہے تو

اسے مرجانا چاہیے، کیونکہ...... اس کی زندگی صرف عطائے فطرت نہیں ہے، بلکہ ریاست کی جانب سے ایک مشروط تحفہ ہے۔ [عمرانی معاہدہ، دوسرا حصہ، باب پنجم]

میکس ویبر: سیاست کا فیصلہ کن عنصر تشدد ہے

بیسویں صدی میں، جرمنی کے بااثر سیاسی معاشیات کے ماہر اور عمرانیات کے نظریہ ساز، میکس ویبر (۱۹۲۰ء۔۱۸۶۴) "سیاست بطور مقدس پیشہ" میں، جو دراصل ۱۹۱۸ء میں میونخ یونیورسٹی میں کی گئی تقریر پر مبنی ہے، اس خیال کو قطعی طور پر مسترد کر دیتا ہے کہ ریاست ہلاکت گریز پیشہ ہو سکتی ہے۔ ویبر کی رائے کے مطابق "سیاست کا فیصلہ کن عنصر تشدد ہے" تاریخی طور پر تمام بالادست سیاسی ادارے اقتدار کے لیے پر تشدد جدوجہد سے ابھرے تھے۔ نتیجتاً ویبر جدید ریاست کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے "ایک ایسی انسانی برادری جو (کامیابی سے) کسی مخصوص سرحد کے اندر جسمانی طاقت کے قانونی استعمال پر کامل اختیار کی دعویدار ہو" لہٰذا "جو اپنی اور دوسروں کی روحانی نجات چاہتا ہے وہ اسے کوچۂ سیاست میں تلاش نہ کرے، کیونکہ سیاست کے مختلف اہداف صرف تشدد کے ذریعے ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں"۔

امریکی دانش کا اجماع: ہلاکت گریز سماج محال ہے

گلین ڈی پیج کے خیال میں ہلاکت آفریں فلسفیانہ روایات کی بازگشت جسے تشدد پسند مذہب کی تائید حاصل ہے، وہ امریکا کی پوری سیاسی تاریخ اور تہذیب میں پھیلی ہوئی ہے، اس نے شہریوں اور عالموں دونوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی ہے کہ ایک ہلاک گریز سماج کا وجود ناممکن ہے۔ اس تعین کی بازگشت لیکسنگٹن میں چلنے والی توڑے دار بندوقوں کی آواز جس نے امریکی انقلاب کو چنگاری دکھائی، لاک کے دیے ہوئے جواز کے مطابق اعلانِ آزادی کے ذریعے حکومتِ وقت کی اطاعت سے روگردانی کا اعلان کرنے والے نقارچی کی آواز میں، اور نیو ہیمپشائر میں اعلانیہ سرکشی کے نعرے "آزادی یا موت!" میں سنائی دیتی ہے۔

امریکی صدارتی دعا: قتل عام کے جذبات ابھارتی ہے

"ریاست کے جنگی ترانے" میں بھی اس یقین کی گونج سنائی دیتی ہے جو کنفیڈریٹ باغیوں پر یونین کی فتح کا جذبہ پیدا کرتی ہے، اور "امریکہ کی جنوبی ریاستوں" کی آہستہ رو گستاخانہ سرکشی میں، اور دور دراز علاقوں اور سمندروں میں جنگ میں مصروف لوگوں کے "بحری ترانے" میں...... صدر کے کمانڈر ان چیف کے طور پر عہدہ سنبھالنے کے وقت ۲۱ توپوں کی سلامی میں بھی اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو قوم کے مقتدر ماضی اور موجودہ فوجی قوت کی یاددہانی کراتی ہے۔ پرچم کشائی کی تقریب، قومی ترانے کے بجتے، اور مسلح حفاظتی دستوں کی موجودگی اور یہ صدارتی دعا کہ "خدا امریکہ پر برکت نازل کرے" (لوئن ۱۹۷۰ء) وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے قربانی دینے اور قتل عام کرنے کے جذبات ابھارے جاتے ہیں۔

امریکہ: ایک ہلاکت آفرین ریاست

گلیین ڈی ریچ کے خیال میں امریکہ کی ابتداء اس کی سرحدوں میں توسیع، قومی ہم آہنگی اور عالمی طاقت بننے میں اس کی مدد قتال نے کی۔ ملک کے اندر یا ملک کے باہر مارے جانے والے یا زخمی ہونے والے، فوجی یا شہری ہوں، ہلاک ہونے والوں یا زخمیوں کا اندازہ کرنا ابھی باقی ہے اور یقیناً وہ بے شمار ہیں، لیکن امریکی ریاست کی ہلاکت آفرینی کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دیگر ممالک میں سیاسیات کے عالموں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی سیاسی تخصص پر زیادہ یا کم قتل عام کے اثر انداز ہونے کے بارے میں روشنی ڈالیں۔

غلاموں کی محکومی برقرار رکھتے ہوئے، ایک جدید قوم نے شاہی نوآبادیاتی حکومت کے خلاف مسلح عوامی بغاوت کا آغاز کیا۔ آزادی کے پرچم تلے اس نے مقامی آبادی پر خونیں فتوحات کے ذریعے، شمال اور جنوب کے پڑوسیوں کے خلاف طاقت کے استعمال کے ذریعے اور ٹکراؤ کے مقابل میں معیشت کو ترجیح دینے والوں کی جائیدادوں پر حقوق کو ساقط کر کے یا خریداری کے ذریعے اپنی براعظمی قلمرو میں توسیع کی۔ ریاست نے خانہ جنگی کے ذریعے جبری طور سے قومی یکجہتی مسلط کی، جس کے لیے ۷۴۵۲۴ کنفیڈریٹ فوجیوں کو قتل کیا گیا اور یونین کے ۱۴۰۴۱۴ سپاہی قربان کر دیے گئے۔

امریکی توسیع پسندی: گلیین ڈی ریچ کی تحقیق

اپنے آپ کو سمندر پار تک پھیلاتے ہوئے امریکی ریاست نے ہوائی (۱۸۹۸)، پورٹو ریکو، گوام، اور فلپائن (۱۸۹۸)، مشرقی ساموا (۱۸۹۹) اور بحرالکاہل کے جزائر (۱۹۴۵) پر تسلط حاصل کر لیا۔ فلپائن میں اس نے نوآبادیات کے خلاف برپا ہونے والی بغاوت (۱۸۹۸_۱۹۰۲) کو جبر و استبداد کے ذریعہ کچل دیا اور انضمام کی مخالفت کرنے والے متعدد مسلمانوں کا بے تحاشہ قتل عام کیا (۱۹۰۱_۱۹۱۳ء)۔ تنہائی پسند جاپان کو بحری طاقت کے استعمال کی دھمکی دے کر اسے بیرونی تجارت کے لیے کھول دیا (۱۸۵۳_۱۸۵۴)

گلیین ریچ: امریکہ کی جنگیں دوسری قوموں کے خلاف

اس ابھرتی ہوئی قوم نے جنگوں اور مداخلت کاریوں کے ذریعے اپنے مفادات کو آگے بڑھایا اور ان کا تحفظ کیا۔ امریکہ نے برطانیہ کے خلاف جنگ (۱۸۱۲_۱۴)، میکسیکو کے خلاف (۱۸۴۶_۴۸)، اسپین کے خلاف (۱۸۹۸)، جرمنی، آسٹریا، ہنگری، ترکی اور بلغاریہ کے خلاف (۱۹۱۷_۱۸)، جاپان، جرمنی اور اٹلی کے خلاف (۱۹۴۱_۴۵)، شمالی کوریا اور چین (۱۹۵۰_۵۳)، شمالی ویت نام (۱۹۶۱_۷۵)، اور عراق کے خلاف (۱۹۹۱) کی جنگیں لڑیں۔ مسلح مداخلتوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: بیجنگ (۱۹۰۰): پناما (۱۹۰۳)، روس (۱۹۱۸_۱۹)، نکاراگوا (۱۹۱۲_۲۵)، ہیٹی (۱۹۱۵_۳۴)، لبنان (۱۹۵۸)، ڈومینکن جمہوریہ (۱۹۶۵_۶۶) اور صومالیہ (۱۹۹۲)۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے گرینا ڈا میں (۱۹۸۳) اور پناما میں (۱۹۸۹) مداخلت کر کے

حکومتوں کو اقتدار سے معزول کر دیا اور مداخلت کی دھمکی دے کر ہیٹی (۱۹۹۲) میں حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ مداخلت یا حملوں کے ذریعے اس نے کمبوڈیا (۱۹۷۰) اور لاؤس (۱۹۷۱) میں امتناع کی راہ اختیار کی، لیبیا (۱۹۸۶)، افغانستان (۱۹۹۸)، اور سوڈان (۱۹۹۸) میں انتقام لینے کے لیے حملے کیے اور عراق (۱۹۹۳)، بوسنیا (۱۹۹۵) اور یوگوسلاویہ (۱۹۹۹) میں جنگی اور حربی مفادات آگے بڑھانے کا عزم ظاہر کرنے کے لیے حملے کیے۔

گلین پیج: امریکی ہلاکت خیزی کی صلاحیت

ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے دوسری عالمی جنگ کے بعد آدھی صدی کے دوران، سرمایہ داری مخالف ریاستوں، انقلابیوں اور دیگر دشمنوں پر دنیا بھر میں غلبہ پانے کے لیے ہلاکت آفرینی کی اپنی استعداد میں بے پناہ اضافہ کر لیا۔ انقلاب امریکہ کے زمانے میں ایک ہزار سے بھی کم پر مشتمل باقاعدہ مسلح افواج کی تعداد ۱۹۹۰ء کے عشرے میں پندرہ لاکھ مردوں اور خواتین تک پہنچ چکی تھی، ان کی پشت پر پنٹاگون (امریکی محکمۂ دفاع) کے ۲۳۰۰۰ منصوبہ ساز، ایک اختراعی سائنسی اشرافیہ، اور دنیا میں اسلحہ سازی کی جدید ترین صنعت موجود ہے۔ یہ سب اس طرح ممکن ہوا کہ ان اخراجات کے لیے ٹیکس دہندگان کے چوتھائی ٹریلین ڈالر ہر سال کانگریس اور صدر کی جانب سے منظور کیے جاتے تھے۔ ایک محتاط تخمینے کے مطابق ۹۶-۱۹۴۰ء کے دوران امریکہ کے صرف جوہری ہتھیاروں کے پروگرام پر قوم کو ۵ء۸۲۱ ٹریلین ڈالر خرچ کرنا پڑے ہیں (شوارز ۱۹۹۸ء)۔ ریاست ہائے متحدہ کے تصرف میں کسی بھی دوسرے ملک سے زیادہ سمندر پار اڈے ہیں، وہ غیر ممالک میں زیادہ فوجی طاقت منتقل کر چکا ہے، زیادہ فوجی اتحاد قائم کر چکا ہے اور دوسرے ملکوں کی نسبت بیرونی افواج کو زیادہ سے زیادہ تربیت اور اسلحہ سے لیس کر رہا ہے (یہ لوگ اس کے دشمنوں کے قاتل، بعض اوقات اس کے دوستوں کے قاتل اور یہاں تک کہ اس کے اپنے قوم کے قاتل ہیں)۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ دنیا کی مسابقتی، نفع بخش، اسلحہ منڈی میں ہتھیاروں کا سب سے بڑا فراہم کنندہ بن چکا ہے۔ انسان نے اب تک جس قدر ہلاکت آفریں ایجادات کی ہیں، اس حوالے سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اس صلاحیت کا مالک بن چکا ہے کہ وہ انتہائی تباہ کن ہتھیاروں کے ذریعے کرۂ ارض کی زمین، سمندر اور فضاء میں ہر جگہ قتل عام کر سکتا ہے۔

گلین ڈی پیج کی تحقیقات کا خلاصہ

ذیل میں ہم گلین پیج کی کتاب Politics of Non Killing میں گلین کی ان تحقیقات کو پیش کر رہے ہیں جو امریکی ریاست، امریکی سیاست، امریکی معیشت اور امریکی معاشرت سے متعلق ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی فوجی قوت کا دعویٰ

۱۹۹۰ء کے عشرے تک، جنگ کے ذریعے قائم ہونے والا ریاست ہائے متحدہ امریکہ ۱۷۷۶ء کے اعلانِ آزادی کے بعد سفر کرتے ہوئے اس دعوے تک پہنچ گیا ہے کہ وہ "دنیا کی واحد سب سے بڑی فوجی طاقت

اور دنیا کی قیادت کرنے والی معیشت ہے" (صدر ولیم جے کلنٹن، قوم سے خطاب، ۱۹/فروری ۱۹۹۳ء)۔ جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے چیئرمین، آرمی جنرل شکاش ولی کے الفاظ میں، ریاست ہائے متحدہ امریکہ "عالمی مفادات" کے ساتھ ایک "عالمی قوم" بن چکی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں جاپان پر جوہری بم کی فتح کی ۵۰ویں سالگرہ کا جشن مناتے ہوئے صدر امریکہ نے ہوائی میں جمع ہونے والے تینوں مسلح افواج کے جوانوں سے عہد کیا "آپ پوری دنیا میں ہمیشہ بہترین تربیت یافتہ اور بہترین اسلحے سے لیس لڑاکا قوت رہیں گے"۔ انھوں نے اعلان کیا "ہمیں کرۂ ارض پر سب سے زیادہ طاقتور رہنا ہے تاکہ ہم اپنے عہد میں تاریکی کی قوتوں کو شکست دے سکیں"۔

اس عزم کی عکاسی چیف آف اسٹاف جنرل رونالڈ فوگل مین نے ۱۹۹۶ء میں ایئر فورس اسٹریٹیجک پلاننگ کی صراحت کرتے ہوئے کی تھی، "ہمارا ہدف، تلاش کرنا، سخت نگرانی کرنا، تعاقب کرنا اور زمین پر حرکت کرنے والی ہر شے کو نشانے کی زد پر رکھنا ہے"۔ انھوں نے مزید انکشاف کیا، "اب ہم یہ کام انجام دے سکتے ہیں، لیکن بروقت نہیں" (وقوعہ کے وقت نہیں)۔ (ہیری ٹیج فاؤنڈیشن، واشنگٹن، ڈی سی۔ میں ۱۳/دسمبر ۱۹۹۶ء میں خطاب)۔

اکیسویں صدی: امریکی صدی

بیسویں صدی جب اختتام پر پہنچ رہی تھی تو امریکی رہنماؤں کی روایتی خواہش تھی کہ اسے "امریکی صدی" سے تعبیر کریں اور اس عزم کا اظہار کریں کہ تیسرے ہزارے کی اولین صدی کو "دوسری امریکی صدی" بنایا جائے گا۔ اس نوع کے تشدد کے زیر اثر فتح مندی کی روایات کے درمیان ہلاکت گریز ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بارے میں سوچنا ناقابلِ تصور ہے۔ قتلِ عام اور قتلِ عام کی دھمکی کے ذریعے قومی آزادی کی بناء ڈالی گئی، غلامی کا خاتمہ کیا گیا، نازی ازم اور فاشزم کو شکست دی گئی، عالمگیر تباہی کا خاتمہ کیا گیا، ایٹم بم کا شکار ہونے والے جاپان میں زندگیاں بچائی گئیں، عالمی سطح پر کمیونسٹوں کی توسیع پسندی کو روکا گیا، سوویت ایمپائر کے انہدام کے اسباب پیدا کیے گئے اور اب وہ اس دعوے پر پورا اترتا نظر آتا ہے کہ اکیسویں صدی کے پورے عرصے کے دوران وہ جمہوری آزادی اور سرمایہ دارانہ معیشتوں کے نفوذ کے لیے رہنما قوت بن جائے گا۔

ایسے امریکیوں کے لیے جو سینئر پروفیسر ہوں یا علم سیاسیات کے مبتدی طلباء، اس بات کو ماننے کے لیے نہ فلسفے کی ضرورت ہے اور نہ قومی سیاسی روایت کی کہ ایک ہلاکت گریز سماج کا قیام ناممکن ہے۔ روزمرہ زندگی میں ہونے والے قتال اس بات کی تصدیق کر دیتے ہیں۔

امریکہ میں اندرونی ہلاکتوں کی تعداد کا موازنہ

اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں ہر سال ۱۵ ہزار سے زائد امریکی ہلاک کر دیے جاتے ہیں (۱۹۹۹ء میں ۱۵۵۳۳، فی ایک لاکھ پر ۵ء۷ افراد، ۱۹۰۰ میں یہ شرح ۱ء۲ تھی)۔ قتل کی جن وارداتوں کا اندراج کیا جاتا ہے، ان میں پولیس یا شہریوں کی جانب سے کیے جانے والے "جائز قتل" کو شامل نہیں کیا جاتا (۱۹۹۹ء میں ان کی تعداد

۲۹۴ اور ۱۸۸ تھی) دوسری عالمی جنگ کے بعد سے قتل ہونے والوں کی تعداد (اندازے کے مطابق لگ بھگ ۷۵۰۰۰۰) قوم کی تمام اہم جنگوں کے دوران ہونے والی ہلاکتوں (۶۵۰۰۵۳) سے آگے نکل گئی تھی۔ "اشتعال سے بھرپور حملے" (۱۹۹۹ء میں ۹۱۶۳۸۳،۱ء۳۳۶ فی ایک لاکھ)، ایسے ہتھیاروں کے ساتھ حملے جو ہلاک کرنے یا مہلک زخم پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، (فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن ۲۰۰۰ء: ۱۳، ۲۳، ۳۲)۔ امریکی سول سوسائٹی میں قتل کے مقابلے میں خودکشیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے (۱۹۹۵ء میں ۳۱۲۸۴: ۹ء۱۱ فی ایک لاکھ)۔ اقدام خودکشی کی تعداد ۲۵ گنا زیادہ ہے۔ اندازوں کے مطابق سالانہ ۱۰ لاکھ سے زیادہ اسقاط کرائے جاتے ہیں۔

امریکی شہریوں کے قتل کے طریقے

امریکی قتل کرنے کے یہ طریقے استعمال کرتے ہیں: شدت سے ضرب لگانا، سر قلم کرنا، بم سے اڑانا، آگ میں جلانا، غرقاب کرنا، پھانسی پر لٹکانا، دھکا دینا، اور زہر دینا، خنجر کے وار کرنا، گلا گھونٹنا، گلے میں پھندا ڈالنا اور زیادہ تر گولی مار دینا (۱۹۹۹ء میں ۶۴ء۵ فیصد)۔ قتل کی نوعیت پہلے سے منصوبہ بندی، فوری اشتعال، پیشہ ورانہ اور حادثاتی واقعہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ازدواجی زیادتی، بچوں سے بدفعلی، بڑوں سے زیادتی، لفظی تکرار، شرابیوں کا فساد، منشیات کی تجارت میں دھوکہ بازی، سماج دشمن گروہوں کے جھگڑے، قماربازی، رقابت، اغوا، جسم فروشی، زنا بالجبر، ڈاکہ زنی، جرم کی پردہ پوشی اور "آسمانی" یا "شیطانی" فرمان کے تحت ہونے والے قتل بھی شامل ہیں۔ حقیقی طور پر کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے: گھر، اسکول، گلیاں، شاہراہیں، کام اور عبادت کی جگہیں، جیل خانے، پارک، قصبے، شہر، ویرانے اور قومی حکومت کی مرکزی عمارت۔ موت کا نشانہ بننے والوں کی انفرادی طور پر یکے بعد دیگرے اجتماعی طور پر اور بے وجہ قتل کر دیا جاتا ہے، زیادہ تر مرد (۱۹۹۹ء میں ۷۶ فیصد)۔ لیکن ۸۵-۱۹۷۶ء کے دوران ازدواجی قتل کے واقعات میں بیویوں کی تعداد (۹۴۸۰) کے مقابلے میں شوہروں کی تعداد کم تھی (۷۱۱۵) (مری اور سالٹر مان ۱۹۸۹ء)۔

امریکہ: خوف زدہ انسانوں کی سرزمین

قاتلوں میں تنہا افراد، جوڑے، گروہ، فرقہ پرست، جرائم پیشہ گروہوں کی انجمنیں، دہشت گرد اور جب قانون کا نفاذ کر رہے ہوں تو اس کام میں ریاست کے ملازم بھی شامل ہوتے ہیں۔ مشہور قاتلوں میں غالب اکثریت مردوں کی ہے (۱۹۹۹ء میں ۱۰۴۳۶ خواتین کے مقابلے میں ۹۱۴۰ مرد)، اور ان میں نوجوانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں لگائے جانے والے تخمینے کے مطابق "ایک امریکی کی زندگی میں ایک موقع ایسا ہوتا ہے کہ وہ قتل کا شکار ہو جائے، یہ تناسب سفید فاموں میں ۲۴۰ میں سے ایک اور سیاہ فاموں اور دیگر اقلیتوں میں ۴۷ میں سے ایک ہے" (روزن برگ اینڈ مری ۱۹۸۶ء: ۳۷۶)۔ ۲۷/جنوری ۱۹۹۸ء کو صدر کلنٹن کے یونین ایڈریس کے جواب میں سینیٹ میں ری پبلکن اکثریتی رہنما ٹرنٹ لاٹ نے قومی ٹیلی ویژن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا

''تشدد پر مبنی جرائم ہمارے ملک کو آزاد انسانوں کی سرزمین کے بجائے خوفزدہ انسانوں کی سرزمین بنا رہے ہیں''۔

امریکی عوام: وحشت گردی کا عجیب مزاج

نیوز میڈیا روزانہ امریکی ہلاکت آفرینی کی تصدیق کرتا ہے۔ ایک بیٹی اپنی ماں کا سر قلم کر کے پولیس اسٹیشن تک جاتی ہے اور اسے فٹ پاتھ پر پھینک دیتی ہے۔ ایک ماں اپنے دو بیٹوں کو غرقاب کر دیتی ہے، دو بیٹے اپنے والدین کو قتل کر دیتے ہیں۔ ایک سیریل کلر طوائفوں کو اپنا نشانہ بناتا ہے، ایک ہم جنس پرست بدکاری کی ترغیب دیتا ہے، اپنے نوجوان شکار کے اعضا کی قطع برید کرتا ہے، ان کے بدن کے ٹکڑے ریفریجریٹر میں محفوظ کر لیتا ہے اور پھر اس گوشت کو کھاتا ہے۔ چھپ کر گولی چلانے والا ایک شخص یونیورسٹی میں پندرہ افراد کو قتل کر دیتا ہے۔ ایک دیہی مڈل اسکول میں رائفلوں سے مسلح دو لڑکے اپنی چار ہم جماعت لڑکیوں اور ایک ٹیچر کو ہلاک، ایک دوسرے ٹیچر اور نو مزید ہم جماعتوں کو زخمی کر دیتے ہیں۔ کولمبائن ہائی اسکول، لٹل ٹن، کولوراڈو میں بھاری ہتھیاروں سے مسلح لڑکوں نے ۱۳ ہم جماعتوں کو ہلاک اور ۲۸ کو زخمی کیا، اور پھر خودکشی کر لی۔ ۹۹۔۱۹۹۶ء کے دوران ۱۱ سے ۱۸ کی عمر کے اسکول کے طلباء نے ۲۷ ساتھیوں، طلباء، دو ٹیچروں، تین والدین کو ہلاک کیا اور ۶۵ دیگر کو زخمی کیا۔ خودکار ہتھیار سے ایک شخص شہری اسکول کے بچوں کا ان کے کھیل کے میدان میں قتل عام کر دیتا ہے۔ ویتنام جنگ میں حصہ لینے والا ایک شخص فاسٹ فوڈ فیملی ریسٹورنٹ میں موجود گاہکوں پر مشین گن سے حملہ کر کے ۲۰ کو ہلاک اور ۱۳ کو زخمی کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دو بدو فوجی لڑائی کا ماہر ایک دوسرا شخص چرچ میں گھس کر عبادت میں مصروف لوگوں کا قتل عام کرتا ہے، ساتھ ہی بلند آواز میں کہتا جاتا ہے ''میں اس سے پیشتر ایک ہزار قتل کر چکا ہوں اور ایک ہزار مزید کروں گا''

امریکی شہری: بیس کروڑ بندوقیں سات کروڑ رائفلیں، اسی لاکھ دو رمار گنیں

ہابس کی خوفزدہ کرنے والی غارت گری کے خلاف شہریوں کی صف آرائی اور ویبر کے نظریات پر مبنی ریاست کے بارے میں لاک جیسی بے اعتمادی میں مبتلا مسلح افراد کے پاس لگ بھگ بیس کروڑ بندوقیں ...... کم از کم سات کروڑ رائفلیں، ساڑھے چھ کروڑ ہینڈ گنیں، چار کروڑ نوے لاکھ شاٹ گنیں اور اسی لاکھ دیگر دو رمار گنیں موجود ہیں (کک اینڈ لڈوگ ۱۹۹۷ء) ہتھیاروں کی تجارت ...... ان کے کارخانے، ان کی فروخت، درآمد اور برآمد ...... ہزارہا قانونی اور غیر قانونی ڈیلروں کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ چار کروڑ چالیس لاکھ بالغ امریکی شہری آتشیں اسلحے کے مالک ہیں، ایک تخمینے کے مطابق یہ اسلحہ کم از کم ایک تہائی امریکی خاندانوں میں موجود ہے۔ بیشتر بچے ان کو تلاش کر لینے کی اہلیت رکھتے ہیں جب کہ والدین کے خیال میں وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

امریکی بچے: ڈیڑھ لاکھ پستولیں اسکول لے جاتے ہیں:

قوم کی خاتون اول، ہیلری کلنٹن، چلڈرنز ڈیفنس فنڈ کے تخمینوں پر مبنی حقائق بیان کرتی ہیں کہ روزانہ

ایک لاکھ پینتیس ہزار بچے پستول اور دیگر ہتھیار اسکول لے کر جاتے ہیں (۲۲/فروری ۱۹۹۶ء کو ناشوا، نیو ہیمپ شائر میں خطاب)۔ کہا جاتا ہے کہ شہری اپنی حفاظت، شکار، تفریح اور حکومتی جبر کے خلاف مزاحمت کے لیے اسلحہ رکھنے کے حق کا دعویٰ کرتے ہیں جو ریاست ہائے متحدہ امریکا کے آئین میں ۱۷۹۱ء کی دوسری ترمیم کے ذریعے ناقابلِ تقسیم حق کے طور پر ودیعت کیا گیا ہے "ایک آزاد ریاست کی سلامتی کے لیے ایک بہترین منظم ملیشیا کا ہونا ضروری ہے چنانچہ عوام کا اسلحہ خریدنے اور اس کے استعمال کا حق فسخ نہیں کیا جا سکتا"۔

امریکہ: سزائے موت کے نفاذ کا مطالبہ:

ریاستی یونٹوں اور ریاست ہائے متحدہ کی وفاقی مسلح افواج کے ذریعے بوقتِ ضرورت قوت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ مختلف جرائم میں دس لاکھ اسی ہزار سے زیادہ سزا یافتہ قیدی ہیں، ان میں ۱۹۹۹ء میں سزائے موت کے منتظر ۳۵۲۷ مجرم بھی شامل ہیں (بیورو آف جسٹس ۲۰۰۰ بی: ۱۲۰۰۰ اے)۔ وفاقی جرائم کے لیے ۵۰ ریاستوں میں سے ۳۸ میں سزائے موت بدستور نافذ ہے۔ ۱۹۷۷ تا ۱۹۹۹ء کے دوران مجموعی طور پر ۵۹۸ لوگوں کو موت کی سزا دی گئی۔ بیسویں صدی کے خاتمے پر بڑھتے ہوئے جرائم کے خوف اور بظاہر بے لگام تشدد کے درمیان ایسی تشویش ناک آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ سزائے موت میں توسیع یا اس کا دوبارہ نفاذ کیا جائے سڑکوں پر مزید پولیس والوں کو تعینات کیا جائے، زیادہ لمبی مدت کی سزائے قید نافذ کی جائے اور مزید جیل خانے تعمیر کیے جائیں۔

تشدد کی تربیت:

وڈیو اور کمپیوٹر گیمز تشدد کے اصل مراکز

امریکہ میں تشدد کی تربیت سماجی طور پر حاصل ہوتی ہے اور ثقافتی طور پر اس کو کمک پہنچتی ہے۔ رسمی اور غیر رسمی طور پر، قانونی اور غیر قانونی طور پر لوگوں کو سکھایا جاتا ہے کہ قتل کس طرح کیا جائے۔ دو کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ سابق فوجی ہلاکت آفرینی کے لیے پیشہ ورانہ تربیت حاصل کرنے والے گریجویٹ کہے جا سکتے ہیں۔ (۲۲۸۰۰۰۰۰، ۱۹۹۹ء میں) تقریباً ۴ بالغ مردوں میں ایک سابق فوجی ہے۔ بہت سے جونیئر ہائی اسکولوں، ہائی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ابتدائی فوجی تربیت فراہم کی جاتی ہے۔ کاروباری حلقے خود حفاظتی میں قتل کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ نجی ملیشیاؤں کو دو بدو لڑائی کی تربیت دی جاتی ہے سڑکوں پر پھرنے والے غنڈوں کے گروہ قتل کرنے کے لیے معاشرتی میلان پیدا کرتے ہیں جیل خانے غارت گری کے کالجوں کے طور پر خدمات ادا کرتے ہیں۔ کرائے کے فوجیوں کے میگزین لڑائی کے فنی پہلو سکھاتے ہیں، ہتھیار فروخت کرتے ہیں اور کرائے پر دستیاب قاتلوں کے بارے میں اشتہارات شائع کرتے ہیں۔ وڈیو اور کمپیوٹر گیمز، نوجوان کھلاڑیوں کو سڑکوں کی لڑائی سے لے کر زمینی، ہوائی، بحری اور خلائی جنگ میں قتل کرنے کی نقالی کرنے میں مصروف رکھتے ہیں، جس میں

وسیع پیمانے پر ہلاکت آفرین فنی پہلوؤں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ "virtual reality" کا کاروبار کرنے والے، ''ایڈرینالائن کی سطح بڑھانے''، ''قتل کرو یا قتل ہو جاؤ پر مبنی تفریحی تجربات کی تجارت کرتے ہیں۔ ایک وقت کالج کیمپسوں میں یہ رو چلتی ہے کہ ساتھی طلباء کو ''قتل کرنے'' کا کھیل کھیلا جائے۔ حقیقی اور نقلی قتل، بچپن میں کھلونا ہتھیاروں سے کھیلنے کی فطری توسیع معلوم ہوتے ہیں۔

امریکی کارٹون فلم ٹی وی پروگرام: ہلاکت آفرینی کے ادارے

ہلاکت آفرینی کے لیے نیابتی تربیت اور انسانی زندگی کی اقدار سے بے حسی مواصلاتی ذرائع سے فراہم کی جاتی ہیں۔ کارٹون، فلموں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگراموں، گیت، کتابوں اور تجارتی اشتہارات کے خالق استاد ہیں۔ بچپن سے بلوغت تک کے عرصے میں ذہن پر تشدد کی ہزارہا شبیہیں اپنا عکس چھوڑ چکی ہیں، ڈرامائی انداز میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہیرو اور ولن کے ذریعہ لوگوں، جائیدادوں، حیوانوں اور فطرت کو کس کس طرح تباہ کیا جا سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ کشت و خون اور بربریت کی تصویریں، تیزی سے جنسی مناظر سے متعلق ہو جاتی ہیں۔ خاص طور سے پر تشدد فلموں کے اشتہارات میں جن کے پس پشت ہلاکت آفرینی کے لیے تحت الشعوری رغبت پیدا کی جاتی ہے۔

پیشہ ور محبّ وطن قاتلوں کی ضرورت ہے:

فوجی بھرتی کے اشتہارات کا حاصل کیا ہے؟

تاریخ میں کسی قوم کے ذہنوں پر اتنی زیادہ ہلاکت خیز تصویروں کے نقش ثبت نہیں ہوئے ہوں گے۔ کمانڈوز اور قاتلوں کی تربیت کرتے ہوئے قتل کرنے میں جھجک پر قابو پانے کے لیے ایک آزمودہ فوجی تکنیک ان جبری طور پر گھناؤنے مظالم کی فلمیں دیکھنے پر مجبور کرنا ہے......سر کو شکنجے میں جکڑ کر آنکھوں کو بند ہونے سے روکے رکھنا (واٹسن ۱۹۷۸ء: ۵۱ـ۴۳۸)...... یہ ایسا ہی ہے جیسے پوری قوم کو زندگی کے احترام سے عاری کیا جا رہا ہے تا کہ وہ قتل کو غیر جذباتی طور پر قبول کر لے۔ جج حضرات کا کہنا ہے کہ نابالغ قاتلوں میں بتدریج انسانی زندگی کے لیے احترام ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ سول سوسائٹی کے لیے کتنا ہی نقصان دہ ہو لیکن پر تشدد ذرائع ابلاغ کا پھیلاؤ ایک ایسی ریاست کے لیے فائدہ مند ہے جسے پیشہ ور محبّ وطن قاتلوں کی ضرورت ہے۔ فوجی بھرتی کے دس لاکھ ڈالر کے ایک اشتہار میں اس کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے اور اسے سپر باؤل امریکی فٹ بال کے کھیل کی براہ راست ٹیلی ویژن نشریات پر دکھایا جاتا ہے۔ کروڑوں ناظرین دیکھتے ہیں کہ ایک ویڈیو گیم میں سے شمشیر برہنہ لہراتا ہوا ازمنۂ وسطیٰ کا ایک سورما چشم زدن میں تلوار کی نوک سے سلامی پیش کرتا ہوا ریاست ہائے متحدہ کا آج ایک میرین افسر بن جاتا ہے۔

امریکہ: روزمرہ کی گفتگو میں تشدد کے عناصر

زبان، ہلاکت آفرینی کو راسخ کرتی ہے اور اسے تقویت پہنچاتی ہے اور ایسا وہ فطری پن اور

ناگزیریت کے احساس کے ذریعے کرتی ہے۔ امریکی معیشت کی بنیاد آزاد انٹرپرائز کیپٹل ازم، پر قائم ہے۔ امریکی روزمرہ کی زبان میں بولتے ہیں "اسٹاک مارکیٹ میں قتلِ عام کرنا"، وال اسٹریٹ کی ایک کہاوت ہے "گلیوں میں جب خون بہہ رہا ہو تو آپ خریداری کرتے ہیں"، اور تجارتی ادارے "قیمتوں کی جنگ" میں مقابلہ کرتے ہیں۔ امریکی سیاست آزاد انتخابی جمہوریت پر مبنی ہے۔ انتخابی مہم چلانے والے کارکنوں کو "فوجی دستے" یا "پیدل سپاہی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مجالسِ قانون ساز میں بل "قتل" کر دیے جاتے ہیں، اور غربت، جرائم، منشیات اور دیگر مسائل پر قوم "جنگ جاری رکھتی ہے"۔ بیس بال امریکہ کا قومی کھیل ہے۔ ناخوش اور ناراض پرستار اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے نعرہ لگاتے ہیں کہ "ایمپائر کو قتل کرو!" کھیل پر رواں تبصرہ کرنے والے مبصر فٹ بال کی مضبوط ٹیموں کو "قاتل" کہہ کر پکارتے ہیں، کھلاڑیوں کو "جنگی جھتیار" کہا جاتا ہے، گیند ایک کھلاڑی سے دوسرے کھلاڑی کے ہاتھ میں منتقل ہوتے ہوئے "لانگ بم" کہلاتی ہے، ناکام ٹیموں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ "قاتلانہ جبلت سے محروم" تھیں۔ امن کے شہزادے کی پرستش کرتے ہوئے، مذہبی آزادی پر غرور میں مبتلا امریکی نغمہ گاتے ہیں"، "عیسائی فوجیو آگے بڑھو" اور عیسائی صلیبی جنگوں اور جہادی جذبے کی عکاسی کرتے ہوئے، "صلیبی سپاہیوں" کے طور پر، طائفہ بنا کر "زینۂ یعقوب" پر چڑھتے ہیں۔ زندگی میں فارغ لمحوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے امریکی اسے "وقت کا قتل" کہتے ہیں۔

امریکی: ہلاکت آفرینی کی زبان کیوں بولتے ہیں؟

نسل پرستی اور جنس پرستی کی زبان کے نقصان دہ اثرات کی بڑھتی ہوئی آگہی کے باوجود، امریکی فراٹے سے ہلاکت آفرینی کی زبان بولتے رہتے ہیں۔ امریکی انگلش کے لسانی "اسلحہ خانے" میں ایسی اصطلاحات پائی جاتی ہیں جن میں معلوم تاریخ کے تمام اسلحے کا تذکرہ محفوظ ہے، ان کے استعمال کے طریقے اور ان کے اثرات سامنے آجاتے ہیں۔ غداری "پشت میں خنجر پیوست کرنا" ہے، بجٹ پر کلہاڑی چلائی جاتی ہے اور کسی معاملے میں کوشش کا مطلب ہے "نشانے پر گولی چلانا"، نظریات کو "تارپیڈو" کر دیا جاتا ہے، حزبِ اختلاف کے لیے "طیارہ شکن گولہ باری" کی اصطلاح رائج ہے، اور عمل کے نتائج کو "صف سے باہر نکل جانا" کہا جاتا ہے۔ وکلاء "کرائے کی بندوقیں" ہیں۔ کسی خوبصورت فلم اسٹار کو اصطلاحاً "گورے رنگ اور سنہرے بالوں والا بم" کہا جاتا ہے۔

دہشت گردی کو چھپانے کے لیے خوبصورت لفظ
ہیروشیما پر گرانے والا پہلے بم کا نام "ننھا بچہ" تھا

دوسری جانب، حقیقی قتل کو رواجاً خوش گفتاری کا لبادہ پہنا دیا جاتا ہے۔ دنیا کا پہلا ایٹم بم بی۔۲۹ بمبار طیارے سے ہیروشیما پر گرایا جاتا ہے اور اسے "ننھا بچہ" کے نام سے پکارا جاتا ہے، طیارے کو پائلٹ کی ماں

کے حوالے سے "اینولا گے" (Enola Gay) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلا پلوٹونیم بم "موٹا آدمی" ناگاساکی پر "بوک کی کار" کے ذریعے گرایا جاتا ہے۔ شہری آبادی کے بے تحاشہ قتل عام کی صلاحیت کے حامل بین براعظمی جوہری میزائلوں کو "صلح جو" کہا جاتا ہے۔ جنگ وجدل کی زبان کی جگہ کھیلوں کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ قتل عام کے لیے تیاری کی فوجی مشقوں کو "کھیل" کہا جاتا ہے۔ دوران جنگ شہری آبادی یا خود اپنے فوجیوں کے قتل کو "ضمنی ہرجانہ" Collateral Damage کہا جاتا ہے۔ سابق صدر رونالڈ ریگن نے اس بارے میں یوں اظہار خیال کیا تھا "جدید تاریخ میں امریکہ جنگ کے لیے کم سے کم تیار، انتہائی پر امن ملک ہے"۔ (پی بی ایس ۱۹۹۳ء)۔

امریکہ: ہلاکت آفرینی کے عناصر اور وجوہات:

امریکہ میں ہلاکت آفرینی کے عناصر باقاعدگی سے امریکی شہریوں کے درمیان اور خود اپنے اور ریاستی ایجنٹوں کے درمیان اجتماعی تشدد کا ارتکاب کرتے ہیں ۱۹۹۲ء ایک سیاہ فام باشندے کے خلاف پولیس کی بربریت کا الزام رد کرتے ہوئے جب عدالت نے پولیس اراکین کو بری کیا تو اس کے ردعمل میں ہونے والی فائرنگ، لوٹ مار اور آتش زنی کے دوران لاس اینجلس کے جنوب مرکزی علاقے میں ۱۵۲ افراد قتل ہوئے، ۲۰۰۰ زخمی ہوئے، اور ۸۰۰۰ گرفتار کیے گئے۔ دو ماہ کے اندر اردگرد کے علاقوں کے خوف زدہ شہریوں کو کم ازکم ۷۰۰۰۰ بندوقیں فروخت کی گئیں۔ یہ خونریزی واٹس (۱۹۶۵ء میں ۳۴)، نیوارک (۱۹۶۷ء میں ۲۶) اور ڈیٹرائٹ (۱۹۶۷ء میں ۴۳) میں ہونے والے اسی نوع کے قتال کی یاد دلاتی ہے، اس کے علاوہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں غلاموں کی بغاوت کے دوران جانوں کے زیاں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں ڈیٹرائٹ میں امن و امان بحال کرنے کی کارروائی میں ۴۷۰۰ فوجی چھاتہ برداروں، ۱۶۰۰ قومی گارڈ کے سپاہیوں، اور ریاست مشی گن کے ۳۶۰ گھڑ سوار سپاہیوں نے حصہ لیا۔ (لاک ۱۹۶۹ء)

امریکی سیاسی رہنما، ہابس کی پیروی کرتے ہوئے، اس رائے کا اظہار کرنے میں دیر نہیں لگاتے کہ "باہر ہر طرف جنگل ہے!" اور ختم ہو جانے والی سلطنت رومہ کے یہ شیدائی اور متوالے یاد دلاتے رہتے ہیں، "اگر امن چاہتے ہو، جنگ کی تیاری کرو"۔

امریکی سیاسی علماء: ہلاک گریز سماج کے امکان کو مسترد کرتے ہیں

یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ سیاسیات کے امریکی سیاسی علماء اور ان کے شاگرد ہلاکت گریز سماج کے امکان کو پرزور طور پر مسترد کر دیتے ہیں۔ اگر کسی یونیورسٹی کے تعارفی کورس سے لے کر گریجویٹ کلاس سیمینار میں ہلاکت گریز سماج کا سوال اٹھایا جائے تو انسانی فطرت، معاشی وسائل کی کمیابی اور جنسی اور دیگر حملوں کے خلاف دفاع کی ضرورت کے بنیادی اعتراضات روایتی طور پر سامنے آتے ہیں۔ گو کہ جوابات ثقافتی بنیادوں پر دیے

جاتے ہیں لیکن ان میں بلا کا تنوع پایا جاتا ہے اور ان کی شاخیں لامحدود ہوتی ہیں۔ ہر بار جب سوال اٹھایا جاتا ہے تو کوئی نئی بات سامنے آسکتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ نوع انسانی غلبے کی جستجو میں رہتی ہے، وہ خودغرض، حاسد، ظالم اور جنونی ہے، خود حفاظتی میں قتل کرنا حیوی رجحان ہے اور ایک ناقابل تقسیم انسانی حق ہے۔ انسان معاشی طور پر حریص اور مقابلے پر آمادہ رہتے ہیں، سماجی اختلافات اور متصادم مفادات قتل کو ناگزیر بنادیتے ہیں۔

سزا کے طور پر جرائم پیشہ افراد کو ہلاک کرنا سماج کو فائدہ پہنچاتا ہے اور دوسروں کو ایسے اقدام سے روکتا ہے۔ ہتھیاروں کی ایجاد کو ختم نہیں کیا جاسکتا، مہلک ٹیکنالوجی ہمیشہ موجود رہے گی۔ تاریخ میں ہلاکت گریز کسی سماج کی کوئی مثال نہیں ملتی، یہ قطعاً ناقابل تصور ہے۔

کولمبیا: امریکی دانشوروں کے برعکس رویہ

کولمبیا کے شہر مینی زالس میں فروری ۲۰۰۰ء کے دوران تقریباً ۲۰۰ کمیونٹی رہنماؤں کے اجلاس میں شریک لوگوں سے جب یہ سوال کیا گیا، ”کیا ایک ہلاکت گریز سماج کا وجود میں آنا ممکن ہے؟“ تو حیرت انگیز طور پر نفی میں ایک ہاتھ بھی نہیں اٹھا۔ بعد ازاں اس مفروضے کی حمایت میں تمام ہاتھ ایک ساتھ اٹھ گئے۔

کوریا اور کولمبیا میں یہ مثبت جوابات قابل توجہ ہیں، یہ وہ سماج ہیں جنھیں بدترین تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈیموکریٹک پیپلز ری پبلک آف کوریا کی تشدد آمیز سیاسی روایات جزوی طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی برابری کرتی ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل ڈیو گراس مین کی وضاحت کے مطابق ”جنگ ایک ایسا ماحول ہے جو کچھ ہی عرصے میں اس میں حصہ لینے والے ۹۸ فیصد افراد کو ذہنی طور پر کمزور کر دیتا ہے، وہ لوگ جو جنگ میں پاگل نہیں ہوئے وہ بظاہر میدانِ جنگ میں آنے سے پہلے ہی پاگل پن ...... جارحانہ خللِ دماغی ...... میں مبتلا رہ چکے ہوتے ہیں۔ (گراس مین ۱۹۹۵ء:۵۰) یہ بات روایتی علم سیاسیات کے مفروضوں کے برعکس ہے کہ انسان فطری طور پر پیدائشی قاتل ہوتے ہیں، دراصل فوجی تربیت کا بنیادی ہدف ’ایک عام فرد کے اندر قتل کرنے کے خلاف گہری مزاحمت پر قابو پانا ہوتا ہے“۔ (۲۹۵)

انسانی کنبہ: محبت کا حصار نفرت کے خلاف دیوار

انسانی کنبہ قتل نہ کرنے کی صلاحیتوں کے مزید ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اگر بنی نوع انسان فطری طور پر قاتل ہوتے، اگر صرف نصف انسانیت ناگزیر طور پر قاتلانہ رجحان کی حامل ہوتی تو اپنی مختلف شکلوں میں خاندان کا وجود باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ باپ ماؤں کو قتل کر ڈالتے، مائیں باپوں کو، والدین بچوں کو اور بچے والدین کو۔ ایسے واقعات ہوتے تو ہیں لیکن ان واقعات کی بناء پر ہلاکت آفرینی کا ایک ایسا فطری قانون قائم نہیں ہوتا جو نوع انسانی کی تقدیر کے فیصلے کرسکے۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت عرصہ پہلے دنیا کی آبادی عدم آباد کا رخ کر چکی ہوتی۔ اس کے

برخلاف نا قابلِ بیان حد تک مادی محرومیوں اور نہایت تذلیل آمیز رویوں کے باوجود انسانی کنبہ مسلسل زندگی کی تخلیق اور اس کو برقرار رکھنے میں بے مثال پیمانے پر مصروف رہا ہے۔

مجموعی انسانی زندگیوں کا ۱۰ لاکھ قبل مسیح سے سنہ ۲۰۰۰ء بعد مسیح کا تخمینہ تقریباً اکیانوے ارب ۹۱۱۰۰۰۰۰۰۰۰ لوگوں کا ہے (ویکس ۱۹۹۶ء: ۳۷ ساتھ کے فٹز ۱۹۶۶ء کو شامل کرتے ہوئے، جیسا کہ رمزے نے ۱۹۹۹ء میں دوبارہ حساب لگایا) رڈولف رومیل نے جنگوں اور Democide کی ہلاکتوں کا جو اندازہ لگایا ہے، اسے پچاس کروڑ تک بڑھا دیں اور غلط طور پر فرض کرلیں کہ ہلاک ہونے والا ہر شخص واحد قاتل کے ہاتھوں ہلاک ہوا اور پھر قتل عمد کا ارتکاب کرنے والوں کے اعداد و شمار جاننے کے لیے اسے من مانے طور پر چھ سے ضرب دے دیں تو ۱۰۰۰۰ سال قبل مسیح سے اب تک تقریباً ۳۰۰۰۰۰۰۰۰۰ قاتل پیدا ہوئے۔ (۱۰ لاکھ قبل مسیح کے اعداد دستیاب نہیں ہیں)۔

جدید اشتراکی تصور کے مطابق مزدور جب ایک دوسرے کو قتل کرنے کی حمایت سے انکار کریں تو جنگیں ختم ہو جائیں گی۔ (پہلی عالمی جنگ کی مخالفت میں لکھا جانے والا ایک منشور اعلان کرتا ہے۔)

چوہے اور بلی تعاون کرسکتے ہیں تو پھر انسان؟

کیا عالمی طاقتیں اور کمزور ملکوں میں مفاہمت ممکن نہیں؟

ٹولین یونیورسٹی کے ماہر نفسیات لوہ سنگ تسائی (۱۹۶۳ء) مظاہرہ کر چکے ہیں کہ چوہے کھانے والی بلی اور ایک گندی نالی کے چوہے کو پر امن طور پر ایک ہی برتن میں کھانا کھانے کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ یہ پر اثر کرنے، سماجی آموزش کی آمیزش کا طریقہ کار تھا۔ شروع میں شیشے کی دیوار کے ذریعے دونوں کو علیحدہ رکھا گیا جہاں دونوں جانوروں نے سیکھا کہ وہ خوراک کی ایک مشترک پلیٹ میں خوراک پہنچانے والے آلے کو چلانے کے لیے یکے بعد دیگرے متوازی لیوروں کا دبانا پڑے گا۔ سات ہزار تربیتی نشستوں کے بعد یہ ممکن ہو سکا کہ شیشے کی درمیانی رکاوٹ کو ہٹا دیا جائے اور چوہا، بلی کا تر نوالہ نہ بنے۔ تسائی نتیجہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: سائنس کی تاریخ میں ہم نے پہلی بار نہایت تجربات کے ذریعے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ بلیاں اور چوہے...... نام نہاد فطری دشمن...... تعاون کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ اس طرح کی دریافت نفسیات میں اس روایتی عقیدے کو مسترد کر دیتی ہے کہ حیوانی فطرت میں ایک نا قابلِ تنسیخ جھگڑالو جبلت موجود ہے جو لڑائی یا جنگوں کو ناگزیر بنا دیتی ہے۔

تسائی نے کہا کہ "بہت سوں کا خیال ہے کہ ہماری تحقیق نے امنِ عالم کے نظریاتی امکان کے لیے اساسی حیاتی بنیاد کا ابتدائی پتھر رکھ دیا ہے"۔

نفسیاتی معالج جیروم جے فرینک تعاون کی تجویز یہ ہے کہ ہلاکت خیز مخاصموں پر قابو پانے کے لیے مشترک فائدے منضبط ہونے چاہئیں۔ (فرینک: ۲۔ ۲۶۱: ۱۹۶۰ء، ۵۔ ۲۰۴: ۱۹۹۳ء)

انسانی حیوانی طور پر جنگجو نہیں اس کی فطرت بہترین ہے:

ماہرین کے ایک بین الاقوامی گروپ نے ۱۶رمئی ۱۹۸۶ء کو سیوائل میں ''تشدد پر موقف'' کا تاریخی اعلان جاری کیا جس سے انسان کی ہلاکت گریز صلاحیتوں پر اعتماد کے لیے اہم سائنسی بنیاد فراہم ہوئی ہے۔ انھوں نے اعلان کیا:

''یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ ہم نے اپنے حیوانی اجداد سے جنگ کرنے کا رویہ ورثے میں پایا ہے...... یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ جنگ یا کوئی دوسرا پر تشدد رجحان ہماری انسانی فطرت میں جینیاتی طور پر داخل کیا گیا ہے...... یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ انسانی ارتقاء کے عمل میں رجحانات کی دیگر قسموں کے مقابلے میں جارحانہ رجحان کو زیادہ اختیار کیا گیا ہے...... یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ انسان ایک ''پر تشدد ذہن'' کا مالک ہے...... یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ جنگ کا باعث ''جبلت'' یا کوئی واحد تحریک ہے۔

انسان حیاتیاتی طور پر پر تشدد مزاج نہیں رکھتا:

ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حیاتیات انسانیت کو جنگ کے لیے مجبور نہیں کرتی اور یہ کہ انسانیت کو حیاتیاتی قنوطیت کی قید سے آزاد کرایا جاسکتا ہے اور امن کے بین الاقوامی سال اور آنے والے برسوں میں درکار قلب ماہیت کے اہداف کی ذمہ داری لینے کے لیے پر اعتمادی کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ باوجود یہ کہ یہ اہداف اداروں کے اور اجتماعی ہیں، ان کا انحصار انفرادی شراکت داروں کے شعور پر بھی ہے جن کے لیے قنوطیت اور خوش امیدی فیصلہ کن عامل ہیں۔ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ ''جنگیں لوگوں کے ذہنوں میں شروع ہوتی ہیں، بالکل اسی طرح امن بھی ہمارے ذہنوں میں شروع ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی۔ (آدمز ۱۹۹۷: ۱۹۸۹:۲۰۱)۔

۲ راگست ۱۹۳۹ء کو البرٹ آئن اسٹائن نے امریکی صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ کو ایک خط لکھ کر مطلع کیا تھا کہ جوہری طبیعیات اس حد تک ترقی کر چکی ہے کہ ''ایک نئی قسم کے انتہائی طاقتور بم'' کی تخلیق ''قریب القیاس'' ہے (ناتھن اور نارڈن، ۱۹۶۸:۲۹۵ء)۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکی حکومت نے ایک مشاورتی کمیٹی کی تشکیل پر ۶ ہزار ڈالر کی ابتدائی سرمایہ کاری کی اور پھر کئی بلین ڈالر مین ہٹن پروجیکٹ کے لیے مختص کیے اور ۶ سال بعد دنیا کے پہلے یورینیم اور پلوٹونیم بموں کی تخلیق ہوئی اور وہ جاپان کے دو شہروں پر گرائے گئے۔ کئی بلین ڈالر کی رقم کہاں سے فراہم کی گئی؟ جاپان پر بم گرانے کے بعد ایٹم بم کی یہ ٹیکنالوجی امریکہ کے لیے اہمیت کی حامل نہ رہی۔ اس کے بعد ترقی کا سفر ہائیڈروجن بم سے بہت آگے چلا گیا لیکن ۱۹۹۹ء تک ۱۹۴۰ء کی ٹیکنالوجی مختلف ایجنٹوں کے ذریعے تیسری دنیا کے پرجوش ممالک کو اربوں کھربوں میں بیچی جاتی رہی اگرچہ ٹیکنالوجی بنانے والے

اسے نہ بیچتے تو کون اسے خرید سکتا تھا۔ ٹیکنالوجی کی قیمت بھی وصول کی گئی اور اسی کی بنیاد پر مختلف ملکوں کے خلاف کارروائیوں کا جواز بھی تلاش کیا گیا۔ ہر سائنسی ایجاد اربوں کھربوں روپے کی سرمایہ کاری سے ممکن ہوتی ہے۔ یہ روپیہ ابتدائی طور پر نوآبادیات [کالونیز] کو لوٹ کر حاصل کیا گیا۔ اب یہ روپیہ کہاں سے آرہا ہے اس سوال کے حتمی جواب کے ساتھ ہی سائنس اور سائنسی تحقیقات کی تمام مابعدالطبیعیات، اخلاقیات، تاریخ اس طرح طشت ازبام ہوگی کہ کوئی مغرب کی اس جدید سائنس و ٹیکنالوجی کا نام سننا گوارہ نہ کرے گا۔

اطالوی استعمار اور زبانیں:

اطالوی استعمار نے ایتھوپیا، صومالیہ، لیبیا پر قبضہ کیا۔ مقبوضات میں عربی رسم الخط کو ختم کر کے لاطینی رسم الخط جبراً نافذ کیا۔ لیبیا پر سرکاری زبان کے طور پر اطالوی زبان کا جبراً نفاذ کرایا گیا۔ ایتھوپیا کی زبان Amheric میں جبراً اطالوی الفاظ داخل کیے گئے۔ مگر یہ کوشش ناکام ہوئی۔ یہ افریقہ کی واحد سامی النسل زبان تھی جو محفوظ رہی۔ اب لیبیا میں عربی زبان نافذ ہے اطالوی زبان ختم ہوگئی۔ صمالیہ میں عربی اور صومالی زبانیں آج بھی موجود ہیں۔ اطالوی استعماریت نے قتل عام، تشدد، دہشت گردی کے تمام مظاہر سے فائدہ اٹھایا۔

زائرے (Zaire) پر بیلجیئم کا قبضہ ہوگیا۔ اس کا نام بلجیئم کانگو رکھا گیا اور یہاں کی زبان بھی تبدیل کر دی گئی۔

فرانسیسی استعمار اور زبانیں:

الجزائر فرانس کی نوآبادیات تھا، یہاں بیس لاکھ انسانوں کا بے دردی سے قتل عام کیا گیا۔ وسائل کا استحصال اس کے علاوہ ہے۔ زائر میں بنتو زبانیں ہوتو اور تمسی بولی جاتی تھیں لیکن جبراً یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی قرار دی گئی۔ الجزائر میں بھی فرانسیسی کو جبراً سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ پانڈیچری، مدغاسکر، سینی گال اور مغرب اقصی فرانس کی نوآبادیات بن گئیں۔ یہاں فرانسیسی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کو بھی حالت یتیمی میں زندہ رہنے کی اجازت دی گئی۔ براعظم افریقہ میں عربی کی آمیزش کے ساتھ جو فرانسیسی بولی جاتی ہے اسے خیپو (Crepus) کہتے ہیں۔ یہاں فرانسیسی زبان نے عربی کا اثر قبول کیا۔

ولندیزی استعمار اور زبانیں:

ولندیزیوں نے انڈونیشیا پر قبضہ کیا تو وہاں کی زبان پر جبراً اثر انداز ہوئے۔ Bahasa کا رسم الخط عربی سے جبراً لاطینی میں تبدیل کیا گیا۔ بہاسا زبان ملایو پولی نیشیا اور سنسکرت زبان کا سنگم ہے۔ قبول اسلام کے بعد اس کا رسم الخط فطری طور پر عربی ہوگیا تھا۔

جاوا جزیرے کی بوگوئی اور ربالنگی زبانوں کے خود ساختہ رسم الخط تھے۔ یہ جزیرے دو مختلف مذاہب بدھ مت، ہندو مت اور ثقافتوں کے مراکز تھے۔ ولندیزی استعمار نے انھیں بھی جبراً تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ جزائر کیریبین پر ولندیزیوں کا قبضہ ہوا تو یہاں افریقی لوگوں کو بسایا گیا اور ناکی ناکی اور رپلس موٹو زبان متعارف کر

کے لاطینی زبان و رسم الخط کا نفاذ کیا گیا۔ ہالینڈ کے استعمار کا جنوبی افریقہ پر قبضہ رہا وہاں زولو اور سوتھو زبانیں بولی جاتی تھیں۔ ولندیزی، انگریزی اور جرمن الفاظ داخل کر کے اس کا نام بھی افریکانز کر دیا گیا۔ اب یہ ایک انڈو یوروپی زبان بن گئی ہے۔

ولندیزی استعمار نے سوری نام (جنوبی امریکہ) پر قبضہ کیا تو اردو، ہندی، تامل زبانوں کا رسم الخط لاطینی کر دیا گیا اور اس ملک کا نام ہالینڈ نے ڈچ گیانا رکھا تھا جسے اب سوری نام میں بدل دیا گیا ہے۔

پرتگالی استعمار اور زبانیں:

پرتگالی استعمار گوا پر قابض ہوا۔ گوا بے جاپور ریاست کا حصہ تھا یہاں قبضے کے بعد کوکنی زبان کے عربی رسم الخط کو ختم کر کے لاطینی رسم الخط نافذ کیا گیا۔ برازیل پر قبضہ کر کے وہاں بھی پرتگالی زبان جبراً رائج کی گئی۔

روسی استعمار اور زبانیں:

روسی استعماریت نے تمام مسلمان مقبوضات کے رسم الخط عربی سے سریلی (Cyrillic) میں تبدیل کر دیے۔ ازبک اور ریغور زبانیں جن کا ادب ترک اقوام کا زریں ادب کہلاتا تھا انھیں دانستہ فراموش کر دیا گیا۔ لیکن عیسائی ریاستوں آرمینیا اور جارجیا کے معاملے میں روسی استعمار نے مذہبی تفریق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا قدیم رسم الخط برقرار رکھا کیوں کہ اس رسم الخط میں عیسائیوں کا صدیوں پرانا علمی و تحقیقی اور تاریخی و ثقافتی ورثہ محفوظ تھا۔ روس نے جارجیائی زبان کو ایک اور رسم الخط جسے "خط سوری" کہتے ہیں لاگو کرنے کی آزادی اور اجازت دی جو سریلک رسم الخط سے انتہائی مختلف اور منفرد تھا۔ یہ فراخ دلی روسی استعمار نے عیسائیت کے لیے اختیار کی لیکن مسلمانوں کو اس فراخ دلی سے کوئی حصہ نہ مل سکا۔

ہرشکو (Avram Hershko) اور امریکا کے اروِن روز (Irwin Rose) کو ملا ہے۔[۵۴]

ایران و ہند: مذہبی استعماریت اور زبانوں کا قتل عام:

ایران و ہند میں ماگدھی سنسکرت ژند زبانوں پر کیا گزری اس کی تفصیل محمد حسین آزاد "آب حیات" میں بیان کرتے ہیں۔

اسی بنیاد پر فتح یابیوں کی بلند نظری نے اس کا نام سنسکرت رکھا۔ جس کے معنی آراستہ، پیراستہ، مسجّی، منزہ، مصفا، مقدس، جو چاہے سمجھ لو۔ ان کے قواعد زبان بھی ایسے مقدس ہوئے کہ بزرگانِ دین ہی اسے پڑھائیں تو پڑھائیں، بلکہ اس طرح پکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں آواز پڑے۔ اس زبان کا نام دیوبانی ہوا، یعنی زبانِ الٰہی، زبان شاہی وید کے منتر ترتیب، جس سے اس عہد کی زبان کا پتہ لگے۔ ۱۴ سو برس قبل سنہ عیسوی خیال کرتے ہیں۔ اس وقت ان فتحیابیوں کی باتیں اس ملک اور ملک والوں کے ساتھ ایسی سمجھو جیسے ہندوستان میں پہلے پہلے مسلمانوں کی حالتیں، ان کے سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آ کر کچھ اور ہو گئے

ہوں گے۔ اس لیے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعے قطعے میں پراکرت زبانیں خودبخود پیدا ہو گئی ہوں گی۔ جیسے اسلام کے بعد اُردو، چنانچہ ماگدھی (پالی) سورسینی، مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی قدامت کا پتا بتاتی ہیں۔ ان کی سیاہی میں سینکڑوں لفظ سنسکرت کے چمکتے نظر آتے ہیں۔ مگر بگڑے ہوئے ہیں۔

دیکھا! پرکت کے معنے ہیں۔ طبیعت اور جو طبیعت سے نکلے چنانچہ ہیم چند لغات سنسکرت کا جامع بھی یہی کہتا ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت مہذب اور مقدس اور پراکرت غیر مہذب لوگوں کو کہتے ہیں۔ پس ایسی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فہمیدہ لوگ تھے۔ ہر بات کو خوب سمجھتے تھے اور جو کچھ انھوں نے کیا سمجھ کر کیا۔

راجہ بھوج کے عہد کی ...... کہتی ہیں کہ ان عہدوں میں علمی، کتابی اور درباری زبان تو سنسکرت تھی۔ مگر چوں کہ معاملہ خاص و عام سے پڑتا ہے، اس لیے گفتگو میں پنڈتوں کو بھی پراکرت ہی بولنی پڑتی ہے۔ پراکرت صاف سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں اور ویسے ہی قاعدے صرف و نحو کے بھی ہیں۔

سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی، پھر بھی متوسرقی ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد لکھی گئی تھی۔ اس میں اور "وید" کی زبان میں صاف فرق ہے اور اب اور بھی زیادہ ہو گیا۔ لیکن چوں کہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس لیے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا کہ دفعتاً ۵۴۳ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاک منی پیدا ہوئے۔ وہ مگدھ دیس سے اٹھے تھے۔ اس لیے وہیں کی پراکرت میں وعظ شروع کیا۔ کیوں کہ زیادہ تر کام عوام سے تھا۔ عورت مرد سے لے کر بچے اور بوڑھے تک یہی اس دیس کی زبان تھی۔ ان کی آتش بیانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا۔ جیسے بن میں آگ لگے دیکھتے دیکھتے دھرم، حکومت، رسم و رواج، دین، آئین سب کو جلا کر خاک کر دیا اور مگدھ دیس کی پراکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہو گئی۔ اقبال کی یاوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اسی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے۔ کہیں کہیں کونے گوشے میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے۔ وہاں ویدوں کا اثر رہا۔ باقی راج دربار اور علمی سرکار سب ماگدھی ہی ماگدھی ہو گئی۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر دوے پڑھے۔ اور با آواز بلند یہ کہہ دیا کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے برہمن اور کل انسان بات کرنے کے لائق بھی نہ تھے، اصل میں ان کی بھی اور قادر مطلق بدھ کی زبان یہی ہے۔ اس کی صرف و نحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں۔ خدا کی قدرت دیکھو! جو لونڈی تھی وہ رانی بن بیٹھی اور رانی منہ چھپا کر کونے میں بیٹھ گئی۔

زمانے نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً ۱۵ سو برس بعد) بدھ مذہب کو بھی رخصت کیا اور اس کے ساتھ اس کی زبان بھی رخصت ہوئی۔ شنکر اچارج کی برکت سے برہمنوں کا ستارہ ڈوبا ہوا پھر ابھر کر چمکا اور

سنسکرت کی آب و تاب بھی شروع ہوئی۔ راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اس کی فصاحت نے پائی۔ آج تک لوگوں کو آنکھوں کا اجالا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربار سلطنت اور اعلیٰ درجے کے لوگوں کو سنسکرت بولنا اعتبار و افتخار کی سند تھا اور پراکرت عوام کی زبان تھی کیوں کہ اس عہد میں جو کالی داس ملک الشعراء نے شکنتلا کا ناٹک لکھا ہے سبھا میں دیکھ لو، بادشاہ، امراء اور پنڈت سنسکرت بول رہا ہے کوئی عام آدمی کچھ کہتا تو پراکرت میں کہتا ہے۔

گیارھویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعے کی وہ زبان تھی۔ جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت بھی ہر قطعے میں اپنی اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی اور سنسکرت تصنیفات اور خواص کی زبانوں کے لیے باعث برکت تھی کہ دفعتاً زمانے نے ایک اور رنگ بدلا۔ یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا۔ اس نے پھر ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا۔ اور اسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہو گیا۔

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژند و استا کی زبان ایرین کے رشتے سے ایک دادا کی اولاد ہیں۔ مگر زمانے کے اتفاق دیکھو کہ خدا جانے کے سو برس یا کے ہزار برس کی بچھڑی ہوئی بہنیں اس حالت سے آ کر ملی ہیں کہ ایک دوسری کی شکل نہیں پہچان سکتی۔

ہندوستانی بہن کی کہانی تو سن چکے، اب ایرانی بہن کی داستان بھی سن لو۔ کہ اس پر وہاں کیا گزری۔ اوّل تو یہی قیاس کرو کہ اس ملک نے جو ایران نام پایا، شاید وہ لفظ ایرین ہی کی برکت ہو۔ پھر یہ بھی کچھ تھوڑے تعجب کا مقام نہیں کہ جس طرح ہندوستانی بہن پر وقت بوقت بدھ مت وغیرہ کے حادثے گزرے اسی طرح اس پر بھی وہاں انقلاب پڑتے رہے۔ باوجود اس کے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔

ایرانی بہن جب اس ملک میں جا کر بسی ہوگی، اوّل تو مدّت تک ان کے مذہب، رسم و رواج اور زبان جیسے تھے، ویسے ہی رہے ہوں گے۔ مگر اس زمانے کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں آئی۔ کچھ ٹوٹا پھوٹا پتا ملتا ہے تو زرتشت کے وقت سے ملتا ہے، جسے آج تخمیناً ۲۴ سو برس ہوئے۔ اس نورانی موحد نے شعلۂ آتش کے پردے میں توحید کے مسئلے کو رواج دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے بازوؤں سے زور پکڑا اور ایران سے نکل کر دو سو برس کے قریب اطراف و جوانب کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا اور ایشیا کے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔

یونانی استعماریت کے ہاتھوں ژند کی بربادی:

جو مصیبت بدھ کے ہاتھ سے بید شاستر پر پڑی تھی، وہاں وہی مصیبت ژند استا پر آئی۔ چناں چہ جس

آگ نے زرتشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا جس کے آگے گشتاسپ نے تاج اتار کر رکھا۔ جس کی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی وہ یونان کے آب شمشیر سے بجھائی گئی اور آتش خانے راکھ ہو کر اڑ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ژندیا زند کے ورق ورق برباد کیے گئے اور ہزاروں کتابیں فلسفۂ الٰہی اور علوم و فنون کی تھیں کہ نابود ہو گئیں۔ جب کہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے زبانوں پر بھی زور دکھایا ہو گا تھوڑے ہی دنوں میں پارتھیا والوں کا عمل دخل ہو گیا۔ وہ ایران، جسے ہزاروں برس سے ملک گیری کے نشان سلامی اتارتے تھے اور تہذیب و شائستگی اس کے دربار میں سر جھکاتے تھے پانچ سو برس تک ظفر یابوں کے قبضے میں دبا رہا۔ اور ژند کی کتب مقدسہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کی گئیں۔

۲۰۰ء میں پھر تن بے جان میں سانس اور ساسانیوں کی تلواروں میں قدیمی اقبال نے چمک دکھائی۔ ان بادشاہوں نے ملک و مملکت کی قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کو بھی روشن کیا۔ گرے ہوئے آتش خانوں کو پھر اٹھایا اور جہاں جہاں سے پھٹے پرانے اوراق پریشان ہاتھ آئے بہم پہنچائے۔ ان ہی کی کوششوں کی کمائی تھی، جو پھر ساڑھے چار سو برس بعد حلق اسلام کے قربان ہوئی، اس معاملے میں ہمیں نیک پارسیوں کا شکریہ نہ بھولنا چاہیے۔ کیوں کہ باوجود تباہی کے خانہ بربادی کے جو پرانا کاغذ کسی با اعتقاد کے آیا۔ وہ جان کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا کہ بندر سورت، گجرات وغیرہ ملکوں میں آج تک اسی نور سے آتش خانے روشن ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ ان تصنیفات کا بقیہ ہے جو ساسانیوں کے عہد میں ہوئیں کتب مذکور دونوں زبانوں کا لفظی اتفاق ہی نہیں ثابت کرتیں۔ بلکہ ان کے اتحاد و اعتقاد پر بھی شہادت دیتی ہیں۔ جو چار برن ہندوؤں میں وہی ایران میں تھے۔ اجرام آسمانی کی عظمت واجب تھی حیوانات بے آزار کا مارنا گناہ عظیم تھا تناسخ کا مسئلہ دونوں میں یکساں تھا۔ آتش، آب، خاک، باد، ابر، بجلی، گرج، ہوا وغیرہ وغیرہ اشیاء کے لیے ایک ایک دیوتا مانا ہوا تھا جس کے اظہار عظمت کے لیے خاص خاص طریقے تھے۔ یاد الٰہی کے زمزمے تھے جس کو وہ اپنی اصطلاح میں گاتھا کہتے تھے۔ یہ وہی لفظ ہے جس کے نام پر یہاں گیتا کتاب ہے کیوں کہ اس میں بھی یاد الٰہی کے گیت ہیں۔

بھارت: گیارہ معدوم زبانیں:

بھارت کی گیارہ معدوم زبانوں میں سے نو کا تعلق جزائر انڈمان سے ہے جبکہ دو زبانیں بھارتی سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں۔ پالی زبان جو معدوم ہو چکی ہے اس کا سبب مذہبی دہشت گردی تھا۔ اس زبان میں بدھ مذہب کی مقدس کتابیں اور احکامات تھے لہٰذا برہمنیت نے اس زبان سے عناد برتا اور جب بودھ لوگوں کا نسلی قتل عام ہوا تو یہ لوگ بھارت کے اطراف کے ملکوں میں منتقل ہو گئے اور اس طرح یہ زبان فنا ہو گئی۔ آج سری لنکا اور برما (موجودہ میانمہ) میں بودھ بھکشو یہ زبان صرف دینی تعلیم کی غرض سے سیکھتے ہیں۔ تائی آہُم (Ahom) بھارت کی مشرقی ریاست آسام اور اس سے ملحقہ علاقوں میں بولی جاتی تھی لیکن آج یہ ختم ہو چکی ہے۔ جزائر

اندمان کی زبانیں جو ختم ہو گئیں ان کے نام یہ ہیں: اکابیا، اکابو، اکا کاری، اکاجیرو، اکا کیدے، اکا کول، اکا کورا، اکربالے، اوراو کوجوائے۔

سنسکرت زبان بھی فنا ہو گئی تھی لیکن مذہبی تعصب اور تفاخر نے اسے پھر سے زندہ کر دیا۔ یہ زبان جو کبھی دھرم شالاؤں اور جوگی سنیاسیوں تک محدود ہو گئی تھی اب اس کے بولنے والوں کی تعداد ۱۹۸۱ء کے شمار کے مطابق تقریباً ۶۱۰۶ ہے۔

بھارت دیس میں آج بھی ہندو استعماریت (Hindu Hegemony) اپنے عروج پر ہے جس کے تحت وہاں کی تمام زبانوں کو سنسکرت کے رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔ جس کے باعث زبانیں اپنی انفرادیت کھوتی جا رہی ہیں۔

سترہویں صدی سے پہلے کے قتل عام:

رومیل نے اپنی کتاب Death by Government میں اعداد و شمار کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ دنیا کی پوری تاریخ میں جتنے قتل عام ہوئے بیسویں صدی کے صرف اٹھاسی سالوں میں اس سے کئی گنا زیادہ قتل عام ہوئے، سترہویں صدی سے قبل کے تمام قتل عام کی تفصیل ویب سائٹ Hawaili.com سے ۵ فروری ۲۰۰۵ء کو حاصل کیے گئے۔ رومیل کے اعداد و شمار کے مطابق سترہویں صدی سے قبل دنیا کی تاریخ میں صرف ۴۷ کروڑ لوگ مارے گئے۔ ان مارے جانے والوں میں سب سے زیادہ تعداد افریقی غلاموں اور چینی سرخ ہندی باشندوں کی ہے۔ چینی شہنشاہیتوں ہیونگ، ہان، تانگ، سانگ کے ہاتھوں چین کے ۲۰ کروڑ باشندے پانچ سو سال کے دوران ہلاک کیے گئے۔ رومیل نے اس قتل عام کی وجوہات اور تفصیلات ویب سائٹ پر مہیا نہیں کی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا نمبر امریکی استعمار کا ہے جہاں پچاس سال کے عرصے میں امریکہ کے اصل مقامی باشندے جن کی تعداد دس کروڑ تھی۔ رومیل کے مطابق ۸ کروڑ ہلاک کر دیے گئے جب کہ مائیکل مین کے مطابق ۹ کروڑ ہلاک کیے گئے۔ دیگر تفصیلات درج ذیل ہیں:

بارہویں صدی صلیبی جنگ: عیسائیوں کے مظالم: ستر ہزار قتل

After the capture of Bram in 1210, the Albigensian Crusaders, Christians all, took 100 of the captured soldiers and gouged out their eyes, cut off their noses and upper lips, and had them led by a one-eyed man to Cabaret, yet to be attacked. the alleged 40,000 to possibly even over 70,000 men, women, and children that were butchered after the Christian Crusaders took Jerusalem in 1099.

افریقی غلام: ساڑھے چھ کروڑ قتل

In the 16th to 19th centuries alone the death toll among African slaves being transported to the New World may have been over 1,500,000, possibly 2,000,000; millions more died in capture and in transit to the Orient or Middle East. And just among those kept in Africa some 4,000,000 may have died. Overall, in five centuries, Europeans, Arabs, Asians, and African slave traders, possibly murdered near 17,000,000 Africans; perhaps even over 65,000,000.

منگولوں کی یلغار اور اس کی تاریخ:

چنگیز خان: بخارا، سمرقند: ساٹھ ہزار شہید

Jinghiz Kahn's army captured Bokhara and allegedly murdered 30,000; and another 30,000 people in capturing Samarkand.

مرو: ۱۳ لاکھ شہید

a Mongol army seized Merv and reportedly took 13 days to slaughter 1,300,000 inhabitants

قزوین، نیشاپور: ایک لاکھ بیس ہزار شہید

Historians also record that in 1220 the Mongols killed 50,000 in Kazvin after it was captured;16 70,000 in Nessa, and a similar number in Sebzevar.

خراسان: تیرہ لاکھ شہید

the Mongol Tului slew 700,000 to 1,300,000 people in Meru Chahjan, one of the four main cities of Khorassan in the Northern borderland of Persia.

رے: تین ہزار مساجد اور کل آبادی شہید

the entire population of Rayy, a city with 3,000 mosques, was slaughtered. Herat was later captured, but only some 12,000 soldiers and their dependents were killed.

However, after the inhabitants later rebelled Jinghiz Khan angrily sent his general Noyan against them. The city was recaptured and it took a whole week to burn it down and murder its estimated 1,600,000 people. Many thousands escaped, but Noyan later sought and killed over 2,000 of them.Then in 1226-33 there was the nearly total extermination-truly a genocide

بغداد: ۸ لاکھ شہادتیں

The Mongols subsequently invaded what is Iraq and in 1258 the Mongol Khulagu captured Baghdad, sacked and burned the city, including most mosques, and reportedly annihilated 800,000 of its people. 1381 to 1401

تیمور: تین ہزار جیلیں۔ سروں کے مینار

Tamerlane (or Timur Lenk), a Turk who proclaimed himself restorer of the Mongol Empire, razed Isfarã'in to the ground in A.D. 1381; built 2,000 prisoners into a living mound and then bricked them over at Sabsawer in 1383; piled 5,000 human heads into minarets at Zirih in the same year; cast his Luri prisoners alive over precipices in 1386; massacred 70,000 people and piled the heads of the slain into minarets at Isfahan in 1387; . . . buried alive 4,000 Christian soldiers of the garrison of Sivas after their capitulation in 1400; and built twenty towers of skulls in Syria in 1400 and 1401.

منگولوں کے ہاتھوں تین کروڑ انسانوں کا قتل

the Mongol khans and their successors and pretenders possibly slaughtered around 30,000,000 Persian, Arab, Hindu, Russian, Chinese, European, and other men, women, and children.

قبلائی خان: ایک کروڑ پچاسی لاکھ چینیوں کا قتل

Khubilai Khan's rule over China. According to a Chinese writer, "in gaining and maintaining his throne he slaughtered more than 18,470,000 Chinese. He killed something like 1 out of every 137 Chinese each year. In Chinese Dynasty:

شہنشاہ ہیونگ [چین]: ۳۴۶ دانشور زندہ دفن کردیے

Even the great emperor who unified China and gave it his name, Qin (pronounced Chin) Shihuang, buried alive 346 scholars in order to discourage opposition.

ہان شہنشاہیت: ایک کروڑ قتل

In the eight years that the Han Dynasty was being replaced by the Qin Dynasty 221-207B.C., the population of China decreased from 20 million to 10 million.

چین: تین سو سال میں چار کروڑ تیس لاکھ قتل

In the Dong (Eastern) Han Dynasty 206B.C.-220A.D., the population of China was 50 million. After the transition of power to the Three Kingdom period 222-589, the population decreased to 7 million.

تانگ شہنشائیت: ساڑھے تین کروڑ لوگوں کا قتل

In the Sui Dynasty 581-618, the population of China was 50 million. After the transfer of power to the Tang Dynasty 618-907, only one third was left.

سانگ شہنشائیت: ساڑھے آٹھ کروڑ لوگوں کا قتل

At the peak of the Song Dynasty 960-1279 the population was about 100 million. But in the beginning of the Qing Dynasty in 1655, the population was 14,033,900. During the 20 year period from 1626 to 1655, the population decreased from 51,655,459 to 14,033,900.

تاپینگ ٹرائڈ غدر: چار کروڑ تیس لاکھ قتل

just in the one month of 1681, for just the Triad Rebellion, in merely the one province of Kwangtung, with the rebellions defeat "some 700,000 people were executed. During the last century in over some fifteen years the Teiping Rebellion possibly cost "tens of millions" of lives, maybe even as many as 40,000,000. Some 600 cities were "ruined." Because the rebellion began in the province of Kwangsi, Imperial forces allowed no rebels speaking its dialect to surrender. All were slaughtered. Indeed, massacre on both sides during this and the almost concurrent Nein Rebellion was general. For one county in the province of Anhwei, for example, local scholars lamented that out of a population of 300,000 Chinese, "By the time the rebels were cleared only a little over 6,000 survived. This is a catastrophe unique for the locality since the beginning of the human race." Overall, 70 percent of the province's population were killed or died. When the Teiping rebels captured Nanking in 1853 they killed all the Tartars garrisoning the city. But this was not enough. They also murdered all their family members. In total about 25,000 people may have been wiped out. When imperial troops recaptured Nanking the following year they in turn allegedly exterminated about 100,000 rebels, and in just three days. They followed the same quick and bloody policy in Canton and along the Pearl River. After they recaptured this area from the rebels they are said to have beheaded 700 to 800 inhabitants a day, whether rebel collaborator or not, ultimately killing another 100,000 people. Just in the province of Kwangtung, it is written that 1,000,000 were executed. In one province, reportedly 1,000,000 were executed! This is more than the total number of Americans killed in all the civil and international wars the United States has fought in its whole history, including the War of Independence.

There also was the nearly concurrent Moslem uprisings with their attendant slaughter. For the province of Yunnan 5,000,000 out of 8,000,000 may have died. When the last Muslim stronghold fell to imperial forces, 20,000 men, women, and children were "put to the sword."45 In Shensi province population fell from 700,000 or 800,000 Moslems to between 20,000 and 30,000 in ten years. Even most of the 50,000 to 60,000 Moslems that fled to Kansu province perished. All told still a much larger number of Chinese were massacred by Moslem rebels or otherwise died.

عثمانی سلاطین: چالیس ہزار لوگوں کا قتل

When the Ottoman Mohammed II sieged and finally took Constantinople in 1452, he massacred thousands.

As the 1876 Bulgarian rebellion against the Ottoman Empire that was brutally suppressed by the Sultan: about 60 villages were destroyed, and 12,000 to 15,000 massacred. In one reported incident, a church was set ablaze to burn alive the 1,200 people who had gathered inside for protection.

Sixteen Century Sultan Selum (The Grim), father of SŸleyman whose campaign diary was quoted above, killed his father, two brothers, many nephews, sixty-two other relatives, and seven grand viziers during his eight year rule. It is told that he inaugurated this bloody reign by slaughtering 40,000 Turkish Shi'ites.

ڈیوک آف بوربن: لاکھوں لوگوں کا قتل عام

In 1527 the army of Tirolese condottiere Frunsberg and Charles, Duke of Bourbin, captured and sacked Rome. Historians record that at a minimum 2,000 corpses were thrown into the Tiber river and 9,800 dead were buried;50 many more were killed. During the Thirty Years War the Count of Tilly and Count zu Pappenheim may have massacred as many as 30,000 inhabitants of Magdeburg when the city fell to them after a six-month siege.

The German Empire alone may have lost more than 7,500,000 people in the war.

ڈیوک آف البا: اٹھارہ ہزار قتل

From 1567 to 1573, the Duke of Alba (representative to the Low Countries of Philip II, King of Spain) tortured to death and otherwise killed 18,000 Protestants to maintain order, or so it is said.

بوہیمیا: ایک کروڑ دس لاکھ قتل

The population of Bohemia had been reduced from around 4,000,000 people to possibly no more than 800,000. Putting a number of such figures together, in this war alone from 2,000,000 to over 11,000,000 people were probably murdered.

صلیبی جنگیں: لاکھوں لوگوں کا قتل عام

And the Crusades of the Middle Ages should not be ignored. In the aforementioned 1099 sack of Jerusalem, besides the 40,000 to over 70,000 Moslems that may have been butchered, the Crusaders herded surviving Jews into a synagogue and burned them alive.

In 1209 the Albigensian Crusaders also slaughtered some 15,000 to 60,000 inhabitants of Baziers, after which the city was plundered and burned. And in 1236 when the Jews of Anjou and Poitou refused to be forcibly baptized, the Crusaders reportedly trampled 3,000 of them to death with their horses.

فرانس: گیارہ لاکھ لوگوں کا قتل

the Great Terror of 1793-1794 in revolutionary France: The Revolutionary Tribunal and its equivalent in the provinces may have executed up to 20,000 of the nobility, political opponents, and alleged traitors. And although often reported as a civil war, in fact a full-scale genocide was carried out in the Vendze in which possibly 117,000 inhabitants were indiscriminately murdered.

دو کروڑ پچیس لاکھ یورپیوں کا قتل

Jews everywhere were thus attacked during the Black Death of 1347-1352 that killed around 25,000,000 Europeans.

جزیرہ بورنیو میں قتل عام:

An 1849 expedition sent out against certain native tribes of the coast of Borneo. Under the direction of Sir James Brooke, British Rajah of Sarawak, it annihilated a force of Dyaks then allegedly returning from a piratical excursion against coastal tribes. About 1,500 to 2,000 of them were killed by cannon shot, musket, grapeshot.

ولندیزی استعمار: ہزاروں چینیوں کا قتل

Inside the walls of Batavia, stripping them of the smallest kitchen knife and putting them under a dusk-to-dawn curfew. The Dutch then distributed arms to what they themselves called "the low-class masses" and gave these "mobs" a free hand to massacre the helpless Chinese. The rapine inside Batavia was allowed to go on from the 9th to the 22nd of October, 1740. While the "mobs" were despatching Chinese lives inside Batavia, the Dutch East India Company troops killed those who had fled from the city before the curfew and roamed in Batavia's environs.

10,000 city-Chinese lost their lives.

Of the 80,000-odd Chinese in Batavia's environs prior to the extermination only around 3,000 survived.....

in June 1741 the Council of the Indies voted for a "general massacre of the Chinese over the whole of Java."

امریکی استعمار: آٹھ کروڑ سرخ ہندیوں کا قتل

As the Puritan killing of 500-600 Pequot Indians at Mystic Fort in 1637 and the French annihilation of perhaps 1,000 Nanchez Indians in the lower Mississippi after defeating them in 1731. To consider one notorious massacre, in 1864 citizen and military troops enlisted from the Colorado territory and led by Colonel John Chivington surrounded and surprised Cheyenne at Sand Creek in the Colorado Territory. In total from 70 to 600 were massacred, the latter the upper estimate of the Colonel; 130 killed seems closer to the truth. At Washita 103 Cheyenne were killed in 1868; in 1870 at Piegan Village 173 Indians were killed; and at Wounded Knee in 1890 it was possibly 146 Sioux. Also often cited is the Bear River Massacre of 1863 in which 250 Shoshoni were wiped out. This began as a battle between Indians and soldiers, but degenerated into a slaughter of helpless and wounded Indians. Some 3,000 Indians were killed in the years 1789 to 1898. Settlers and vigilantes likely killed a thousand more.

Since many of these Indians were killed in pitched battles, it seems very unlikely that the number of Indians massacred outright by Calvary and settlers in the American West could have been more than 4,000, and was probably a good number less. In the 1835 treaty of New Echota with the U.S. government Cherokee leaders of a minority faction, and without the approval of the majority, agreed to the nation moving out of Georgia to West of the Mississippi River. Although many prominent Americans publicly opposed such a deportation, in 1838 President Van Buren ordered the army to enforce the treaty. At gun point the Cherokees were thus made to trek westward to Oklahoma in the winter of 1838-39. The resulting exposure and disease killed off nearly 25 percent of the tribe, or about 4,000 people. While the Federal Government's responsibility is mitigated by the treaty, the cruelty of the enforcement amounts to indirect massacre. It was democide. Perhaps overall, considering these and other cases and including massacres, by 1900 some 10,000 to 25,000 Indians may have been killed. Before the conquest of the New World the Indian population may have numbered from 8,000,000 to 110,000,000; perhaps even 145,000,000. A moderate population estimate consistent with the latest research is of 55,000,000 Indians. Almost totally as a result of several waves of disease carried to the Americas by the conquering and colonizing Europeans, the Indian population dropped steeply by tens of millions, even possibly by as much as 95 percent.80 In Mexico alone the Indian population may have fallen by 23,000,000 to under 2,000,000. including those Indians who were killed in warfare and democide, perhaps 60,000,000 to 80,000,000 Indians of Central and South America and the Caribbean died as "a result of the European invasion." I found one overall estimate of 15,000,000 Indians killed in what appears to be democide, but this figure is given without citation or elaboration. In any case, judging by the bloody history of this period of colonization throughout the Americas, a democide of 2,000,000 would seem a rough minimum and 15,000,000 dead a maximum. Even if these figures are remotely true, then this still make this subjugation of the Americas one of the bloodier, centuries long, democides in world history.

برطانوی استعمار: آسٹریلیا کے باشندوں کا قتل عام

In Tasmania alone by 1832 as many as 700 out of an original population of 1,000 may have been killed. In all of Australia the Aborigine population in 1788 was about 300,000, divided into about 500 tribes, each with a distinct dialect and culture. In the resulting frontier conflict with settlers during the 18th and 19th centuries, possible 20,000 or more Aborigines were killed.

سلطان فیروز شاہ کے ہاتھوں قتل عام

It is recorded that in the 12th or 13 century Sultan Firoz Shah invaded Bengal and offered a reward for every Hindu head, subsequently paying for 180,000 of them. Whenever in his territory the number of Hindus killed in one day totaled 20,000, Sultan Ahmad Shah celebrated with a three-day feast.

کنگ چارلس نہم: ایک لاکھ کالونسٹوں کا قاتل

On August 24th, 1572, King Charles IX or his Court unleashed a slaughter of French Calvinists that spread from Paris to the whole country. In this famous St. Bartholome day massacre a contemporary Protestant estimated that 300,000 were killed; later estimates reduced this to 100,000, then 36,000.

عثمانی سلاطین: قتل عام کی وارداتیں

A more recent example of genocidal massacres is given by the Ottoman Empire. It was composed of diverse nations, which were often treated with great cruelty by the ruling Turks. Their massacre of Bulgarians in 1876. This was but one of many massacres of national groups. In 1822 they allegedly killed 50,000

Greeks, largely in Scio (Chios); 10,000 Nestorians and Armenians in Kurdistan in 1850; and 11,000 Maronites and Syrians in Lebanon and Damascus in 1860. From 1894 to 1896 the Sultan carried out a systematic campaign of murder. Probably between 100,000 to over 300,000 Armenians were massacred. When these killings are added to those by various Ottoman Sultans through the centuries, at the very least they must have exterminated some 2,000,000 Armenians, Bulgars, Serbs, Greeks, Turks, and other subjects.

رومیل نے ہندوؤں کے ہاتھوں بدھ مت کی تباہی و بربادی اور لاکھوں بدھوں کی ہلاکت کے بارے میں اعداد و شمار مہیا نہیں کیے اسی طرح منگولوں کے ہاتھوں مسلم علاقوں کی تباہی کا بہت مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔ مغلوں کے ہاتھوں ہندوستان میں قتل عام کی تفصیل بھی نہیں دی گئی جب کہ سکندر مہدی نے نگلین جیج کی کتاب کے مقدمے میں مغلوں کے مقتولین کی تعداد تین کروڑ درج کی ہے جو درست نہیں ہے۔ رومیل نے ایران میں صفوی حکومت کے ہاتھوں قتل عام کی تفصیل بھی نہیں دی۔ جب کہ براؤن کی کتاب اس سلسلے میں کافی معلومات فراہم کرتی ہے۔ عیسائیت کے ہاتھوں ہم مذہب لوگوں کے قتل کی تفصیلات بھی نہیں دی گئی ہیں۔

بیسویں صدی: دنیا کی تاریخ کی سب سے خونی صدی

رومیل نے اپنی کتاب Death by Government میں اعداد و شمار کے ذریعے بیسویں صدی کو دنیا کی تاریخ کی خون خوار صدی کے طور پر نمایاں کیا ہے۔ رومیل کی کتاب کے اعداد و شمار ویب سائٹس Hawaii.com سے فروری ۲۰۰۵ء میں حاصل کیے گئے تھے۔ ملاحظہ فرمایئے:

بیسویں صدی: پندرہ کروڑ دس لاکھ لوگوں کی قاتل
میدان جنگ میں مرنے والے: تین کروڑ پچاسی لاکھ

Those states killing in cold blood, aside from warfare, 1,000,000 or more men, women, and children. These fifteen megamurderers have wiped out over 151,000,000 people, almost four times almost 38,500,000 battle-dead for all this century's international and civil wars up to 1987. The most absolute Power, that is the communist U.S.S.R., China and preceding Mao guerrillas, Khmer Rouge Cambodia, Vietnam, and Yugoslavia, as well as fascist Nazi Germany, account for near 128,000,000 of them, or 84 percent.

بیسویں صدی: ڈیمو سائیڈ میں ایک کروڑ پچاس لاکھ لوگوں کا قتل

Then there are the kilomurderers, or those states that have killed innocents by the tens or hundreds of thousands, China Warlords (1917-1949), Ataturk's Turkey (1919-1923), the United Kingdom (primarily due to the 1914-1919 food blockade of the Central Powers in and after World War I, and the 1940-45 indiscriminate bombing of German cities), Portugal (1926-1982), and Indonesia (1965-87). Some lesser kilomurderers were communist Afghanistan, Angola, Albania, Rumania, and Ethiopia, as well as authoritarian Hungary, Burundi, Croatia (1941-44), Czechoslovakia (1945-46), Indonesia, Iraq, Russia, and Uganda. For its indiscriminate bombing of German and Japanese civilians, the United States must also be added to this list. These and other kilomurderers add almost 15,000,000 people killed to the democide for this century.

روس میں بیگاری نظام: چار کروڑ کا قاتل:

رومیل کے خیال میں چار سو سال کے اندر افریقہ کے مقتول غلاموں کی تعداد روس میں جبری بے گار میں مرنے والوں سے نصف ہے جب کہ روس میں چار کروڑ لوگ صرف ستر سال کے عرصے میں ہلاک ہوئے جب کہ امریکی استعمار نے پچاس سال کے عرصے میں ۹ کروڑ سرخ ہندیوں کو جو امریکا کے اصل باشندے تھے۔ روئے زمین سے مٹا دیا۔

Far above all is gulag-the Soviet slave-labor system created by Lenin and built up under Stalin. In some 70 years it likely chewed up almost 40,000,000 lives, over twice as many as probably died in some 400 years of the African slave trade, from capture to sale in an Arab, Oriental, or New World market.

بیسویں صدی کے اٹھاسی سال: سترہ کروڑ لوگوں کی تعذیب/۳۶ کروڑ لوگوں کی قاتل

In total, during the first eighty-eight years of this century, almost 170,000,000 men, women, and children have been shot, beaten, tortured, knifed, burned, starved, frozen, crushed, or worked to death; or buried alive, drowned, hung, bombed, or killed in any other of the myriad, ways governments have inflicted death on unarmed, helpless citizens or foreigners. The dead even could conceivably be near 360,000,000 people.

جنگوں اور خانہ جنگوں میں: بیس کروڑ تین لاکھ قتل

Putting the human cost of war and democide together, Power has killed over 203,000,000 people in this century.

ہٹلر: ۲ کروڑ دس لاکھ یہودیوں کا قاتل
روسی شہری: چھ کروڑ بیس لاکھ قتل

Hitler murdered millions of Jews is common knowledge. That he murdered overall near 21,000,000 Jews, Slavs, Gypsies, homosexuals, Frenchmen, Balts, Czechs, and others, is virtually unknown. Similarly, that Stalin murdered tens of millions is becoming generally appreciated; but that Stalin, Lenin, and their successors murdered almost 62,000,000 Soviet citizens and foreigners is little comprehended outside of the Soviet Union (where similar figures are now being widely published). Then there is Mao Tse-tung's China, Chiang Kai-Shek's China, the militarist's Japan, Yahya Khan's Pakistan, Pol Pot's Cambodia, and the others.

نازی، جاپانی اور چینیوں کے ہاتھوں قتل عام:

Aside from battle or military engagements, during the war the Nazis murdered around 20,000,000 civilians and prisoners of war, the Japanese 5,890,000, the Chinese Nationalists 5,907,000, the Chinese communists 250,000, the Nazi satellite Croatians 655,000, the Tito Partisans 600,000, and Stalin 13,053,000.

بیسویں صدی: حکومتیں سترہ کروڑ لوگوں کی قاتل

Murder of between 5 to 6 million Jews became the paradigm case of genocide and underlies the word's origin.

Taking both social definitions into account, governments have murdered probably around 174 million people during the 20th Century. Most of this killing, perhaps around 110 million people, is due to communist governments, especially the USSR under Lenin and Stalin and their successors (62 million murdered), and China under Mao Tse-tung (35 million). Some other totalitarian or authoritarian governments are also largely responsible for this toll, particularly Hitler's Germany (21 million murdered) and Chiang Kai-Chek's Nationalist government of China (about 10 million). Other governments that have murdered lesser millions include Khmer Rouge Cambodia, Japan, North Korea, Mexico, Pakistan, Poland, Russia, Turkey, Vietnam, and Tito's Yugoslavia.

Burundi (1972), Cambodian Khmer Rouge (1975-79), Iraq (1963-), Myanmar (1962-), Nigeria (1967-70), Rwanda (1994), Serbia (1990s), Sudan (1956-), and many others.In the Taiping Rebellion (1851-64) alone, upwards of forty million were killed, the vast majority likely murdered.

بدترین قاتل: روسی حکومت

The worst murdering government was that of the Soviet Union, where Lenin, Stalin, and their successors may have killed around 62 million citizens and foreigners.

The Communist Party of China under Mao Tse-tung and his successors may have accounted for 39 million Chinese.

The Nazis under Hitler carried out the Holocaust against the Jews, which everyone knows about, but lesser known is their other murders, which including the Jews amount to about 21 million murdered.

چیانگ کائی شیک: ایک کروڑ لوگوں کا قاتل

Virtually unknown is that the Chinese Nationalist government, while in power from 1928 to 1949 under Chiang Kai-Shek, murdered some 10 million Chinese.

There were lesser murdering governments that while they killed a million or

more people, managed to keep the total under 10 million. Just to name them, with the years and approximate millions murdered in parenthesis: Japan (1937-45: 6), Cambodia Khmer Rouge (1975-79: 2), Turkey (1909-18: 1.9), Vietnam (1945-87: 1.7), North Korea (1948-2002: over 2), Poland (1945-48: 1.6), Pakistan (1958-87: 1.5), Mexico (1900-20: 1.4), Russia (1900-17: 1.1), and Yugoslavia under Tito (1944-87:1). Well over a hundred other governments murdered their share in the tens or hundreds of thousands in this 20th century blood bath.

بیسویں صدی: دیگر قتل عام

Those cases that most clearly would be such crimes are the Holocaust costing 5-6 million Jews killed, of course. Both the UN Tribunals for Rwanda (overall about, 500-750 thousand Tutsi killed in 1994) and Yugoslavia (about 25,000-100,000 murdered in Bosnia-Herzegovina) have found that genocide had occurred and have meted out punishment. Some other major cases that fit or come close, with murdered in parenthesis) are the 1909-23 mass murder of Armenians, Greeks, and other Christians by the Turkish regimes (about 2.1 million Armenians and 347 thousand Greeks), Cambodian Khmer Rouge 1975-79 murder of Buddhist monks, Cambodian-Vietnamese, Muslims, and other minorities (541,000); 1904-07 German murder of Hereros, Hottentots, and Berg-Damaras of Namibia (72,000), 1967-87 Burundi murder of Hutus (150,000), World War II Croatia's murder of Serbs and Jews (655,000), Iraq's 1966-88 murder of Kurds and southern Shiites (over 100,000).

رومیل کے اعداد و شمار کے لحاظ سے بیسویں صدی دنیا کی تاریخ کی بدترین، ظالم ترین اور وحشیانہ صدی تھی جس میں ایک ارب سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ بیسویں صدی کو تاریخ انسانی کا سب سے اہم زمانہ کہا گیا، جب جمہوریت، مساوات، انسانی حقوق، سائنسی ترقی، خدا بے زاری، مذہب سے نجات، مذہبی اقدار سے لاتعلقی عام تھی۔ سترہویں صدی سے پہلے کے زمانے کو مغرب اور مشرق کے تمام سیکولر مفکرین Dark Age

تاریک زمانہ کہتے ہیں۔ کیونکہ کہ سترہویں صدی سے قبل انسان علم کا سرچشمہ انسان کو یعنی اپنے علم، تجربے، مشاہدے، جذبات، حواس، وجدان کو نہیں سمجھتا تھا اور خارجی ذریعہ علم کو علم کا لازمی حتمی قطعی آخری اور درست وسیلہ سمجھتا تھا لہٰذا سترہویں صدی سے پہلے کے تمام انسان انسان نہیں جاہل، وحشی اور درندے تھے۔ روسیل کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ سترہویں صدی سے پہلے کے وحشی جاہل انسانوں نے اپنی پوری تاریخ میں صرف ۷/۴ کروڑ لوگ قتل کیے اس میں بھی تین چوتھائی قتل چینی شہنشاہیتوں اور تاتاریوں کے ہاتھوں ہوئے۔ مذہبی بنیادوں پر قتل عام کی تاریخ بہت مختصر ہے۔ عیسائیوں کی جانب سے انکی زی سیون Inquisition اور ہندوؤں کی جانب سے بدھوں کے قتل عام کے اعداد و شمار بھی شامل کر لیے جائیں تب بھی یہ بیسویں صدی کے جمہوری قتل عام بہت کم ہوں گے لیکن سترہویں صدی کے بعد تو پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے گئے اور روسیل کے مطابق صرف بیسویں صدی کے ابتدائی اٹھاسی سال میں ۳۶ کروڑ لوگ قتل کیے گئے۔

جدید جمہوریتوں کے ہاتھوں پندرہ کروڑ لوگوں کا قتل: مائیکل مین
صرف امریکی استعمار نے ۹ کروڑ سرخ ہندیوں کو قتل کیا

پروفیسر مائیکل مین کیلی فورنیا یونیورسٹی کے سوشیالوجی کے پروفیسر ہیں، ان کی نسل کشی سے متعلق کئی کتب شائع ہو چکی ہیں، ان کتب میں کیمبرج یونیورسٹی پریس سے شائع ہونے والی The Dark Side of Democracy شائع شدہ ۲۰۰۵ء The Source of Social Power شائع شدہ ۱۹۹۳، ۱۹۸۶ء Facsist شائع شدہ ۲۰۰۴ء شامل ہیں۔ مائیکل مین کا مضمون 'جمہوریت اور نسل کشی میں فطری تعلق' جو ان کی کتاب The Dark Side of Democracy میں شامل ہے جدید جمہوریتوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے کروڑوں انسانوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، یہ مضمون لندن سے شائع ہونے والے رسالے New Left Review میں شائع ہو چکا ہے۔

مائیکل مین کے مطابق جمہوریت کے سنہری دور میں چھ کروڑ انسانوں کو قتل کیا گیا۔

۱۔ ۱۹۱۶ء سے قبل کی دہائیوں میں پچیس لاکھ یہودی مغرب کی طرف نقل مکانی کر گئے۔

۲۔ تشدد کی آخری لہر بلقان (Balkan) جنگوں کی صورت میں ظاہر ہوئی جس سے سلطنت عثمانیہ کے پانچ لاکھ عیسائی عوام شمال کی جانب فرار پر مجبور ہوئے۔

۳۔ قوم پرست ترکوں کی جانب سے آرمینیا میں دس لاکھ افراد کا قتل عام کیا گیا۔

۴۔ پچیس ہزار یوکرائنی یہودی خود یوکرائن ہی کے قوم پرستوں کے ہاتھوں مارے گئے اور پچاس ہزار سے زائد کو white آرمی نے مار ڈالا۔

۵۔ پولینڈ کے ۲۰ لاکھ باشندوں، ۲۰ لاکھ سے زائد روسیوں، اور یوکرائنوں، تقریباً دس لاکھ جرمنوں،

اندازاً ۲ لاکھ ۵۰ ہزار اہل ہنگری، ۲ لاکھ افراد کو لتھوانیا اور لاتویا اور ایستونیا سے ترک وطن کرنا پڑا۔

۶۔ نازیوں نے بیسویں صدی میں یورپ اور امریکا کے دماغی طور پر معذور افراد کے اتلاف اور منحرفین کے حیاتیاتی انضمام کا دائرہ قتل و غارت پر مبنی تطہیر تک وسیع کر دیا۔ جنگ سے قبل ہی لوگوں کی حیاتیاتی خالصیت کو بچانے کی خاطر ۷۰ ہزار دماغی مریضوں کو مار ڈالا گیا۔ اس کے بعد نیم فوجی قائدین نے نسل کشی کی رہنمائی کا بیڑہ اٹھایا تقریباً ۲ لاکھ مریضوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کارروائی کا جال اتنا پھیلا کہ اس میں پولینڈ، روس اور فرانس کے مریض بھی شامل کر لیے گئے۔

۷۔ آریائی نوآبادیاتی بنانے والوں کے لیے زمین حاصل کرنے کی غرض سے پولینڈ کے ۲۰ لاکھ باشندے قتل کر دیے گئے۔

۸۔ یورپ میں آباد یہودیوں کا تین چوتھائی یعنی ۶۰ لاکھ کے قریب قتل کر دیے گئے۔ اگرچہ ۷۰ لاکھ غیر یہودی سوویت شہری، ۳۰ لاکھ سوویت جنگی قیدیوں کا قتل بھی سیاسی تطہیر کا حصہ تھا۔

۹۔ اوستاچے Ustache نے اپنی سرزمین سے سربوں کو نکال باہر کیا جس سے ۳ لاکھ افراد کو قتل کیا۔

۱۰۔ سوشلزم کے مخالفین کا صفایا لاکھوں میں ہو گیا۔

۱۱۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دو جرمن مملکتوں کے شرق اور آسٹریا میں آباد ایک کروڑ ستر لاکھ جرمن باشندوں میں سے (سوویت یونین میں رہائش پذیر ۲۰ لاکھ جرمن اس تعداد کے علاوہ تھے) ۱۱ لاکھ جنگ کی نذر ہوئے۔

۱۲۔ تقریباً ایک لاکھ کروشیائی باشندوں کو جب وہ ہتھیار ڈال چکے تھے سربوں نے قتل کر دیا اور ایک لاکھ ۵۰ ہزار ترک باشندوں کو بلغاریہ سے نکال دیا گیا۔

دائرۃ المعارف Wikipedia: نسل کشی کے قدیم وجدید اعداد و شمار

Biblical Genocide:

بائبل کے اندر مختلف Genocide واقعات کا تذکرہ ہے جن کی صحت ذاتی رائے پر مبنی ہے ان میں چند یہ ہیں:

☆ مصریوں کے ہاتھوں اسرائیل کی غلامی اور یہودیوں کا قتل۔

☆ کنعانی Canaanite افراد اور Moses اور Joshua کے درمیان جنگ۔

ایران میں سکندر اعظم کی نسل کشی:

مقدونیہ کا جنرل سکندر اعظم اور اس کی فوج نے ایران کے دارالحکومت میں ۶۰ ہزار افراد کو قتل کیا۔ اس نے تقریباً تمام باشندوں کو ذبح کیا اور مقامات کو نذر آتش کیا۔

رومۃ الکبریٰ

رومن امپائر کے ہاتھوں نسل کشی کے مندرجہ ذیل واقعات بیان کیے گئے ہیں:

- ☆ Helvetti کے خلاف Caesais جنگ میں ۶۰ فیصد قبیلے مار دیے گئے، ۲۰ فیصد غلامی میں لے لیے گئے۔
- ☆ Carthage: شہر مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔
- ☆ یروشلم: شہر جلا دیا گیا اور شہریوں کو غلام بنا لیا گیا۔

فرانس:

Albegensian Crusade (۱۲۰۹۔۱۲۲۹ء) کو Genocide تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ Cathar افراد کے خلاف تھا۔ اس میں Inquisition اور فوج کا استعمال ہوا۔

Vendee کی جنگیں: اس میں عورتیں اور بچے ہلاک ہوئے۔

امریکہ:

بعض اوقات منظم اور بعض اوقات غیر منظم طویل قتل عام وجود میں آیا۔ یورپیوں کے ہاتھوں شمالی اور جنوبی امریکا کے باشندوں کا قتل عام تاریخ کا سب سے طویل قتل عام ہے۔ بعض اعداد و شمار کے مطابق امریکا اور کینیڈا سے پہلے کے مقامی باشندوں کی تعداد ۱۸ لاکھ سے زائد تھی۔ اگلی چار صدیوں میں ان کی تعداد دو لاکھ ۳۷ ہزار رہ گئی اور اکثر مقامی باشندے ختم ہو گئے۔ میکسیکو کی آبادی ۳ کروڑ سے ۲۰ لاکھ تک رہ گئی۔

کرسٹوفر کولمبس کی امریکا آمد کے بعد مقامی آبادی کم سے کم تر ہوتی گئی۔

کینیڈا:

Beothuk عوام جو نیو فاؤنڈ لینڈ کی سب سے قدیم آبادی ہے یورپی نو آبادیوں کے جھگڑوں کے نتیجے میں ختم ہو چکی ہے۔

گوئٹے مالا:

خانہ جنگی کے دوران سرخ ہندیوں کی ایک بڑی تعداد قتل ہو گئی۔ تقریباً ۷۵ ہزار ۶ سو مایا (Maya) آبادی کو ختم کر دیا گیا۔

کانگو:

بادشاہ لیوپولڈ دوم کے زمانے میں کانگو کی آزاد ریاست کو بہت ساری جانوں کے ضیاع کا سامنا کرنا پڑا جو کہ مقامی آبادی کے ساتھ ربر کی پیداوار کے تنازعے کی وجہ سے ہوا۔

لیوپولڈ دوم (بلجئیم کے) کی شہرت ایک ظالم تباہ کن خود قائم کردہ آزاد حکومت کے طور پر تھی اس کی

قائم کردہ Free State خود بلجیم سے جغرافیائی طور پر ۷۶ گنا بڑی تھی۔ ۱۸۸۰ء اور ۱۹۲۰ء کے دوران کانگو کی آبادی نصف ہو گئی۔ ۱۰ ملین سے زائد مقامی آبادی کو بورژوا طبقے کی وجہ سے بھوک، قتل اور بیماریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

آسٹریلیا:

آسٹریلیا کی قدیم آبادی کو قفقازی (Caucasian) نسل کے لوگوں کے نفوذ کی وجہ سے کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی آبادی کو بہت سے نئے آبادکاروں کی وجہ سے بیماریوں کا سامنا کرنا پڑا، جس سے وہ موت کا شکار ہوئے۔

قدیم آبادی کے بچوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کے آسٹریلوی حکومت کے عمل کو Genocide قرار دیا گیا۔ جب کہ تسمانیہ میں جو نسلی طور پر مختلف، قدیم آبادی موجود تھی انیسویں صدی میں ختم ہو گئی۔

جرمن، شمال مغربی افریقہ:

جرمنی نے افریقہ کے Herero اور Nama قبائل کے افراد کا قتل عام کیا جس کو Genocide کی ابتدائی واقعات کے ضمن میں بیان کیا جائے گا۔ مجموعی طور پر ۶۵۰۰۰ ہریرو، کل ہریرو باشندوں کا ۳۰ فیصد) قتل کیے گئے اور ۱۰۰۰۰ ناما قتل کیے گئے۔ یہ Genocide قحط اور کنوؤں میں زہر ملانے کے ذریعے کیا گیا۔

ترکی:

عثمانیہ سلطنت نے ۶ لاکھ سے ۱۵ لاکھ آرمینیائی باشندے قتل کیے۔ ترکی حکومت سرکاری طور پر اس کی تردید کرتی ہے۔ ۳ سے ۶ لاکھ یونانی Pontian عثمانیہ سلطنت میں مارے گئے۔

جرمن نازی نسل کشی:

ہولوکاسٹ میں تقریباً ایک کروڑ ۱۰ لاکھ افراد قتل ہوئے جن میں ۶۰ لاکھ یورپی اور یہودی تھے۔ جن میں سے ۳۰ لاکھ پولش اور یہودی تھے۔

اس Genocide میں ۵۷ لاکھ روسی شہری اور ۳۳ لاکھ جنگی قیدی ہلاک ہوئے۔

دوسری جنگ عظیم میں جاپانی نسل کشی:

بعض لوگوں کے دعویٰ کے مطابق ۳ لاکھ افراد مارے گئے۔ اس قتل عام میں چینی آبادی کو نشانہ بنایا گیا۔

کیمیائی جنگ کے دوران ۳۰ ہزار افراد مارے گئے۔

۱۹۴۲ء میں نسلی چینی سنگاپور میں منظم طور پر قتل کیے گئے اس قتل عام کی تعداد ۵ ہزار اور ۱۰ ہزار تک تھی۔

مجموعی طور پر ۲ کروڑ چینی، ۹۰ لاکھ کوریائی، ۲۰ لاکھ تائیوانی اور بڑی تعداد میں جنوب مشرقی ایشیائی شہری دوسری جنگ عظیم میں قتل کیے گئے۔

کمبوڈیا:

۱۹۷۵ سے ۱۹۷۹ء کے دوران ۱۷ لاکھ کمبوڈیائی باشندے ہلاک ہو گئے۔

سوڈان:

۲۱/اکتوبر ۲۰۰۲ء کو امریکی حکومت نے سوڈان پر ۲۰ لاکھ شہریوں کو ۱۹۸۳ء سے جاری شہری جنگ کے دوران ہلاک کرنے کا الزام لگایا۔ ۲۰۰۴ء میں یہ بات بالعموم مشہور ہوئی Janjaweed Militia (خانہ بدوش عرب گلہ بان جن کو سوڈانی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی) نے مہم شروع کی اور ۸۰ سیاہ فام افریقی گروپوں کو دارفر کے علاقے سے نکال دیا۔

ویتنام:

ویتنام جنگ کے اختتام کے بعد یعنی امریکا کے انخلاء کے بعد ویتنامی حکومت نے ایسے لوگوں کے خلاف آپریشن شروع کیا جنھوں نے امریکیوں کی مدد کی تھی۔

برطانوی جنرل ڈائر:

جنرل ڈائر نے ۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء میں دس ہزار مردوں، عورتوں اور بچوں کے جو جلیانوالہ باغ میں جمع تھے اور عوامی اجتماعات پر پابندی کے باوجود احتجاج کر رہے تھے، وارننگ کا ایک لفظ کہے بغیر ۵۰ فوجیوں کو حکم دیا کہ وہ اجتماع پر فائرنگ کر دے۔ ۱۰ سے ۱۵ منٹ کے دوران ۱۶۵۰ راؤنڈ مجمع پر پھینک دیے گئے تقریباً ۴۰۰ شہری ہلاک ہوئے اور ۱۲۰۰ زخمی چھوڑ دیے گئے جن کو طبی امداد نہیں دی گئی۔

انڈین نیشنل کانگریس کی سکھوں کے خلاف نسل کشی:

۱۹۸۴ء میں ۴ ہزار سکھ مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہندوؤں نے ہلاک کر دیا۔ صرف دہلی میں ۲۷۳۳ سکھوں کو زندہ جلا دیا گیا اور قتل و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

جموں اور کشمیر:

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جموں و کشمیر میں دس ہزار ہندو شہری ہلاک ہوئے اور نصف ملین ہندو شہریوں کو ریاست سے باہر بھیج دیا گیا۔ [مسلمان مقتولین کی فہرست نہیں دی گئی ہے]

عراق:

ایرانی کرد شہریوں کو صدام حسین کی حکومت نے ہلاک کیا۔ کردوں کے علاقے حلبچہ پر کیمیائی ہتھیاروں سے ۸۶-۱۹۸۸ء میں حملہ کیا گیا۔

انسائیکلوپیڈیا Wikipedia میں نسل کشی کے ضمن میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار درج ہیں یہ معلومات انسائیکلوپیڈیا کی ویب سائٹ http://en.wikipedia.org/wiki/ genocide-in-history سے لیے گئے ہیں۔

دائرۃ المعارف انکارٹا: مہذب دنیا میں نسل کشی کے اعداد وشمار

انسائیکلوپیڈیا انکارٹا Encyclopedia Encarta میں نسل کشی سے متعلق اعداد وشمار درج ذیل ہیں، ان اعداد وشمار میں اور رومیل کی کتاب کے بیان کردہ اعداد وشمار میں فرق دیکھا جا سکتا ہے خصوصاً ترکوں کے ہاتھوں مقتولین کی تعداد رومیل کے مطابق ۳۰ لاکھ سے زائد ہے جب کہ انکارٹا کے اعداد وشمار میں یہ تعداد ۸ سے ۱۸ لاکھ ہے۔

☆ ۵۶ سے ۵۹ لاکھ یہودی اور لاکھوں دوسری جنگ عظیم دوم کی نسل کشی (Genocide) میں قتل کیے گئے۔

☆ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اقوام عالم نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ جنگوں میں عام شہریوں کو قتل نہ کیا جائے۔

☆ بیسویں صدی میں بڑے پیمانے پر قتل عام Mass Killing قومی حکمت عملیوں کا حصہ بن گیا۔

☆ ۱۹۱۴۔۱۹۱۸ء میں سلطنت عثمانیہ نے جنگ عظیم اول کے دوران دس سے اٹھارہ لاکھ آرمینیائی باشندوں کو بے دخل کیا۔

☆ جنگ عظیم دوم میں ۵۰ سے ۶۰ لاکھ یہودی اور کئی لاکھ دوسرے افراد کو جرمنی کے لیے ناقابل برداشت قرار دیا گیا۔

☆ ہر تین یہودیوں میں سے دو یہودی جرمنی کے زیر تسلط علاقے میں قتل کیے گئے۔ روسی جنگی قیدیوں کی نصف اور مشرقی یورپ کے ۱۰ سے ۲۰ فی صد افراد قتل کیے گئے۔

☆ سابق یوگوسلاویہ کی کروٹ حکومت دو لاکھ سے تین لاکھ چالیس ہزار سرب شہریوں کی قاتل ہے۔

☆ دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک ۱۱۶ اقوام نے نسل کشی کی کوشش یا نسل کشی کا ارتکاب کیا ان اقوام کا تعلق ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکا سے ہے۔

☆ ۱۹۷۵ء میں انڈونیشیا نے مشرقی تیمور پر قبضہ کیا جس کے نتیجے میں ۲ لاکھ اموات ہوئیں جو کل آبادی کا ایک تہائی تھا۔

☆ گوئٹے مالا کی خانہ جنگی کے دور میں (۶۰۔۱۹۹۶ء) دو لاکھ افراد گوئٹے مالا حکومت کے عسکری بازو کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

☆ روانڈا میں ۱۹۹۴ء میں ۵ سے ۱۰ لاکھ افراد قتل ہوئے۔ ان میں سے بیشتر Tutsi گروپ سے تعلق رکھنے والے تھے۔

☆ ۱۹۹۱ تک سابق یوگوسلاویہ میں ہزاروں بوسنیائی مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔

☆ ۱۹۷۵ تک Khmer Rouge نامی کیمونسٹ تحریک جس کی سربراہی پول پوٹ Pol Pot کے ہاتھوں تھی، نے ۱۷ لاکھ کمبوڈیائی باشندوں کا قتل عام کیا۔

☆ ۱۹۶۹ء میں امریکا نے خفیہ B52 بمباری کی تا کہ نیشنل لبریشن فرنٹ اور شمالی ویتنامیوں کا قبضہ کمزور کیا جا سکے۔ امریکا نے چار لاکھ نوے ہزار میٹرک ٹن (پانچ لاکھ چالیس ہزار ٹن) وزنی بم اگست ۱۹۷۳ء میں برسائے۔ ۱۷ اپریل ۱۹۷۵ء میں جب بمباری ختم ہوئی تو Khmer Rouge کی فوج کو شکست ہوئی۔ تقریباً سترہ لاکھ کمبوڈیائی باشندے قتل ہوئے۔ Khmer Rouge کی حکومت کے بعد تقریباً ۴ لاکھ ۲۵ ہزار چینی کمبوڈیائی میں سے نصف آبادی باقی بچی۔ جب کہ چار لاکھ پچاس ہزار چینی کمبوڈیائی باشندوں میں سے اکثر کو ملک سے بے دخل کر دیا گیا۔ ان میں سے اکثر کو Khmer Rouge نے نکال دیا باقی قتل کر دیے گئے۔ دو لاکھ پچاس ہزار مسلمان میں سے نوے ہزار قتل کر دیے گئے باقی کو نکال باہر کیا گیا۔

آرمینیائی قتل:

سلطنت عثمانیہ میں رہنے والے آرمینیائی باشندوں کے اکثر قتل ۱۹۱۳ء میں جنگ عظیم اول کے موقع پر ہوئے۔ ۱۰ لاکھ سے زائد آرمینیائی ختم کر دیے گئے۔ آرمینیائی Genocide جنگ عظیم اول کے پردے میں کیا گیا۔ جنگ عظیم سے قبل آرمینیائی باشندوں کی آبادی ۱۸ لاکھ تھی۔ جنگ کے بعد ۱۹۱۹ء میں انکشاف ہوا کہ آٹھ لاکھ باشندے قتل کیے جا چکے ہیں۔ بچ جانے والوں نے فرار کی راہ اختیار کی۔ جن میں دو لاکھ پچاس ہزار قفقاز کی طرف بھاگے جو اب آرمینیا کہلاتا ہے اور کچھ جارجیا کی طرف۔

روانڈا:

اپریل ۱۹۹۴ء میں صدر Habyaremana اور برونڈائی کے صدر Cyprien قتل کر دیے گئے۔

Habyaremana کی موت نے لسانی فسادات کو فروغ دیا۔

اگلے چند ماہ میں یہ اندازہ لگایا گیا کہ پانچ سے دس لاکھ روانڈا کے باشندوں میں جن میں اکثر Tutsi قبیلے کی تھی، قتل کر دی گئی۔ وسط جولائی میں بارہ لاکھ روانڈا کی آبادی زائر کی طرف ہجرت کر گئی۔

ابتدائی اگست میں جنگ سے قبل روانڈا کی چوتھائی آبادی یا تو قتل ہو گئی یا ملک سے فرار ہو گئی۔

Holocaust:

یورپ میں یہودیوں کا مکمل صفایا۔ جیسا کہ جنگ عظیم دوم کے بعد نازی فوجیوں نے یورپ کے اکثر ممالک کو فتح کر لیا تھا۔ لاکھوں یہودی قتل کیے گئے، قید کیے گئے، اذیتی کیمپوں میں رکھے گئے جہاں وہ مار دیے گئے یا بھوک اور بیماری سے ہلاک ہوئے۔ جنگ کے بعد ۵۶ لاکھ سے ۵۹ لاکھ یہودی مرد و عورتیں قتل ہوئے۔

شمال مغربی افریقہ Herero قتل عام (نمیبیا):

۱۹۸۳ء میں اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق جرمنوں نے شمالی مغربی افریقہ کی Herero اور

Nama آبادی کو بے دخل کرنے کی کوشش کی جو کہ بیسویں صدی کے (Genocide) نسل کشی کی ابتدائی کوشش تھی۔ مجموعی طور پر ۶۵ ہزار ہریرو (کل آبادی کا ۸۰ فی صد) اور دس ہزار ناما (کل ناما آبادی کا ۵۰ فیصد) قتل یا ہلاک ہو گئے۔

۱۹۰۴ء میں جنرل لوتھر وان ٹروتھا Lother Von Trotha کو دس ہزار رضا کاروں کے ساتھ بغاوت کو کسی بھی طریقے سے کچلنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے ایک حکم نامہ جاری کیا۔

”میں جرمنوں کا عظیم جنرل اس خط کے ذریعے ہریرو کے عوام سے مخاطب ہوں۔ جرمنی کی سرحدوں میں کوئی ہریرو باشندہ اگر پایا گیا خواہ مسلح ہو یا غیر مسلح، اسے گولی ماردی جائے گی، میں کسی بھی بچے یا عورت کو برداشت نہیں کروں گا“۔

جرمنی نے اسی ہزار ہریرو باشندوں کو قتل کر دیا۔ اکثر کنووں میں لٹکا کر مار ڈالے گئے۔

[یہ اعداد و شمار انسائیکلوپیڈیا کی سی ڈی ۲۰۰۴ سے لیے گئے ہیں۔]

BIBLIOGRAPHY

ACKERKNECHT, ERWIN H. 1982. A Short History of Medicine. Baltimore: JohnsHopkins UniversityPress.

ACKERMAN, Peter and DUVALL, Jack. 2000. A Force More Powerful: A Century of Nonviolent Conflict. New York: St. Martin's Press. - and KRUEGLER, C. 1994. Strategic Nonviolent Conflict. Westport, Conn.: Praeger.

ALMOND, GABRIEL A. 1996. Political science: the history of the discipline. In Good in and Klingemann 1996: 50-96.

ALPEROVITZ, GAR 1995. The Decision to Use the Atomic Bomb. New York: Alfred A. Knopf

AMATO, JOSEPH A. 1979. Danilo Dolci: a nonviolent reformer in Sicily. In Bruyn and Rayman 1979: 135-60.

ANDERSON. RICHARD C. 1994. Peace Was In Their Hearts: Conscientious Objectors in World War II. Watsonville. Calif: Correlan Publications.

AQUINO. CORAZON C. 1997. Seeds of nonviolence. harvest of peace: The Philippine revolution of 1986. In Grisolia et al. 1997: 227-34.

ARENDT. HANNAH.1970. On Violence. New York: Harcourt. Brace & World. - 1982. Lectures on Kant's Political Philosophy. Chicago; University of Chicago Press.

ARISTOTLE. 1962. The Politics. trans. T.A. Sinclair. Harmondsworth:

Penguin.

AUNG SAN SUU KYI. 1998. The Voice of Hope. New York: Seven Stories Press.

ADALIAN, ROUBEN. (February 1991) "The Armenian Genocide: Context and Legacy." SOCIAL EDUCATION 55.

AHMAD, RAFIQ 1984. (Ed.). THE ASSAM MASSACRE 1983 (A DOCUMENTARY RECORD). Lahore, Pakistan: Center for South Asian Studies, University of the Punjab,

ARENS, RICHARD.1976. (Ed.) GENOCIDE IN PARAGUAY. Philadelphia: Temple University Press.

ANDREOPOULOS, G. 1994. Genocide: Conceptual and Historical Dimensions. Philadelphia: University of Pennsylvania Press.

ARMENISCHE FRAGE. 1988. The Armenian Genocide, Vol. 2: Documentation. Munich: author (in German).

BANERJEE. MUKULIKA. 2000. The Pathan Unarmed. Karachi & New Delhi: Oxford University Press.

BAXTER. ARCIDBALD. 2000. We Will Not Cease. Baker, Ore.: The Eddie Tern Press.

BEISNER. ROBERT L. 1968. Twelve Against Empire: The Anti- Imperialists, 1898 - 1900. New York: McGraw-Hill.

BENNETT, LERONE JR. 1993. Before the Mayflower: A History of Black America. New York: Penguin Books.

BING, ANTHONY G. 1990. Israeli Pacifist: The Life of Joseph Abileah. Syracuse, N.Y.: Syracuse University Press.

BOORSTIN, DANIEL J. 1983. The Discoverers. New York: Random House.

____ 1992. The Creators. New York: Random House.

____ 1998.; The Seekers. New York:

BOSERUP, ANDERS and MACK, ANDREW. 1974. War without Weapons: Non-Violence in National Defence. New York: Schocken Books.

BOUBALT, GUY; GAUCHARD, BENOIT, and MULLER, JEAN-MARIE. 1986. Jacques de Bollardie re: Compagnon de toutes les libe rations. Paris: Non-Violence Actualite.

BOULDING, ELISE. 1980. Women, the Fifth World. New York: Foreign Policy Association. ____ 1992. New Agendas for Peace Research: Conflict and Security Reexamined. Boulder, Colo.: Lynne Rienner Publishers.

BOURNE, RANDOLPH S. 1964 (1914-1918). War and the Intellectuals. New

York: Harper & Row.

BROCK, PETER 1968. Pacifism in the United States: From the Colonial Era to the First World War. Princeton: Princeton University Press.

____ 1970. Twentieth Century Pacifism. New York: D. Van Nostrand.

____1972. Pacifism in Europe to 1914. Princeton: Princeton University Press.

____1990. The Quaker Peace Testimony 1660 to 1914. York, England: Sessions Book Trust.

____ 1991a. Studies in Peace History. York, England: William Sessions Limited. 1991 b.

BACQUE, JAMES 1989. OTHER LOSSES: AN INVESTIGATION INTO THE MASS DEATHS OF GERMAN PRISONERS. Toronto, Canada: Stoddard Publishing Company,

Barron, John and Anthony Paul. 1977 PEACE WITH HORROR: THE UNTOLD STORY OF COMMUNIST GENOCIDE IN CAMBODIA. London: Hodder and Stoughton, [American edition titled MURDER OF A GENTLE LAND. New York: Reader's Digest Press-Thomas Y. Crowell].

BAUER, YEHUDA 1982. A History of The Holocaust. New York: Franklin Watts

Baxter, David M. 1970 "The Serbo-Croatian Antagonism." In OPERATION SLAUGHTERHOUSE: EYEWITNESS ACCOUNTS OF POSTWAR MASSACRES IN YUGOSLAVIA, [edited] by John Prcela and Stanko Guldescu. Philadelphia: Dorrance & Co.,

BIGELOW, KATHERINE 1992. "A campaign to deter genocide: the Bah‡" experience." In GENOCIDE WATCH, [edited] by Helen Fein. New Haven: Yale University Press.

BOYAJIAN, DICKRAN H 1972. ARMENIA: The Case for a Forgotten Genocide. Westwood, New Jersey: Educational Book Crafters.

BROWNING, CHRISTOPHER R 1992, 1995. The Path to Genocide: Essays on Launching the Final Solution. Cambridge University Press.

BEDROSSYAN, M. (ed.) 1983. The First Genocide of the 20th Century: The Perpetrators and their Victims. N.p.: Voskedar Publishing.

BRUYN, SEVERYN T. and RAYMAN,. PAULA M., eds. 1979. Nonviolent Action and Social Change. New York: Irvington Publishers.

BURTON, JOHN. 1979. Deviance, Terrorism & War: The Process of Solving Unsolved Social and Political Problems. New York: St. Martin's Press.

CANADA, GEOFFREY. 1995. Fist Stick Knife Gun: A Personal History of

Violence in America. Boston: Beacon Press.

CHARNY, ISRAEL W. 1982. How Can We Commit the Unthinkable? Genocide the Human Cancer. Boulder, Colo.: Westview Press.

COMMAGER, HENRY S. 1991. The history of American violence: an interpretation. Pp. 3-28 in Violence: The Crisis of American Confidence, ed. Hugh D. Graham. Baltimore: Johns Hopkins Press.

CONSER, WALTER H., Jr.; McCARTHY, RONALD M.; TOSCANO, DAVID J.; and SHARP, GENE., eds. 1986. Resistance, Politics and the Struggle for Independence.. Boulder, Colo.: Lynne Rienner Publishers.

COOK, PHILIP J. and LUDWIG, JENS. 1997. Guns in America: national survey on private ownership and use of firearms. Research in Brief, no. 1026. Washington: National Institute of Justice.

COONEY, ROBERT and MICHALOWSIQ, HELEN, eds. 1987. Power of the People: Active Nonviolence in the United States. Philadelphia, Penn.: New Society Publishers.

COUSINS, NORMAN. 1987. The Pathology of Power. New York: W.W. Norton. CRAIG, LEON H. 1994. The War Lover: A Study of Plato' Republic. Toronto: University of Toronto Press.

CROZIER, FRANK P. (Brig. Gen.). 1938. The Men I Killed. New York: Doubleday.

CHAMBERLAIN, MIKE 1982. "The people of East Timor," In GENOCIDE AND HUMAN RIGHTS: A GLOBAL ANTHOLOGY, [edited] by Jack Nusan Porter. Washington, D.C.: University Press of America.

CHARNY, ISRAEL 1982 W. HOW CAN WE COMMIT THE UNTHINKABLE? GENOCIDE: THE HUMAN CANCER. Boulder Westview: Colorado Press.

CHAUDHURI, KALYAN 1972. GENOCIDE IN BANGLADESH. Orient: New Delhi Longman.

CHINA'S BLOODY CENTURY: GENOCIDE AND MASS MURDER SINCE 1900. New Brunswick, New Jersey: Transaction Publishers

CAMPBELL, KENNETH J 2001. Genocide and the Global Village. Palgrave Macmillan.

CHANDLER, DAVID 1996. The Killing Fields. Twin Palms.

CORZINE, JAY; and WHITT, HUGH P. 1994. The Currents of Lethal Violence: An Integrated Model of Suicide and Homicide. Albany: State University of New York Press.

DENSON, JOHN V., ed. 1997. The Costs of War: America's Pyrrhic Victories. New Brunswick, N.J.: Transaction Books.

CAPTAIN P.A.REYNOLDS "Notes on the Thags" Journal of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland, 4, (1837),

DESTEXHE, ALAIN 1995. Rwanda and Genocide in the Twentieth Century. Trans. Alison Marschner. New York University Press.

DU PREEZ, P. 1994. Genocide: The Psychology of Mass Murder London: Boyars/Bowerdean.

EASWARAN, EKNATH, 1999. Nonviolent Soldier of Islam. Tomales, Calif.: Nilgiri Press.

EIBL-EIBESFELDT, IRENAUS. 1979. The Biology of Peace and War: Men, Animals, and Aggression. New York: Viking Press.

E.LAKE 1873. Sir Donald McLeod: A Record of Forty-Two Years' Service in India. London. (Donald McLeod was once assistant to Sleeman in the Thuggee Department and later Lieutenant - Govemor of the Punjab.)

FINER, SAMUEL E. 1997. The History of Government From the Earliest Times. New York: Oxford University Press. Vol. i, Ancient Monarchies and Empires. Vol. ii, The Intermediate Ages. Vol. iii, Empires, Monarchies, and the Modem State.

FISHER, ROGER and URY, WILLIAM. 1981. Getting to Yes. Boston, Mass.: HoughtonMifflin Company.

FOSTER., CATHERINE. 1989. Women for All Seasons: The Story of the Women's International League for Peace and Freedom. Athens: University of Georgia Press.

FROMM, ERICH. 1973. The Anatomy of Human Destructiveness. New York: Holt. Rinehart and Winston.

FUNG, YU-LAN. 1952. History of Chinese Philosophy, trans. Derke. Bodde. Vol. i. Princeton: Princeton University Press.

FRELICK, BILL 1992. "Refugees: contemporary witnesses to genocide." In GENOCIDE WATCH, [edited] by Helen Fein. New Haven: Yale University Press.

FEIN, H. 1979. Accounting for Genocide. New York: Free Press.

FEINGOLD, H. 1983. "How Unique is the Holocaust?" in A. Grobman & D. Landes (eds.), Genocide: Critical Issues of the Holocaust. Los Angeles: Simon Wiesenthal Center.

FRIEDLANDER, H. 1995. The Origins of Nazi Genocide: From Euthanasia to the Final Solution. Chapel Hill: University of North Caroline Press.

____ 1958-1994. The Collected Works of Mahatma Gandhi. Vols. 1-100. New Delhi: Publications Division, Ministry of Information and Broadcasting, Government of India.

GARRISON, FIELDING H. 1929. An Introduction to the History of Medicine. Philadelphia, Perm: W.B. Saunders.

GIOGLIO, GERALD R. 1989. Days of Decision: An Oral History of Conscientious Objectors in the Military in the Vietnam War. Trenton, N.J.: Broken Rifle Press.

GIORGI, PIERO. 1999. The Origins of Violence By-Cultural Evolution. Brisbane, Australia: Minerva E&S.

GIOVANNITTI, LEN and FREED, FRED. 1965. The Decision to Drop the Bomb. New York: Coward-McCann.

GOLDMAN, RALPH M. 1990. From Warfare to Party Politics: The Critical Transition to Civilian Control. Syracuse: Syracuse University Press.

GOODIN, ROBERT E. and KLINGEMANN, HANS-DIETER, eds. 1996. A New Handbook of Political Science. Oxford: Oxford University Press.

GREENLEAF, ROBERT K. 1977. Servant Leadership: An Inquiry into the Nature of Legitimate Power and Greatness New York: Paulist Press.

GRISOLIA, JAMES S. et al., eds. 1997. Violence: From Biology to Society. Amsterdam: Elsevier.

GROSSMAN, DAVE (Lt. Col.). 1995. On Killing: The Psychological Cost of Learning to Kill in War and Society. Boston, Mass.: Little Brown.

DeGAETANO, GLORIA 1999. Stop Teaching Ou Kids to Kill. New York: Crown Publishers.

GUETZKOW, HAROLD. 1955. Multiple Loyalties: Theoretical Approach to a Problem in International Organization. Princeton, N.J.: Center for Research on World Political Institutions, Princeton University.

GRABER, G. 1996. Caravans to Oblivion: The Armenian Genocide, 1915. New York: John Wiley.

GUTMAN, R. 1993. A Witness to Genocide. New York: Macmillan.

HALBERSTAM, DAVID. 1998. The Children. New York: Random House.

HOFSTADTER, RICHARD. 1971. Reflections on violence in the United States. Pp. 3-43 in American Violence: A Documentary History, ed. Richard Hofstadter and Michael Wallace. New York: Vintage

HOROWITZ, Irving Louis 1976. GENOCIDE: STATE POWER AND MASS

MURDER. New Brunswick, New Jersey: Transaction Books.

HEUVELINE, P. 2001. "Approaches to Measuring Genocide: Excess Mortality during The Khmer Rouge Period," in Chirot and Seligman (eds.), Ethnopolitical Warfare.

HOROWITZ, I. 1989. Taking Lives: Genocide and State Power. New Brunswick, N.J.: Transaction.

JONASSOHN, K. 1990. The History and Sociology of Genocide. New Haven, Conn.: Yale University Press.

JONASSOHN, K., with Bjornson, K. 1998. Genocide and Gross Human Rights Violations in Comparative Perspective. New Brunswick, N.J.: Transaction.

J.L.SLEEMAN. 1993. Thug: or, A Million Murders. Sampson Low, Marston & Co, London.

JAVEED MAJEED. 1996. "Meadows Taylor's' Confessions of a Thug The Anglo-Indian Novel as a Genre in the Making", in Bart Moore - Gilbert (ed.), Writing India. 1757-1990. Manchester University Press. Manchester.

JOHN MASTERS (1914-1983) 1952. (First edition). The Deceivers (A novel on the Thugs). Michael Joseph, London. 6th impression. 1956.

JOHN SHAKESPEAR. 1820. "Observations Regarding Badheks and Th'egs" Asiatic Researches. XIII,

KELLY, ALWRANCE, 1996, war before civilization: The myth of the peaceful savage Oxford: Oxford University Press.

KING, MARTIN LUTHER, JR 1998. The Autobiography of Martin Luther King, Jr., ed. Clayborne Carson. New York: Warner Books.

KOHN. STEPHEN M. 1987. Jailed for Peace: The History of American Draft Law Violators. 1658-1985. New York: Praeger.

KONRAD, A. RICHARD. 1974. Violence and the philosopher. Journal of Value Inquiry, 8: 37-45.

KOHEN, ARNOLD AND JOHN TAYLOR 1979. AN ACT OF GENOCIDE: INDONESIA'S INVASION OF EAST TIMOR. London: TAPOL.

KRESSEL, NEIL JEFFREY 2001. Mass Hate: The Global Rise of Genocide and Terror. Westview.

KIERNAN, BEN 1998. The Pol Pot Regime: Race, Power, and Genocide in Cambodia Under the Khmer Rouge, 1975-79. Yale University Press.

KEANE, FERGAL 1997. Season of Blood: A Rwandan Journey. Viking, 1996. Penguin.

KABIRIGI, L. 1994. Genocide an Rwanda: Honte pour lhumanite. Kigali, Rwanda: PREFED.

KAISER, H. 1996. "Denying the Armenian Genocide: The German Connection."

KIRK, T. 1996. Nazism and the Working Class in Austria. Cambridge: Cambridge University Press.

LEWER, NICK and SCHOFIELD, STEVEN, eds. 1997. Non-Lethal Weapons: A 'Fatal Attraction! London: Zed Books.

LEWIS, JOHN. 1973(1940). The Case Against Pacifism. Introd. Carl Marzani. New York: Garland.

LIGT, BARTHELEMY de. 1972(1938). The Conquest of Violence: an Essay on War and Revolution, introds. George Lakey and Aldous Huxley. New York: Garland.

LEMARCHAND, R. 19955. Burundi: Ethnic Conflict and Genocide. New York: Cambridge University Press

MAHONY, LIAM and EGUREN, LUIS E. 1997. Unarmed Bodyguards. West Hartford, Conn.: Kurnarian Press.

MANN, CORAMAERICHEY. 1996. When Women Kill. Albany: State University of New York Press.

MARX. KARL and ENGELS, FRIEDRICH. 1976(1848). The Communist Manifesto, introd. A.J.P. Taylor. Harmondsworth: Penguin.

MORRISEY, WILL. 1996. A Political Approach to Pacifism. 2 vols. Lewiston, N.Y.: Edwin Mellen Press.

MORTON, BRUCE E. 2000. "The Dual Quadbrain Model of Behavioral Laterality." Department of Biochemistry and Biophysics, School of Medicine, University of Hawai'i.

MOSKOS, CHARLES and CHAMBERS, JOHN W. II, eds. 1993. The New Conscientious Objectors: From Sacred to Secular Resistance. Oxford: Oxford University Press.

MAZIAN, FLORENCE 1990. WHY GENOCIDE? THE ARMENIAN AND JEWISH EXPERIENCES IN PERSPECTIVE. Ames: Iowa State University Press.

MOHAN, Jag (Ed.) 1971. THE BLACK BOOK OF GENOCIDE IN BANGLA DESH. New Delhi, India: Geeta Book Center.

MYNZEL, MARK 1976. "Manhunt." In GENOCIDE IN PARAGUAY, [edited] by Richard Arens. Philadelphia: Temple University Press.

MELSON, ROBERT. 1992 Revolution and Genocide: On the Origins of the

Armenian Genocide and the Holocaust. University of Chicago Press.

MINOW, MARTHA 1998. Between Vengeance and Forgiveness: Facing History after Genocide and Mass Violence. Beacon.

MESTROVIC, S. (ed.). (1996). Genocide After Emotion: The Postemotional Balkan War. London: Routledge.

MILDT, D. 1996. In the Name of the People: Perpetrators of Genocide in the Reflection of their Post-War Prosecution in West Germany: The 'Euthanasia' and 'Aktion Reinhard' Trial Cases. The Hague: Nijhoff.

MIRKOVIC, D. 1993. "Victims and Perpetrators in the Yugoslav Genocide 1941-1945." Holocaust and Genocide Studies, vol. 7.

NAGLER, MICHAEL N. 1982. America Without Violence. Covelo, Calif: Island Press.

NOBEL PRIZE RECIPIENTS. 1981. Manifesto of Nobel prize winners. IFDA Dossier, 25.

NATH, VANN 1998. A Cambodian Prison Portrait. One Year in the Khmer Rouge's S-21. White Lotus.

PAIGE, GLENN D. 1968. The Korean Decision: June 24-30, 1950. New York: Free Press.

____ SATHA-ANAND, CHAIWAT; AND GILLIATT, SARAH, eds. 1993a. Islam and Nonviolence. Honolulu: Center for Global Nonviolence Planning Project, Matsunaga Institute for Peace, University of Hawai'i. Available at www.globalnonviolence.org.

PALMER, STUART H. 1960. A Study of Murder. New York: Thomas Y. Crowell.

PAREKH, BHIKHU. 1989a. Colonialism, Tradition and Reform: An Analysis of Gandhi's Political Discourse.. Newbury Park: Sage.

POWERS, ROGUERS AND VOGELE, WILLIAM; Beds 1997. Protest, power and change: An Encyclopedia of National action from Act up to women suffrage. New York and London; Garland publishing.

PARIS, EDMOND 1961.. GENOCIDE IN SATELLITE CROATIA, 1941-1945: A RECORD OF RACIAL AND RELIGIOUS PERSECUTIONS AND MASSACRES. Translated by Lois Perkins. Chicago, Illinois: The American Institute for Balkan Affairs.

PORTER, JACK NUSAN 1982. "Introduction: what is genocide? Notes toward a definition." In GENOCIDE AND HUMAN RIGHTS: A GLOBAL ANTHOLOGY, [edited] by Jack Nusan Porter. Washington, D.C.: University

Press of America.

PRUNIER, GERARD 1995. The Rwanda Crisis: History of a Genocide. Columbia University Press.

PRAN, DITH, AND KIM DEPAUL 1999. Children of Cambodia's Killing Fields: Memoirs of Survivors. Yale University Press.

PRUNIER, GERARD 1995. The Rwanda Crisis: History of a Genocide. Columbia University Press.

PARIS, E. 1961. Genocide in Satellite Croatia, 1941-1945. Chicago: American Institute for Balkan Affairs.

POWERS, ROGER S. and VOGELE, WILLIAM B., eds.1997. Protest, Power and Change: An Encyclopedia of Nonviolen Action from ACT-UP to Women's Suffrage. New York & London: Garland Publishing.

PHILIP MEADOWS TAYLOR (1808-1876) "On the Thugs" New Monthly Magazine. 38 (July 1833).

PHILIP MEADOWS 'TAYLOR (1808-1876) 1986. Confessions of a Thug (A novel) Richard Bentley, London..1839, Kegan Paul, Trench & Co, London. 1883. Ed. By Patrick Brantlinger. Oxford University Press. Oxford Reprinted by Asian Educational Services, New Delhi 1998 Reprinted by Rupa & Co, New Delhi. 2001.

RESTAI, RICHARD M. 1979. The Brain: The last Frontier. Gardens City, New York Dubleday.

RUMMEL, R. 1992. Democide: Nazi Genocide and Mass Murder. New Brunswick, N.J.: Transaction.

1994. Death by Government. New Brunswick, N.J.: Transaction.

1998. Statistics of Democide: Genocide and Mass Murder Since 1900. Muenster:LIT.

RESTAI, RICHARD M. 1979. The Brain: The Last Frontier. Garden City. N.Y.: Doubleday.

R.C.SHERWOOD "Of the Murderers Called P'hansigars". Asiatic Researches. XIII, (1820),

RADHIKA SINGHA. 1993 "Providential' Circumstances: The Thuggee Campaign of the 1830s and Legal Innovation." Modern Asian Studies, 27. 1

RADHIKA SINGHA. 1998."Criminal Communities: The Thuggee Act XXX of 1836", in Radhika Singha, A Despotism of Law: Crime and Justice in Early Colonial India. Oxford University Press. New Delhi

SAGAN, ELI. 1979. The Lust to Annihilate: A Psychoanalytic Study of

Violence in Greek Culture. New York: Psychohistory Press.

SCHWARTZ, STEPHEN I., ed. 1998. Atomic Audit: The Costs and Consequences of U.S. Nuclear Weapons Since 1940.Washington, D.C.: Brookings Institution Press.

SCHWARZSCHILD, STEVEN et al., n.d. Roots of Jewish Nonviolence. Nyack, N.Y.: Jewish Peace Fellowship.

SEMELIN, JACQUES. 1994. Unarmed Against Hitler: Civilian Resistance in Europe, 1939- 1943. Westport, Conn.: Praeger.

SHARP GENE. 1993 . From Dictatorship to Democracy. Cambridge, Mass.: The Albert Einstein Institution.

SIMON, DAVID. 1991. Homicide: A Year on the Killing Streets. Boston, Mass.: Houghton Mifflin.

SIVARD, RUTH LEGER 1996. World Military and Social Expenditures 1996. Washington, D.C.: World Priorities. 16th edition.

STANNARD, DAVID E. 1992. American Holocaust: Columbus and the Conquest of the New World. Oxford: Oxford University Press.

SOLZHENITSYN, ALEKSANDR L. The Gulag Archipelago, 1918-1956: An Experiment in Literary Investigation. Trans. Thomas P. Whitney. 3 vols. Harper, 1974-1978, 1997. Classic account of Soviet labor and concentration camps.

SABRIN, B. (ed.) 1991. Alliance for Murder: The Nazi-Ukrainian Nationalist Partnership in Genocide. New York: Sarpedon.

SELLS, M. 1996. The Bridge Betrayed: Religion and Genocide in Bosnia. Berkeley & Los Angeles: University of California Press.

SHENFIELD, S. 1999. "The Circassians: A Forgotten Genocide?" in M. Levene & P. Roberts (eds.), The Massacre in History. Oxford: Berghahn.

SLIWINSKI, M. 1995. Le Genocide Khmer Rouge: Une analyse demographique. Paris L'Harmattan.

SMITH, R. 1987. "Human Destructiveness and Politics: The Twentieth Century as an Age of Genocide," in I. Walliman & Dobkowski (eds.), Genocide in the Modern Age. New York: Greenwood.

STAUB, E. 1992. The Roots of Evil: The Origins of Genocide and Other Group Violence. Cambridge: Cambridge University Press.

STRAUS, S. 2004. "The Order of Genocide: Race, Power and War in Rwanda." Ph.D. dissertation, University of California at Berkeley.

TAYYEBULLA, M. 1959. Islam and "Non-Violence. Allahabad: Kitgbistan.

THOMPSON, HENRY O. 1988. World Religions in War and Peace. Jefferson, N.C. and London: McFarland & Company.

TOBIAS, MICHAEL. 1991. Life Force: The World of Jainism. Berkeley, Calif: Asian Humanities Press.

TOLSTOY, LEO. 1974 (1893 and 1894-1909). The Kingdom of God and Peace Essays, trans. Aylmer Maude. London: Oxford University Press.

TWAIN, MARK. 1970(1923). The War Prayer. New York: Harper & Row.

TASHJIAN, JAMES H 1982. "Genocide, the United Nations and the Armenians." In GENOCIDE AND HUMAN RIGHTS: A GLOBAL ANTHOLOGY, [edited] by Jack Nusan Porter. Washington, D.C.: University Press of America.

"THE BURUNDI GENOCIDE," in S. Totten et al 1997a. (eds.), Century of Genocide: Eyewitness Accounts and Critical View. New York: Garland.

"THE PSYCHO HISTORICAL ORIGINS OF THE NAZI YOUTH COHORT 1983," in his Decoding the Past. New York: Knopf.

TOLSTOY, LEO. 1974 (1893 and 1894-1909). The Kingdom of God and Peace Essays, trans. Aylmer Maude. London: Oxford University Press.

WAAL, FRANS de. 1989. Peacemaking Among Primates. Cambridge, Mass.: Harvard University Press.

WASSERMAN, HARVEY. 1982. Killing Our Own: The Disaster of America's Experience With Atomic Radiation. New York: Delacorte Press.

WATSON, PETER. 1978. War on the Mind: The Military Uses and Abuses of Psychology. New York: Basic Books.,

WEBER, MAX. 1958(1919). Politics as a vocation. Pp. 77i 128 in From Max Weber: Essays in Sociology, ed. RR Gerth and C. Wright Mills. New York: OXford University Press.

WHIPPLE, CHARLES K. 1839. Evils of the Revolutionary War. Boston, Mass.: New England Non-Resistance Society.

WILSON. H. HUBERT. 1951. Congress: Corruption and Compromise.New York: Rinehart.

WITTNER. LAWRENCE S. 1993. One World or None: A History of the World Nuclear Disarmament Movement Through 1953. Stanford. Calif.: Stanford University Press.

WRANGHAM, RICHARD and PETERSON, DALE. 1996. Demonic Males: Apes and Origins of Human Violence. New York: Houghton Mifflin.

WEGLYN, MICHI 1978. Years of Infamy: The Untold Story of America's

Concentration Camps. Morrow.

WAGNER, M. 1998. "All the Bourgmestre's Men: Making Sense of Genocide in Rwanda.' Africa Today, vol. 45.

WILLIAM HENRY SLEEMAN (1788-1856) 1836.Ramaseeana, or A Vocabulary of the Peculiar Language Used by the Thugs, with an Introduction and Appendix, Descriptive of the System Pursued by that Fratemity and of the Measures which Have Been Adopted by the Supreme GQvemment of India for its Suppression. Military Orphan Press, Calcutta.

WILLIAM HENRY SLEEMAN (1788-1856) 1839. The Thugs, or Phansigars of India. Philadelphia, USA (A pirated version of W H Sleeman's" Ramaseeana")

YOUNG, ANDREW. 1996. An Easy Burden: The Civil Rights Movement and the Transformation of America. New York: HarperCollins Publishers.

YOUTH DIVISION OF SOKA GAKKAI. 1978. Cries for Peace: Experiences of Japanese Victims of World War II Tokyo: The Japan Times.

YEGHIAYAN, V. 1990. The Armenian Genocide and the Trials of the Young Turks. La Verne, Calif.: American Armenian International College.

ZINN, HOW AR~. 1980. A People's History of the United States. New York:Harper & Row.

___________________1980. TAKING LIVES: GENOCIDE AND STATE POWER, New Brunswick, New Jersey: Transaction Books.

_________1981. GENOCIDE: ITS POLITICAL USE IN THE TWENTIETH CENTURY. New Haven: Yale University Press.

1999b. "The Baghdad Railway and the Armenian Genocide, 1915-1916," in R. Hovannisian (ed.), Remembrance and Denial: The Case of the Armenian Genocide. Detroit: Wayne State

Into That Darkness: From Mercy Killing to Mass Murder. New York: Random House.

1994. "Types of Genocide? Croatians, Serbs and Jews, 1941-45," in Cesarani (ed.), The Final Solution: Origins and Implementation. London: Routledge.

RESEARCH JOURNALS

ADAMS, DAVID et al. 1989. Statement on violence. Journal of Peace Research, 26: 120-21.- 1997. War is not in our biology: a decade of the Seville statement, on violence. In Grisolia et al. 1997: 251-56.

BEBBER. CHARLES C. 1994. Increases in U.S. violent crime during the

1980s following four American military actions. Journal of Interpersonal Violence 9 (1): 109-16.

BEER, MICHAEL. 1994. Annotated bibliography of nonviolent action training. International Journal of Nonviolence, 2: 72-99:

BONTA, BRUCE D. 1993. Peaceful Peoples: An Annotated Bibliography. Metuchen, N.J. and London: Scarecrow Press ____ 1996. Conflict resolution among peaceful societies: the culture of peacefulness. Journal of Peace Research, 33: 403-420.

COPPIETERS, BRUNO AND ZVEREV, ALEXEI. 1995. V.C. Bonch-Bruevich and the Doukhobors: on the conscientious objection policies of the Bolsheviks. Canadian Ethnic StudieslEtudes Ethniques au Canada.

EISENHOWER, DWIGHT D. 1953. Speech to the American Society of Newspaper Editors, April 16, 1953. Full-page excerpt in The Wall Street Journal, May 30, 1985, p. 29.

____ 1959. BBC TV interview, August 31, 1959. Quoted in Peter Dennis and Adrian Preston, eds., Soldiers as Statesmen. New York: Barnes & Noble, 1976, p. 132.

____ 1961. Farewell broadcast, January 17, 1961. The Spoken Word, SW-9403.

HESS, G.D. 1995. An introduction to Lewis Fry Richardson and his mathematical theory of war and peace. Conflict Management and Peace Science 14 (1)

HORIGAN, DAMIEN P. 1996. On compassion capital punishment: a buddhist perspective on the daath penalty. The American Journal of Jurisprudence, 41

KEYES, GENE. 1982., Force without firepower. CoEvolution Quarterly, 34: 4-25.

KEYFITZ, NATHAN. 1966. How many people have lived on earth. Demography 3 (2)

MARTIN, BRIAN. 1989. Gene Sharp's theory of power. Journal of Peace Research, 26:

MERCY, JAMES A. and SALTZM-N, LINDA E. 1989. Fatal violence among spouses in the United States 1976-85. American Journal of Public Health 79 (5)

ROSENBERG. MARK L. and MERCY. JAMES A. 1986. Homicide: epidemiologic analysis at the national level. Bulletin of the New York Academy of Medicine. 62:

SOROS, GEORGE. 1997. The capitalist threat. The Atlantic Monthly, February.

"Albania Accuses Tito of Genocide in Kossowo" CENTRAL EUROPE JOURNAL 14 (December 1966): 399-400.

"The Ache of Paraguay 1982" In GENOCIDE AND HUMAN RIGHTS: A GLOBAL ANTHOLOGY, [edited] by Jack Nusan Porter. Lanham, Maryland: University Press of America,

Braham, Randolph L 1981. THE POLITICS OF GENOCIDE: THE HOLOCAUST IN HUNGARY. Volumes 1-2. New York: Columbia University Press.

the Ottoman-Armenians: the anatomy of genocide." INTERNATIONAL JOURNAL MIDDLE EAST STUDIES 18 (3, 1986)

"Documentation of the Armenian genocide in Turkish sources." In GENOCIDE: A CRITICAL BIBLIOGRAPHIC REVIEW: VOL. 2, [Edited] by Israel W. Charny. London: Mansell, 1991

Harff, Barbara 1986. "Genocide as state terrorism." In GOVERNMENT VIOLENCE AND REPRESSION: AN AGENDA FOR RESEARCH, [edited] by Michael Stohl and George A. Lopez. New York: Greenwood Press.

"The etiology of genocides 1987." In GENOCIDE AND THE MODERN AGE: ETIOLOGY AND CASE STUDIES OF MASS DEATH, [edited] by Isidor Walliman and Michael N. Dobkowski. New York: Greenwood Press.

Ted Robert Gurr (1988). "Toward empirical theory of genocides and politicides: identification and measurement of cases since 1945." INTERNATIONAL STUDIES QUARTERLY 32

"Pol Pot's Cambodia 1984: was it genocide?" In TOWARD THE UNDERSTANDING AND PREVENTION OF GENOCIDE: PROCEEDINGS OF THE INTERNATIONAL CONFERENCE ON THE HOLOCAUST AND GENOCIDE, [edited] by Israel W. Charny. Boulder: Westview Press.

Hirsch, Herbert and Roger W. Smith 1991. "The language of extermination in genocide." In GENOCIDE: A CRITICAL BIBLIOGRAPHIC REVIEW: VOL. 2, [Edited] by Israel W. Charny. London: Mansell.

"The Unremembered Genocide." In GENOCIDE AND HUMAN RIGHTS: A GLOBAL ANTHOLOGY, [edited] by Jack Nusan Porter. Lanham, Maryland: University Press of America, 1982,

"The historical dimensions of the Armenian question, 1878-1923." In THE ARMENIAN GENOCIDE IN PERSPECTIVE, [edited] by Richard G. Hovannisian. New Brunswick, New Jersey: Transaction Books, 1986a

INTERNET ON THE HOLOCAUST AND GENOCIDE: AN INTERNATIONAL INFORMATION RESOURCE EXCHANGE TOWARDS UNDERSTANDING, INTERVENTION, AND PREVENTION OF GENOCIDE. (various issues) [published by the Institute on the Holocaust and Genocide, P.O.B. 10311, 91102 Jerusalem, Israel].

"The Hutu-Tutsi Conflict in Burundi 1982." In GENOCIDE AND HUMAN RIGHTS: A GLOBAL ANTHOLOGY, [edited] by Jack Nusan Porter. Washington, D.C.: University Press of America.

TOTTEN, SAMUEL 1991. "First-person accounts of genocidal acts." In GENOCIDE: A CRITICAL BIBLIOGRAPHIC REVIEW: VOL. 2, [Edited] by Israel W. Charny. London: Mansell.

FREEMMAN, M. 1995. "Genocide, Civilization and Modernity." British Journal of Sociology, vol. 46.

Haberer, E. 2001. "THE GERMAN POLICE AND GENOCIDE IN BELORUSSIA, 1941-1944," Journal of Genocide Research, vol. 3, in three parts.

"RWANDA: Genocide and Beyond." Journal of Refugee Studies, vol. 9

ROSSINO, A. 1997. "Destructive Impulses: German Soldiers and the Conquest of Poland." Holocaust and Genocide Studies, vol. 11

UNITED STATES OFFICIAL DOCUMENTS ON THE ARMENIAN GENOCIDE, reprinted 1993-5. Vol. I

"MIGRATION, DEPORTATION ANDNATION-BUILDING: The Case of the Ottoman Empire," in R. Leboutte (ed.), Migrations et migrants dans une perspective historique. Brussels: Peter Lang.

THE PATH OF A GENOCIDE: The Rwanda Crisis from Uganda to Zaire. New Brunswick, N.J.: Transaction.

THE POLITICS OF GENOCIDE: The Holocaust in Hungary, 2 vols. New York: Columbia University Press.

"THE PARTITION OF INDIA AND RETRIBUTIVE GENOCIDE IN THE PUNJAB, 1946-47." Journal of Genocide Research, vol. 5.

"THE ROLE OF TURKISH PHYSICIANS IN THE WORD WAR I GENOCIDE OF OTTOMAN ARMENIANS." Holocaust and Genocide Studies, Studies, vol. R.

"THE ROLE OF THE SPECIAL ORGANISATION IN THE ARMENIAN GENOCIDE IN THE FIRST WORLD WAR," in P. Panayi (ed.), Minorities in Wartime. Oxford: Berg.

"PARTY ALLEGIANCE AS DETERMINANT IN THE TURKISH MILITARY'S INVOLVEMENT IN THE WORLD WAR I ARMENIAN GENOCIDE." Revue du monde Armenian, vol. i.

"THE TURKISH MILTARY TRIBUNAL'S PROSECUTION OF THE AUTHORS OF THE ARMENIAN FOUR MAJOR COURT-MARTIAL SERIES." Holocaust and Genocide Studies, vol. ii.

"NO LESSONS LEARNED FORM THE HOLOCAUST? ASSESSING RISKS OF GENOCIDE POLITICAL MASS MURDER SINCE 1955." American Political Science Review, vol. 97.

HARFF, B., & GURR, T. 1988. "Toward an Empirical Theory of Genocides and Politicides: Identification and Measurement of Cases Since 1945." International Studies Quarterly, vol. 32.

"EXPLAINING THE 1994 GENOCIDE IN RWANDA." Journal of Modern African Studies, vol. 37.

"THE DEMOGRAPHY OF GENOCIDE IN SOUTHEAST ASIA 2003." Gritical Asian Studies, Vol. 35.

"ANTICIPATORYOBEDIENCE" ANDTHE NAZIIMPLEMENTATION OF THE HOLOCAUST IN THE UKRAINE 2002." Holocaust and Genocide Studies , Vol. 16.

"WERE THE PERPETRATORS OF GENOCIDE 'ORDINARY MEN' OR 'REAL NAZIS'? RESULTS FROM FIFTEEN HUNDRED BIOGRAPHIES." Holocaust and Genocide Studies, Vol. 14

H.H.SPRY "Some Account of the Gangmurders of Central India. Commonly Called the Thugs. Accompanying the Skulls of Seven of Them" The Phrenological Journal and Miscellany, VIII, Dec.1832 -June 1834

J.A.R.STEVENSON. "Some Account of the P'hansigars or Gang-Robbers and of the Shudgarshids, or Tribes of Jugglers." Journal of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland, I. (1834),

REPORTS AND DOCUMENTS

AMNESTY INTERNATIONAL. 2000. The Death Penalty, ACT 50/05/00. April 2000.

BUREAU OF JUSTICE. 2000a. Capital Punishment 1999. Washington: U.S. Department of Justice.

____ 2000b. Prison and Jail Inmates at Midyear 1999. Washington, D.C.: U.S. Department of Justice.

CAMPBELL, DONALD T. and FISKE, DONALD W. 1959. Convergent and discriminant validation by the multitraitmultimethod matrix. Psychological Bulletin 56 (2): 81- 105.

THE DEFENSE MONITOR 1972-. Washington, D.C.: Center for Defense Information.

FEDERAL BUREAU OF INVESTIGATION, U.S. DEPARTMENT OF JUSTICE. 2000. Crime in the United States 1999. Washington, D.C.: Federal Bureau of Investigation.

HOREMAN, BART and STOLWIJK, MARC. 1998. Refusing to Bear Arms: A World Survey of Conscription and Consci-entious Objection to Military Service. London: War Resisters International.

HAMID MIR 20,JUN 2005."Pirwala se America tek" Daily Jang,Karachi.Editotial page

HUMAN COST IN SECOND WORLD WAR, 7, JUN 2005.Guardin News service, Daily Dawn, Karachi.p.14

PLANNING PROJECT, Matsunaga Institute for Peace, University of Hawai'i. Available at www.globalnonviolence.org

SANTIAGO, ANGELA S. 1995. Chronology of a Revolution 1986. Manila: Found@9P for Worldwide People Power.

UNITED NATIONS. 1978. Final Document of Assembly Session on Disarmament 23 May-1 July 1978. S-10/2. New York: Office of Public Information.

WORLD BANK. 1997. World Development Report 1997: The State in a Changing World. Oxford: Oxford University Press.

WORLD WILDLIFE FUND. 1986. The Assisi Declarations: Messages on Man and Nature From Buddhism, Christianity,Hinduism, Jainism & Judaism. Gland, Switzerland: WWF International.

THE AMERICAN CRIME OF GENOCIDE IN SOUTH VIET NAM. 1967.South Viet Nam: Giai Phong Publishing House,

BRONKHURST, DAAN. "Extrajudicial Executions, International Alerts and Campaigning." In TOWARD THE UNDERSTANDING AND PREVENTION OF GENOCIDE: PROCEEDINGS OF THE INTERNATIONAL CONFERENCE ON THE HOLOCAUST AND GENOCIDE, [edited] by Israel W. Charny. Boulder: Westview Press

CHALK, FRANK AND KURT JONASSOHN 1988,. "The history and sociology of genocidal killings." In GENOCIDE: A CRITICAL

BIBLIOGRAPHIC REVIEW, [edited] by Israel W. Charny, New York: Facts on File, Inc.

THE HISTORY AND SOCIOLOGY OF GENOCIDE: ANALYSIS AND CASE STUDIES. New Haven: Yale University Press, 1990.

"The study of genocide." In GENOCIDE: A CRITICAL BIBLIOGRAPHIC REVIEW, [edited] by Israel W. Charny. New York: Facts on File Publications,1988

DARSA, Jan 1991. "Educating about the Holocaust: a case study in the teaching of genocide." In GENOCIDE: A CRITICAL BIBLIOGRAPHIC REVIEW: VOL. 2, [Edited] by Israel W. Charny. London: Mansell.

DEKMEJIAN, R. HRAIR 1986. "Determinants of Genocide: Armenians and Jews as Case Studies." In THE ARMENIAN GENOCIDE IN PERSPECTIVE, [edited] by Richard G. Hovannisian. New Brunswick, New Jersey: Transaction Books.

DOBKIN, MARJORIE HOUSEPIAN 1986,. "What genocide? What Holocaust? News from Turkey, 1915-1923: a case study." In THE ARMENIAN GENOCIDE IN PERSPECTIVE, [edited] by Richard G. Hovannisian. New Brunswick, New Jersey: Transaction Books,

ACCOUNTING FOR GENOCIDE: NATIONAL RESPONSES AND JEWISH VICTIMIZATION DURING THE HOLOCAUST. New York: The Free Press, 1979.

"Scenarios of Genocide: Models of Genocide and Critical Responses." In TOWARD THE UNDERSTANDING AND PREVENTION OF GENOCIDE: PROCEEDINGS OF THE INTERNATIONAL CONFERENCE ON THE HOLOCAUST AND GENOCIDE, [edited] by Israel W. Charny. Boulder: Westview Press, 1984

"LIVES AT RISK: A STUDY OF VIOLATIONS OF LIFE-INTEGRITY IN 50 STATES IN 1987 BASED ON THE AMNESTY INTERNATIONAL 1988 REPORT." Paper. New York: The Institute for the Study of Genocide, John Jay College of Criminal Justice (CUNY), March, 1990

THE CASE FOR A FORGOTTEN GENOCIDE. Westwood, by Dickran H. Boyajian. New Jersey: Educational Book Crafters, 1972

Housepian-Dobkin, Marjorie. "What Genocide? What Holocaust? News from Turkey, 1915-23: a case study." In TOWARD THE UNDERSTANDING AND PREVENTION OF GENOCIDE: PROCEEDINGS OF THE INTERNATIONAL CONFERENCE ON THE HOLOCAUST AND

GENOCIDE 1984, [edited] by Israel W. Charny. Boulder: Westview Press.

"Genocide and Denial: The Armenian Case." In TOWARD THE UNDERSTANDING AND PREVENTION OF GENOCIDE: PROCEEDINGS OF THE INTERNATIONAL CONFERENCE ON THE HOLOCAUST AND GENOCIDE, [edited by] Israel W. Charny. Boulder: Westview Press, 1984

INVESTIGATIONS INTO CERTAIN PAST INSTANCES OF GENOCIDE AND EXPLORATION OF POLICY OPTIONS FOR THE FUTURE. U.S. House of Representatives, Hearings, Committee on International Relations. Ninety-Fourth Congress, Second Session, May 11; August 30, 1976.

_________. "Reflections on the prevention of genocide." In GENOCIDE WATCH 1992, [edited] by Helen Fein. New Haven: Yale University Press,

Libaridian, Gerard J 1987. "The ultimate repression: the genocide of the Armenians, 1915-1917." In GENOCIDE AND THE MODERN AGE: ETIOLOGY AND CASE STUDIES OF MASS DEATH, [edited] by Isidor Wallimann and Michael N. Dobkowski. New York: Greenwood Press

___________________1972. "Genocide: full report." In BANGLADESH GENOCIDE AND WORLD PRESS, edited by Fazlul Quader Quaderi. Dacca, Bangladesh: Begum Dilafroz Quaderi.

LETHAL POLITICS: SOVIET GENOCIDE AND MASS MURDER SINCE 1917. 1990 New Brunswick, New Jersey: Transaction Publishers.

Wallimann, Isidor and Michael N. Dobkowski (Eds.) 1987. GENOCIDE AND THE MODERN AGE: ETIOLOGY AND CASE STUDIES OF MASS DEATH. New York: Greenwood Press.

"THE GENOCIDE OF THE ARMENIANS AND THE SILENCE OF THE TURKS," in Proceedings of the International Conference on "Problem of Genocide." Cambridge, Mass.: Zoryan Institute.

THE HIDDEN GENOCIDE IN BOSNIA-HERZOGOVINA AND CROATTIA. Minneapolis: University of Minnesota Press.

THE BUSINESS OF GENOCIDE: THE SS, SLAVE LABOR, AND THE CONCENTRATION CAMPS CHAPEL HILL: University of North Carolina Press.

THE SLAUGHTERHOUSE PROVINCE: AN AMERICAN DIPLOMAT'S REPORT ON THE ARMENIAN GENOCIDE, 1915-1917. New Rochelle, N.Y.: Caratzas.

"The Armenian Genocide: GOVERNING MYTHS REVISITED." Paper presented at the European University Institute, Robert Schuman Centre for

Advanced Studies, Second Mediterranean Social and Political Research Meeting, Florence, March 21-25.

Eberhard Count Wolffskeel Von Reichenberg, Zeitoun, Mousa Dagh, Ourfa: LETTERS ON THE ARMENIAN GENOCIDE. Princeton, N.J.: Gomidas Institute.

"ENVER PASHA AND POL POT 1997: A Comparison of the Armenian and Cambodian Genocide," in Proceedings of the International Conference on "Problems of Genocide." Cambridge, Mass.: Zoryan Institute.

"THE ETHNIC ELEMENT IN THE CAMBODIAN GENOCIDE 2001," in Chirot and Seligman (eds), Ethnopolitical Warfare.

RAMBLES AND RECOLLECTIONS OF AN INDIAN OFFICIAL LONDON.1844. 1915. Revised and annotaled edition by V A Smith London Reprinted in Karachi. 1975. Reprinted by Asian Educational Services. New Delhi 1995.

WILLIAM HENRY SLEEMAN (1788-1856). 1849. Report on Budhak alias Bagree Decoits and Other Gang Robbers by Hereditary Profession. Calcutta

WILLIAM HENRY SLEEMAN (1788-1856) Report on the Depredations Committed by the Thug Gangs of Upper and Central India, from the Cold Season of 1836-37. down to their Gradual Suppression under the Operation of the Measures Adopted against Them by the Supreme Government In the Year 1839. Calcutta. 1840

WILLIAM HENRY SLEEMAN (1788-1856) 1839. Report on the System of Megpunnaism, or the Murder of Indigent Parents for their Young Children (who Are Sold as Slaves) as It Prevails in the Delhie Territories and the Native States of Rajpootana, Ulwar and Bhurtpore. Serampore Press. Serampore. (Sleeman coined a word to describe what he claimed was a new type of thuggee. Megpunnaism, the murder of parents to sell their children as slaves)

Conscientious objectors in Lenin's Russia: A report, 1924. Pp. 81-93 in Studies in Peace History. ____ 1992. A Brief History of Pacifism: From Jesus to Tolstoy. Syracuse, N.Y.: Syracuse University Press.

ضمیمہ

لیکن چار سو سال پہلے براعظم امریکہ میں یورپی آبادکاروں نے اس براعظم کے اصل باشندوں سرخ ہندیوں کا قتل عام شروع کیا تو کسی قاعدے، قانون، اخلاق، اصول روایت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک قاعدہ تھا جس کی پیروی کی جاتی تھی کہ سرخ ہندیوں کو Exterminate or Banish کر دیا جائے۔ خون کے دریا بہا کر سونے کے دریا پیدا کیے گئے اس عہد کی المناک داستانوں کو تاریخ نگاروں نے محفوظ نہ رکھا کیوں کہ اس عہد کے تاریخ نگار، روشن خیال، مہذب و متمدن انسان سب اس بربریت اور لوٹ مار کو جائز سمجھتے تھے اور اس پر انھیں کوئی تاسف نہ تھا۔ ان مظالم پر نہ آسمان رویا نہ زمین کی آنکھ نم ہوئی نہ کسی کا سینہ شق ہوا، نہ کسی کا رنگ فق نہ کوئی چہرہ زرد ہوا، تاریخ کا یہ المناک خونی باب اب رفتہ رفتہ روشنی میں آ رہا ہے۔ قتال و جدال کی یہ کیفیت غیظ و غضب کی آخری حدود کو چھو چکی تھی، سرخ ہندی عورتوں بچوں کے لیے بھی ان مہذب متمدن تعلیم یافتہ دنیا کی اعلیٰ ترین گوری نسل کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کا ایک شمہ بھی نہ تھا۔ سرخ ہندیوں کے وحشیانہ قتل عام کی عبرتناک داستانیں جو تین سو سال تک پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔ اب رفتہ رفتہ منظر عام پر لائی جا رہی ہیں لیکن کئی چھلنیوں سے چھان کر اس کی تفصیلات Nash, Stannard, Sheehan, Wallace, Hoxie, La Perousse, Paddison, Nichols, Phillips, Hurtado, Heizer, Brown, Churchill, Cocker, Prucha, Madsen, Rommail, Micheal Man, Glain D. Page نے نہایت تفصیل سے اپنی کتابوں میں بیان کی ہیں اس موضوع پر درج ذیل کتابوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

1. Nash, G. 1992. Red, White and Black: The Peoples of Early North America, 3rd ed. Englewood Cliffs, N.J.: Prentice Hall.

2. Stannard, D. 1992. American Holocaust: The Conquest of the New World. New York: Oxford University Press.

3. Sheehan, B. 1973. Seeds of Extinction: Jeffersonian Philanthropy and the American Indian. Chapel Hill: University of North Carolina Press.
4. Wallace, A. 1999. Jefferson and the Indians: The Tragic Fate of the First Americans. Cambridge, Mass.: Belknap Press.
5. Hoxie, F. 1984. A Final Promise: The Campaign to Assimilate the Indians, 1880-1920. Lincoln: University of Nebraska Press.
6. La Perousse, J.-F. 1989. Monterey in 1786: Life in a California Mission: The Journals of Jean Francois de la Perousse, ed. M. Margolin. Berkeley: Heyday Books.
7. Paddison, J. 1999. A World Transformed: Firsthand Accounts of California Before the Gold Rush. Berkeley, Calif.: Heyday Books.
8. Nichols, D. 1978. Lincoln and the Indians: Civil War Policy and Politics. Columbia: University of Missouri Press.
9. Phillips, G. 1975. Chiefs and Challengers: Indian Resistance and Cooperation in Southern California. Berkeley & Los Angeles: University of California Press.
10. Hurtado, A. 1988. Indian Survival on the California Frontier. New Haven, Conn.: Yale University Press.
11. Heizer, R. 1993. The Destruction of California Indians. A Collection of Documents. Lincoln: University of Nebraska Press.
12. Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.
13. Churchill, Ward. 1997. A Little Matter of Genocide: Holocaust and Denial in the Americas, 1492 to the Present. San Francisco: City Light Books.
14. Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. London: Jonathan

Cape.

15. Prucha, F. 1994. "Andrew Jackson's Indian Policy: A Reassessment," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.

16. Madsen, B. 1994. "Mormons, Forty-Niners, and the Invasion of Shoshone Country," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.

17. J. M. Gran The origions of war 2 vols Groningen: Origin Press 1995.

18. Glen D Paige Nonkilling Global Political Science Philadelphia: X Libris Corporation 2002.

19. Allen D. Grimshaw "Encyclopedia of violence, peace conflict 3 volumes N. Y. Academic Press 1999.

20 Chles W. Kegley and Wiltt Kopfe World politics: Trend & Transformation 6th London Macmillan Press LTD 2000.

21. JACK Porter Genocide and Human rights: A Global Anthology Lanham, Maryland, University Press of America 1982.

22. Chalk F. & K. J. The History and Sociology of Genocide, New Haven 1990.

23. Chany I. W. [Ede] Encyclopedia of Genocide Vol. 1 - 2 Santa Barbara California 1999.

24. Horowitz, I.L Taking lives: Genocide and State Power New Brunswick, New Jersy 1997.

25. Kupuer, L. Genocide, Its political use in the Twentieth Century New Haven 1981

اختلاف امت کیسے ختم ہو اتحاد کیسے ممکن ہو؟

مرتبہ: سید خالد جامعی / عمر حمید ہاشمی

جریدہ کی نظر میں اس امت کے تمام مسلم مکاتب فکر اپنے اپنے دائرے میں نہایت قابل قدر کام انجام دے رہے ہیں مختلف دینی، علمی اور سیاسی اسلامی تحریکیں بھی کسی نہ کسی سمت میں نہایت عظیم الشان خدمات میں مصروف ہیں لہٰذا کسی کے کام کو کسی دوسرے کے کام پر ترجیح دینے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ان تمام مسالک، مکاتب فکر اور دینی علمی تحریکوں کے کام میں مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس امت کو تفریق کی نہیں تطبیق کی ضرورت ہے۔ تمام مسلم مکاتب فکر جن کا منہاج و ماخذ علم ایک ہے وہ تمام ایک ہی کل کے مختلف جزو ہیں یہ تمام مکاتب فکر حق پر ہیں، آپ کسی کو کسی پر ترجیح دے سکتے ہیں لیکن ترجیح کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حق صرف انہی کے پاس ہے۔ ان کے وجود سے ہی اس امت کی نمو ہے۔

علم فقہ میں صحابہ کرام کا حصہ: نقطۂ نظر کا اختلاف

صحابہ میں علم فقہ کے امام صرف چھ حضرات ہیں[1]، **ستة من اصحاب النبیؐ یذکرون الفقه بینهم علی بن ابی طالب و ابی وابو موسی علحدة و عمر وزید و ابن مسعود علیحدة** ــــ ایک طرف حضرت علیؓ ابن طالب اور ابیؓ اور حضرت ابوموسیٰ تھے، دوسری طرف حضرت عمرؓ اور حضرت زیدؓ اور حضرت ابن مسعودؓ تھے۔ یہ لوگ مسائل فقہیہ پر بحث و تمحیص اور مذاکرہ کیا کرتے تھے [کتاب الآثار امام محمد] **ولم یکن یفتی فی زمن النبیؐ غیر علی و عمر و معاذ وابی موسی** ــــ یعنی عہد نبوت میں چار اشخاص فتوے دیا کرتے تھے حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت معاذؓ اور حضرت ابوموسیؓ۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے صرف ان چار کو امام مانا ہے، حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ **اما غیر هؤلاء الاربعة فکانوا یرون دلالة ولکن ما کانوا یمتزون الرکن والشرط من الادب والسنن ولم یکن لهم قول عن العارمن الاخبار و تقابل الدلائل الا قلیلا کابن عمرؓ و عائشةؓ زیدؓ** یعنی ان چار اشخاص

---

[1] سب نے اپنے اپنے اور رجحانات کے حساب اس ضمن میں فہرست بنائی ہیں، حالانکہ کتب حدیث کے بلراست عمیق مطالعے سے ایک بڑ فہرست ملتی ہے، حافظ ابن قیم نے اعلام میں اس ضمن میں کافی شافی بحث کی ہے، عثمانؓ کو بھی علم فرایض میں زیدؓ کے برابر جانا جاتا تھا، قرانی علوم میں بھی وہ فایق تھے۔ معج

کے سوا باقی جو لوگ تھے وہ مطالب تو سمجھتے تھے لیکن آداب وسنن اور ارکان وشرائط میں امتیاز وتفریق نہ کر سکتے تھے اور جہاں حدیثیں متعارض ہوتی ہیں اور دلائل میں تقابل ہوتا ہے وہاں وہ بجز بعض موقعوں کے دخل نہیں دیتے تھے مثلاً حضرت ابن عمرؓ، عائشہؓ اور زیدؓ بن ثابت۔ اور یہی لوگ اس مجلس شوریٰ کے بھی سربرآوردہ ارکان تھے جو مہاجرین وانصار پر مشتمل تھی، اور کبھی کبھی منعقد ہوا کرتی تھی۔ بشمول حضرت ابوبکرؓ و حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور معاذ بن جبلؓ وابی بن کعبؓ وعثمانؓ بن عفانؓ وغیرہم من الصحابہ ___ **وکان سیرة عمرانه کان یشاور الصحابة دنیا ظر هم حتی تنکشف الغمة ویاتیه العلم** ___ حضرت عمرؓ کی عادت تھی کہ صحابہؓ سے مشورہ کرتے تھے، بحث ومباحثہ کرتے تھے یہاں تک کہ پردہ اٹھ جاتا تھا اور مسئلہ زیر بحث کا علم یقین کے ساتھ حاصل ہوجاتا تھا۔ [حجۃ اللہ البالغہ]

ابومنصور عبدالقادر تمیمی بغدادی اپنی کتاب اصول الدین میں لکھتے ہیں کہ “صحابہ میں چار بزرگ ایسے ہیں جنھوں نے فقہ کے جملہ ابواب پر گفتگو کی ہے یعنی حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت مسعودؓ۔ جب یہ چاروں کسی مسئلہ میں متفق ہوتے ہیں تو اس میں سرے سے کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ لیکن کسی مسئلہ میں اگر علیؓ دوسروں سے الگ رائے رکھتے ہیں تو ابن ابی لیلیٰ، شعبی اور عبیدہ سلیمان علیؓ کی پیروی کرتے ہیں، اور جس مسئلہ میں زیدؓ اپنے تینوں ساتھیوں سے الگ ہوتے ہیں تو امام مالکؒ اور امام شافعیؒ ان مسائل میں ان کے اکثر ہموا ہوتے ہیں اور خارجہ تو لازمی طور پر زیدؓ کا ساتھ دیتے ہیں۔ ابن عباسؓ جن مسائل میں دوسروں سے اختلاف رکھتے ہیں ان میں عکرمہ اور حضرت سعیدؓ بن جبیر ان کا اتباع کرتے ہیں، اگر حضرت ابن مسعودؓ دوسروں سے کسی مسئلہ میں الگ ہوتے ہیں تو علقمہ اور اسودان کی رائے کو لے لیتے ہیں ___”

پھر صحابہ کے بعد آئمہ اہل بیت کے علاوہ مدینہ منورہ میں حضرت سعید بن مسیبؓ، عروہ بن زبیرؓ، خارجہ بن زیدؓ، حضرت قاسم بن محمد، حضرت سلیمانؒ بن یسار، عبید اللہ بن عبداللہ بن مسعودؓ اور ابو بکرؓ بن عبدالرحمٰن اور نافع مشہور فقہا ہوئے۔ مرکزیت علمی پہلے مدینہ کو حاصل تھی، پھر کوفہ و بصرہ مرکز علم ہوئے۔ عہد عمرؓ میں عمار بن یاسرؓ جب امیر بنا کر کوفہ بھیجے گئے تو ان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ معلم کتاب اور وزیر کی حیثیت سے روانہ کیے گئے تھے۔ پھر علی المرتضیٰؓ نے کوفہ کو اپنا مرکز بنایا، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ عراقی فقہا کو وراثت، حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے فہم وادراک اور علم کی بھی پہنچی اور عبداللہؓ بن مسعود کی بھی، یہی سبب تھا کہ ابوحنیفہؒ نے زانوئے تلمذ، مدینہ جا کر امام جعفر صادقؒ کے سامنے بھی تہہ کرنا ضروری سمجھا چنانچہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ امام جعفر صادقؒ سے زیادہ فقیہہ یعنی [سمجھ بوجھ والا] میں نے نہیں دیکھا۔

مدنی اور کوفی فقہ یا حجازی وعراقی فقہ:

اس طرح فقہ کی دو قسمیں ہوئیں مدنی اور کوفی، مدنی فقہ موطا امام مالکؒ میں جمع ہوئی [جو بعد کو اندلسی

حکومت کا قانون بنی] اور کوفی فقہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کی تصانیف میں مدون ہوئی[جو سلطنت عباسی کا قانون بنی]۔ یہ مدنی اور کوفی فقہیں بعد میں حجازی فقہ اور عراقی فقہ کے نام سے یاد کی جانے لگیں۔ حجازی اور عراقی فقہ کے مشہور مذاہب[کیوں کہ ان کے علاوہ بھی اور متعدد مذاہب فقہ پیدا ہو گئے ہیں، مگر اس وقت جو اہل سنت میں رائج ہیں] چار ہیں، مالکی، شافعی، حنبلی اور حنفی۔ اس سے پہلے ۱۹ مکاتب فکر تھے جو تحلیل ہو گئے اور صرف چار باقی رہ گئے۔ اہل حدیث مکتب، حنبلی مکتب فکر سے متفق ہے جو روایت کو بہت اہمیت دیتا ہے۔

امام مالکؒ کتاب وسنت کے ساتھ معمولات میں اہل مدینہ کے اجماع کو حجت مانتے ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ مدینہ رسول اللہؐ اور خلفاء“ کا مرکز تھا، اہل بیت اور صحابہ واولاد صحابہ سب وہیں رہے، وحی بھی وہیں اتر تی رہی لہٰذا احکام کی حکمت سے اہل مدینہ ہی زیادہ واقف ہو سکتے ہیں۔

امام شافعیؒ نے اس میں اضافہ کیا کہ معمولات میں پورے حجاز کے اجماع کو حجت مانا مگر ساتھ ہی روایات کی چھان بین بھی کی اور بعض مسائل میں بیرون حجاز کے آئمہ اور فقہ کی روایات کو اہل حجاز کے عمل پر ترجیح دی۔

امام احمد بن حنبلؒ حدیث پر عمل کرتے تھے اور کوئی تاویل اس میں نہیں کرتے۔ اگر ایک ہی معاملے کے متعلق مختلف حدیثیں ہوں اور ان میں علت کا اختلاف بھی نہ ہو تو احمد بن حنبلؒ ان سب حدیثوں کو لیتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو اپنی جگہ مخصوص کر دیتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ یہ کہتے ہیں کہ احکام شریعت دو قسم کے ہیں ایک عمومی جن میں کوئی استثنا نہیں ہے اور دوسرا کہ حکم کسی جزوی واقعہ یا مخصوص حالات کی بنا پر صادر ہوا، لہٰذا قاعدے اور قانون بناتے وقت احکام عمومی کو قاعدہ کلیہ کے طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اب اگر کسی حکم عمومی کے خلاف کوئی روایت سامنے آئے اور کوئی وجہ استثنا بھی ظاہر نہ ہو تو صرف اس کی بناء پر حکم عمومی یعنی قاعدہ کلیہ کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔

اس کے علاوہ یہ چاروں آئمہ ابوحنیفہؒ و مالکؒ و شافعیؒ و احمد بن حنبلؒ سب قیاس کے بھی قائل ہیں، یہ روایت سب کی راہنما رہی ہے کہ اجتہاد کرنے والا خطا بھی کر سکتا ہے اور صواب کو بھی پہنچ سکتا ہے۔ صحیح فیصلے کی صورت میں اسے دو ثواب ملیں گے اور خطا کی صورت میں صرف ایک ثواب ملے گا۔[رسالہ امام شافعیؒ] اس طرح یہ صورت نکلی کہ ایک کے بعد دوسرا مجتہد بھی اجتہاد کرے، چنانچہ اجتہادات ہوتے رہے۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ، استاد و شاگرد:

امام شافعیؒ امام مالکؒ کے شاگرد ہیں اور ان ہی سے ان کی موطا پڑھی ہے اور پھر اسی موطا پر تنقید بھی کی ہے۔ ادھر امام شافعیؒ کے دوسرے استاد امام محمدؒ ہیں[جو امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے] انھوں نے بھی موطا پر تنقید کی[۱] ہے اور جس طرح امام شافعیؒ نے اپنے استاد مالک کی موطا پر تنقید کی اسی طرح امام محمد نے اپنے استاد ابوحنیفہؒ سے

---

۱. لوگوں امام شافعی کا امام محمد کا شاگرد ہونا محقق نہیں ایک احناف میں مشہور بات ہے، امام شافعی کی تحریروں اور سندوں سے ایسا ثابت نہیں ہوتا ہے۔ جنھونے اسے مانا ہے ان میں سے اکثر نے اسے بہت قلیل وقت گنا ہے

بہت سے مسائل میں اپنے تفقہ اور غور و فکر کی بنا پر اختلاف کیا۔ یہی حال امام ابو حنیفہؒ کی مجلس وضع قوانین کے جملہ اراکین کا تھا جو ایک ایک مسئلے پر گھنٹوں اور بعض اوقات کئی کئی دن تک بحثیں اور اختلاف کرتے رہتے تھے، ان میں ابو یوسف، زفر، محمد یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، حیان و مندل بن علی، قاسم بن معن یعنی عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود اور داؤد بن نصیر طائی، فضیل بن عیاض اور حسن بن زید وغیرہم جیسے ارباب فکر و نظر شامل تھے۔

اب دیکھیے کہ ان فقہاء نے اپنی علمی کاوشوں کے بعد اعلانات کیا کیے اور آنے والی نسلوں کی رہنمائی کس طرح کی اور ان سے توقعات کیا قائم کیں، ....یہ بہت اہم اعلانات ہیں۔

ائمہ اربعہ کے اعلانات حق کیا ہے؟ :

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص بجز رسولؐ کے ایسا نہیں ہے جو اپنے کلام کی وجہ سے مسئول نہ ہو اور اس کا قول مسترد نہ کیا جائے۔ امام مالکؒ کے مشہور شاگرد واشہب جب کوئی مسئلہ پوچھ کر امام کا جواب قلمبند کرنے لگے تو امام نے انھیں یہ کہہ کر منع کیا کہ لکھو مت میں نہیں جانتا کہ اس جواب پر آئندہ خود میں بھی قائم رہوں گا یا نہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میرا کوئی قول اگر حدیث کے خلاف ہو تو حدیث پر عمل کرو اور میرے قول کو دیوار پر کھینچ مارو [بلا شبہ اگر حدیث درست ہو چنانچہ انھوں نے فرمایا کہ **اذا صح الحدیث فهو مذهبی**]

امام احمدؒ نے فرمایا **لا تقلدونی ولا تقلدن مالکاً ولا الاوزاعی ولا النخعی ولا غیر هم وخذوا الکلام من حیث اخذوا من الکتاب و السنه،** یعنی تم لوگ میری تقلید میں نہ پڑ جانا تم میں سے کوئی بھی نہ تو مالک کا مقلد ہو اور نہ اوزاعی کا، اور نہ ہی نخعی کا، نہ اور کسی کا [تقلید ہرگز نہ کرنا] بات تم بھی وہیں سے اخذ کرو جہاں سے ان لوگوں نے اخذ کی ہے یعنی کتاب وسنت سے..........

امام ابوحنیفہؒ نے اعلان کیا کہ **لا ینبغی لمن لم یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی** جسے میری دلیل کی پہچان نہ ہو اس کو میری بات پر فتویٰ نہ دینا چاہیے۔ امام ابوحنیفہؒ خود بھی جب فتویٰ دیتے تو کہتے کہ یہ نعمانؒ بن ثابت کی رائے ہے جہاں تک مجھے معلوم ہے اچھی ہے، اگر اس سے بہتر فتویٰ کوئی شخص دے دے تو اولی بالصواب ہوگا اور حکیم بن ہشام کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا کہ آپ جو فتویٰ دیا کرتے ہیں تو کیا آپ کو یقین ہے کہ وہی صحیح ہے؟ تو امام نے فرمایا ”ہوسکتا ہے کہ غلط ہونے کے سوا کچھ اور نہ ہو“۔

اس کے صاف معنی یہی ہیں کہ ان آئمہ نے اور فقہاء نے اپنی کد و کاوش غور و فکر اور تفقہ و اجتہاد کو حرف آخر کبھی نہیں سمجھا۔ ان کو یقین تھا کہ **افلا یتدبرون القرآن**..........اور کتاب **انزلنا الیک مبارک لیدبروا آیاته**..........کی دعوت الٰہی پر ہمیشہ توجہ کی جاتی رہے گی، لیکن کوئی شبہ نہیں کہ اپنے وقت کی ضرورت کے لیے اور آئندہ نسلوں کی سہولت اور رہبری کے لیے ان متقدمین نے بہت بڑا سرمایۂ علم و تحقیق مہیا کر دیا ہے، اس

احسان سے ہم کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتے، اب یہ بعد والوں کا فرض تھا کہ کتاب و سنت پر اسی محنت و جانفشانی کے ساتھ غور و فکر کرتے اور فقہا و مجتہدین اسلام کی فقہ اور اجتہادات کو پیش نظر رکھتے۔

تمام فقہا اور مذاہب کا تین امور میں اختلاف نہیں:

تمام فقہا اور تمام مذاہب فقہ کا تین امور میں اختلاف نہیں "الکتاب"، "السنۃ" "الاجماع" ان تین امور کے علاوہ فقہ کے سات مصادر اور ہیں مذکورہ تین مصادر کی حیثیت اصول کی ہے۔ سات میں سے ایک مصدر تمام فقہا اور مذاہب کا تین امور میں اختلاف نہیں جو قیاس کہلاتا ہے۔ مگر فقہاء کی جماعت میں صرف ابن حزمؒ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ بقیہ چھ مصادر میں اختلاف درج ذیل ہیں:

فقہا اور مذاہب فقہیہ کے درمیان جو اختلاف اس سلسلے میں ہے، اس کی صورتیں مختصراً یوں ہیں:۔

ظاہریہ:	پہلے تین مصادر اصلی کے سوا اور کسی مصدر کو نہیں مانتے۔
شوافع:	تین مصادر اصلی پر "قیاس" اور "استصحاب" کا اضافہ کرتے ہیں۔
احناف:	شوافع کے اضافے پر مزید دو مصادر "عرف" کا اور "استحسان" کا اضافہ کرتے ہیں۔
حنابلہ:	شوافع کے پانچ مصادر پر "مصالح مرسلہ" کا اور سد الذرائع کا اضافہ کرتے ہیں۔
مالکیہ:	شوافع کے پیش کردہ پانچ مصادر پر اور احناف و حنابلہ کے اضافہ کردہ مصادر پر جو سب مل کر نو ہوتے ہیں، ایک اور دسواں مصدر پیش کرتے ہیں یعنی "اہل مدینہ کا عمل"۔
بعض فقہاء:	ان پر دو اور مصادر کا اضافہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ہم سے پہلے کی شرع ہمارے لیے بھی شرع ہے" اور "عمل صحابی" بھی ایک مصدر کی حیثیت رکھتا ہے۔

امت کی اکثریت تفرقہ سے الگ ہے:

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امت مسلمہ ابتداء سے ہی خیر امت رہی ہے اس امت کی ۹۵ فی صد اکثریت اپنی تاریخ کے آغاز سے آج تک اپنے عقائد و نظریات کے معاملے میں خیر پر قائم رہی ہے اس امت کے صرف پانچ فی صد لوگ مختلف فرقوں میں بٹ کر یہ تاثر پیدا کرتے رہے کہ پوری امت انتشار اور افتراق کا شکار رہی ہے مگر یہ محض تاریخی افسانہ اور محض مبالغہ ہے اس امت کا سواد اعظم ہمیشہ خیر کے راستے پر گامزن رہا اور تاریخ کے کسی دور میں یہ امت کسی قسم کے فتنہ و فساد اور فرقہ واریت کی حامی نہیں رہی۔ فتنہ و فساد کے دور میں بھی اس امت کا سواد اعظم فتنہ سے الگ تھلگ رہا۔

امت میں مختلف مکاتب فکر کیوں ہیں؟

یہ نقطۂ نظر کہ ایک مسلک کا عالم دوسرے مسلک کے عالم کو برداشت نہیں کر سکتا محض بے بنیاد دعویٰ ہے تاریخی طور پر اس دعوے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس امت کے اکابرین میں مختلف مسالک مکاتب

کے لوگ اس کثرت سے رہے ہیں کہ اس کا شمار تک ممکن نہیں یہی وجہ ہے کہ تمام دینی مدارس کے نصاب میں برس ہا برس سے مختلف مسالک و مکاتب فکر کی کتابیں نہایت فراخ دلی کے ساتھ آج بھی نصاب کا لازمی حصہ ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ دور زوال کے باعث مسالک کے نقطہ نظر میں سختی اور درشتی آ گئی جس کی ایک وجہ بیرونی یلغار کے باعث دفاعی حکمت عملی تھی لہٰذا اپنے آپ کو محصور اور محفوظ کرنے کے باعث ایک منفی ذہنیت پیدا ہوئی۔ اس منفی ذہنیت کا ازالہ بلکا مالہ نہایت آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوال کہ امت میں پانچ یا چھ بڑے مکاتب فکر کیوں ہیں؟ جب قرآن و سنت ایک ہیں اور ایک مقدس ترین ہستی رسالت مآبؐ سے ملے ہیں تو مسلمان فرقہ فرقہ کیوں ہیں؟ یہ سوال تاریخ اسلام اور تاریخ ادیان عالم سے ناواقفیت کے باعث پیدا ہونے والا سوال ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری میں جو بے شمار فرقے اٹھے وہ سب ختم ہو گئے کیوں کہ فرقہ زیادہ عرصہ باقی نہیں رہ سکتا۔ البتہ مکاتب فکر جن کی تعداد انیس تھی وہ کم ہو کر صرف چار پانچ رہ گئے، اب ان مکاتب فکر کو فرقہ سمجھنا فہم کا قصور ہے۔ ان مکاتب فکر کا وجود رحمت ہے اس کے ذریعے دین میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور امت میں توازن آتا ہے۔

عیسائیت کی تباہی کیوں ہوئی؟ صرف ایک مکتب فکر :

اسلام آج بھی اس لیے زندہ ہے کہ اسلام کی تعبیر و تشریح پر کسی ایک مکتب فکر کا اجارہ نہیں، تمام مسلمہ مکاتب فکر حق پر ہیں۔ ان میں کوئی الحق نہیں، عیسائیت کی تباہی کی اصل وجہ یہ تھی کہ عیسائیت نے پوپ کو زمین پر خدا کا نائب تسلیم کیا لہٰذا پوپ کے افکار و افعال خدا کے افعال قرار پائے، وہ زمین پر خدا کا سایہ بن گیا، زمین پر پوپ نے جس کو جنت کی بشارت دی آسمان پر جنت اس کے لیے واجب ہو گئی، زمین پر پوپ نے جسے جہنم کی وعید سنائی وہ بارگاہ خداوندی میں معتوب و مغضوب قرار پایا۔

پوپ کو جب خدا کے درجہ پر فائز کر دیا گیا تو پوپ ہی الحق، میزان حق و باطل، اور زمین پہ ظل الٰہی قرار پایا اور پوپ کی بیان کردہ تعبیر، تشریح، توضیح، بشارت، تنبیہ اور وعید احکام الٰہی کے مماثل ٹھہریں۔ لہٰذا مذہب عیسائیت میں جس عالم نے پوپ سے مختلف تشریح و تعبیر دین پیش کی وہ واجب القتل قرار پایا، اس ذہنیت کے باعث عیسائیت کی تاریخ فرقوں اور مکاتب فکر سے خالی رہی، اگر کسی نے احکام الٰہی کی تشریح پوپ سے مختلف بیان کرنے کی کوشش کی اسے تہس نہس کر دیا گیا۔ پاپائیت زمین پر خدا کا نظام بن گئی۔ سلطنت رومہ کی پشت پناہی کے بعد کلیسائے روم روئے زمین پر طاقت ور ترین مذہبی نظام بن گیا۔ جب تک روحانیت موجود رہی یہ مطلق العنان نظام حکمرانی چلتا رہا، لیکن جب دنیا اس روحانیت پر غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تو پاپائیت کے نظام پر حملے شروع ہوئے، مارٹن لوتھر نے بغاوت کی پروٹسٹنٹ ازم کی تحریک شعلہ جوالہ بن گئی۔ عمل ردعمل کے نتیجے میں عیسائیت تہہ تیغ ہو گئی۔ اگر عیسائیت اسلام کی طرح مختلف مکاتب فکر کو برداشت کرتی پاپائیت کے ذریعے سخت گیر

نظام قائم نہ ہوتا اور صرف پاپائے روم الحق نہ ہوتا تو عیسائیت زندہ رہتی اور توانا رہتی اسی لیے رسول اللہ نے اختلاف امت کو رحمت قرار دیا تھا۔

اسلام میں تمام مسلمہ مکاتب فکر حق ہیں کوئی الحق نہیں:

اختلاف کی وجہ عقل کا استعمال اس کا حل اجماع:

اس کے برعکس اسلام میں کسی مکتب فکر نے اپنے الحق ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ الحق کے اعلان کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے سوا سب باطل ہے لہٰذا حق کی موجودگی میں باطل کا کیا جواز پھر اجماع کی بھی ضرورت نہیں اجماع اہل حق کے مابین ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب تک رسالت مآب کی ہستی ہمارے درمیان تھی تو تمام اختلافات میں آپ کا ارشادی قول فیصل تھا کیونکہ آپ کے قول و عمل کی تائید و تصویب و تردید آسمانوں سے کی جاتی تھی آپ کے وصال مبارک کے بعد یہ مقام کسی کو عطا نہیں ہوا۔ لہٰذا اسلام نے فطری اختلاف کا دروازہ کھول دیا۔

اس اختلاف کے نتیجے میں اصحاب کرام حتیٰ کہ عشرہ مبشرہ کے مابین مختلف معاملات پر اختلاف واقع ہوا لیکن اس کا حل مشاورت اجماع اور امارت کے آخری فیصلے سے کیا گیا کیونکہ جب بھی قرآن و سنت کی تشریح و اجماع و توضیح کے لیے عقل انسانی استعمال ہوگی تو تعبیر کا اختلاف لازماً واقع ہوگا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک قانون سے تمام عقول ایک ہی مطلب اخذ کریں لہٰذا اس اختلاف انسانی جسے حدیث میں رحمت کہا گیا ہے اسے حل کرنے کے لیے اجماع کا سہارا لیا گیا۔ اختلاف قیامت تک پیدا ہوگا اور قیامت تک باقی رہے گا۔ اس کا حل صرف اور صرف اجماع ہے۔ اجماع جہلاء کا نہیں علماء کا ہوتا ہے اور یہی اجماع اختلاف کو رحمت کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔

اگر امت مسلمہ میں دین کی صرف ایک تعبیر و تشریح ہی الحق ہوتی تو یہ امت کب کی تباہ ہو چکی ہوتی۔ اس امت کی زندگی ان مکاتب فکر کے اختلاف کے باعث جاوداں ہو گئی ہے لیکن یہ اختلاف تاریخ کے جس دور میں بھی اجماع سے تجاوز کرے گا تو زحمت بن جائے گا۔

مختلف مسالک کے اکابرین کا احترام: امت کی روایت :

امت مسلمہ کی تین اہم جلیل القدر عظیم الشان شخصیات جو پوری امت کے تمام مسالک کے نزدیک واجب الاحترام ہیں حضرت امام غزالیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور ابن العربیؒ ہیں ان میں سے پہلے شافعی مسلک، دوسرے حنبلی مسلک اور تیسرے ظاہری [اہل حدیث] مسلک سے تعلق رکھتے تھے مگر اہل سنت والجماعت جن کی اکثریت حنفی ہے ان تینوں سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ [شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول کے اشراقی فلسفے کو بھی عموماً پسند کیا جاتا ہے، حالانکہ صلاح الدین ایوبی کے بیٹے نے شیخ کی بعض ناگفتہ سرگرمیوں کے باعث انھیں قتل کرا دیا تھا۔ شہاب الدین مقتول، منصور حلاج، سرمد وغیرہ کے قتل کے سلسلے میں ان کے حامیوں اور مخالفین نے مختلف نقطۂ ہائے نظر بیان کیے ہیں جن کی تحقیق سے بعض نہایت اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ لوگ بعض

خفیہ سرگرمیوں میں ملوث تھے اور حکومت وقت کے خلاف متحرک تھے لہٰذا بغاوت و فساد کے جرم میں انھیں قتل کیا گیا۔ دوسرا موقف یہ ہے کہ اس نام کے دو دو افراد موجود تھے۔ ایک گمراہ تھا، ایک حق پر تھا۔ ہم حق والوں کا دفاع کرتے ہیں، امام طبری کے بارے میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ طبری بھی دو تھے ایک اصل ایک ملحد ان توجیہات پر ایک محقق کا یہ تبصرہ اہمیت کا حامل ہے کہ ''ایک ہی نام کے دو افراد ہیں ایک ہی تاریخ کو پیدا ہوئے ہیں، ایک ہی ماں کے بطن سے دونوں وجود میں آتے ہیں، ایک ہی طرح کی زندگی مہد سے لحد تک بسر کرتے ہیں اور ایک ہی قبر میں مدفون ہوتے ہیں'' یہ تبصرہ تحقیق کے نئے افق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔] تصوف کی امہات کتاب کے اکثر مصنفین شافعی ہیں مگر تمام احناف شافعی مصنفین کی کتابیں بخوشی پڑھتے ہیں دینی مدارس کے نصاب میں شامل ''جلالین'' کے مصنف شافعی ہیں فلسفہ پر ملا صدرہ شیرازی کی ''اسفار اربعہ''، ''شرح ہدایہ الحکمہ'' اہل سنت کے دینی مدارس کے نصاب کا حصہ ہیں۔ جب کہ ملا صدرہ شیعہ عالم تھے۔ زمخشری کی تفسیر نصاب میں شامل ہے جو معتزلی تھے تفسیر بیضاوی کے مصنف شافعی ہیں مگر یہ کتابیں دیگر تمام مسالک و مکاتب فکر کے مدارس میں آج بھی پڑھائی جاتی ہیں لہٰذا یہ استدلال درست نہیں کہ فرقہ واریت کا خاتمہ ممکن نہیں ہے اور ہمارے مذہبی طبقات کبھی وحدت امت کے راستے پر گامزن نہیں ہو سکتے یہ بات درست ہے کہ وحدت امت کا راستہ اتنا آسان نہیں ہے اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں اور یہ مقامات بہت آسانی سے طے کیے جا سکتے ہیں۔ عوام کی سطح پر تو یہ مشکل مقامات رفتہ رفتہ طے ہو چکے ہیں مگر علماء کی سطح پر آج بھی باقی ہیں تاریخی فاصلوں میں کچھ کمی ہوئی ہے مگر سفر اب بھی دشوار ہے اس راہ میں رکاوٹ کیا ہے شاعر کی زبان میں کہا جائے تو۔

دلوں میں فاصلہ اتنا نہیں ہے
زمانہ درمیاں آیا ہوا ہے

اب یہ بتانا کہ زمانہ کیا ہے ہمیں ''حدیث دہر'' کی طرف لوٹنا پڑے گا جس کے بارے میں ارشاد رسالت مآب ﷺ ہے کہ ''زمانہ کو برا مت کہو''۔

تمام مسلمہ مکاتب فکر کی عبادات میں کوئی فرق نہیں:

تمام مکاتب فکر بشمول شیعہ مکتب فکر تمام بنیادی عبادات میں سب کے یہاں فرائض مشترک ہیں، دیگر امور میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف ہمیشہ اور ہر جگہ رہے گا۔ یہ اختلاف امت کے لیے رحمت ہے اس کے برعکس منکرین حدیث کے ۷۲ فرقے ہیں اور ۷۲ فرقوں میں کسی ایک فرقے میں نماز کی رکعات، تعداد نماز حتی کہ پنج وقتہ نمازوں میں فرائض و واجبات پر بھی شدید اختلافات ہیں، اس کے برعکس شیعہ اور دیگر مکاتب فکر کی نماز میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔

اس امت میں چند مستثنیات کو چھوڑ کر تاریخی طور پر اتحاد اور وحدت کا عمل ہمیشہ برقرار رہا بعض

تنازعات اور ہنگامی حالات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اس امت کا شیرازہ بکھر گیا ہے جدیدیت پسند مسلم مفکرین کا نقطہ نظر ہے ''خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی'' کا دعویٰ محض اقبال کی شاعری نہیں بلکہ اس امت کے اصل منصب کی حقیقی ترجمانی ہے۔

حدیث جبرئیل اور علوم ثلاثہ: امام غزالیؒ کا احسان :

مشکوۃ شریف کی پہلی حدیث حدیث جبرئیل نے ہمیں علوم ثلاثہ سے آگاہ کیا۔ علم ایمان، علم عبادات اور احسان ان تین علوم کی تشریح جب کی گئی تو اسے علم کلام و عقائد فقہ اور مسائل اور تصوف کے دھاروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جس کے باعث تنازعات کا ایک سلسلہ شروع ہوا، لیکن امام غزالیؒ نے ان تینوں دھاروں کو ایک مرتبہ پھر مجتمع فرما کر امت کی شیرازہ بندی کی اور اسے یونانی فلسفے کے فتنے سے محفوظ کر دیا۔

اختلافات حل کرنے کے پانچ مختلف طریقے:

حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ، ابوحنیفہؒ، غزالیؒ، ابن تیمیہؒ:

واضح رہے کہ پہلی صدی ہجری میں خوارج کا فتنہ پھیل کر سینکڑوں فرقوں کے وجود کا باعث بنا تو امام ابوحنیفہ نے الفقہ الاکبر لکھ کر اس دھند کو صاف کیا جو عقائد و ایمانیات کے باب میں پیدا کی گئی اور کشت و خون کا باعث ہوئی۔ قرن اول اور خیر القرون میں فتنہ ارتداد اٹھا تب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پوری قوت و طاقت سے اس فتنے کو کچل دیا اور صحابہ کرام کے مشورہ مصالحت کے جواب میں فرمایا کہ یہ لوگ اگر اونٹ کی رسی کی قیمت کے برابر زکوۃ دینے سے انکار کریں گے تب بھی ان سے لڑوں گا۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ نے خوارج کے فتنے کا سامنا کیا لیکن خوارج کو کافر قرار نہیں دیا۔ امام غزالی نے فقہاء، صوفیاء اور متکلمین کے مابین خلیج کو وحدت شریعت کے کل میں سمو کر تمام اجزاء کے مابین خلیج کو پاٹ دیا اور علم کلام کا یہ مسئلہ طے کر دیا کہ جو لوگ اہل قبلہ میں سے ہیں ان کی تکفیر نہیں کی جا سکتی ان کے پیچھے نماز جائز ہے۔ [یہاں قادیانیت کا سوال اٹھایا جا سکتا ہے اس سلسلے میں قومی اسمبلی میں مرزا ناصر احمد امیر جماعت احمدیہ کا بیان اور اس پر علماء اور مفتی محمودؒ کی جرح کا مطالعہ کیا جائے لہٰذا جس چیز نے انھیں دائرہ اسلام میں داخل کیا تھا اس کے صریح انکار کے نتیجے میں انھیں دائرہ اسلام سے خارج کیا گیا اور یہ فیصلہ بھی ان کا موقف ان کی زبان سے سننے کے بعد کیا گیا۔] امام تیمیہؒ کا پانچواں طریقہ ابن قیمؒ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

امام ابن قیم کی نظر میں منکر کی اقسام:

انکار منکر کی چار صورتیں:

انکار منکر کے چار درجے ہیں:

۱۔ منکر کو زائل کر کے اس کی جگہ معروف کو قائم کر دیا جائے۔

۲۔ منکر کو بالکلیہ زائل نہ کیا جا سکے تاہم اس کی شدت میں کمی کر دی جائے۔
۳۔ ایک منکر کو مٹایا جائے اور اُسی پیمانے کا دوسرا منکر برپا ہو جائے۔
۴۔ منکر کو مٹانے کے نتیجے میں اس سے بدتر اور خطرناک تر منکر اٹھ کھڑا ہو۔

پہلے دو درجوں میں نہی عن المنکر کا فرض سرانجام دینا عین تقاضائے شریعت ہے تیسرا درجہ محل اجتہاد میں ہے [یعنی اس میں غور و فکر کے بعد کوئی سا پہلو اختیار کیا جا سکتا ہے] لیکن چوتھے درجہ میں منکر سے تعرض کرنا حرام ہے۔ چنانچہ تم اگر اوباش لوگوں کو شطرنج بازی میں مگن پاؤ تو تم اگر انہیں شطرنج سے روک کر کسی ایسے کھیل میں لگا سکو جو خدا اور رسولؐ نے پسند کیا ہو مثلاً تیر اندازی یا اسپ دوانی وغیرہ تو فبہا ورنہ یونہی ان پر تمہارا نکیر کرنا بصیرت و تفقہ کے دیوالیہ پن کی علامت ہوگی۔ اسی طرح ایک جگہ تم دیکھتے ہو کہ فساق و فجار کا مجمع ہے، وا لہو و لعب دی جا رہی ہے یا رقص و سرود کی محفل جمی ہوئی ہے تو اگر تم کسی تدبیر سے انھیں اللہ کی اطاعت و عبادت کی جانب مبذول کر سکو تو یہ عین مقصود و مطلوب ہے اور اگر یہ نہ کیا جا سکے تو ان کو اپنے حال میں مست رہنے دینا اس سے بہتر ہے کہ تم انھیں وسیع تر فتنہ پردازی کے لیے فارغ کر دو، حالانکہ جس چیز میں وہ اب مستغرق ہیں وہ انھیں اس فتنہ پردازی سے غافل کیے ہوئے ہے۔ ایسے ہی اگر ایک شخص فحش قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے میں منہمک ہے اگر اُسے ایسی چیزوں کے مطالعے سے منع کرنے کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ بدعات و ضلالات اور طلسم و جادو کی کتابوں کی طرف رجوع کرے گا تو اُسے پہلی نوعیت کی کتابوں ہی میں مشغول رہنے دیا جائے۔ الغرض اس طرح کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ قدس اللہ روحہ فرماتے تھے کہ فتنہ تاتار کے زمانہ میں ہمارا گزر ایک گروہ پر ہوا جو شراب و کباب میں مشغول تھا۔ میرے ایک ساتھی نے ان لوگوں کو شراب نوشی سے منع کرنا چاہا مگر میں نے اسے ٹوکا کہ بندۂ خدا شراب اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روکتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے حرام کر دیا ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ شراب ان ظالموں کو بڑے فتنے یعنی قتل نفوس، سلب اموال اور عورتوں اور بچوں پر دست درازی سے روکے ہوئے ہے لہٰذا ان کو ان کے حال ہی پر چھوڑ دیا جائے۔

اس طرح امت پانچ مختلف قسم کے دور فتن سے گزری اور پانچ مختلف قسم کے طریقہ کار وجود میں آئے اور امت کا شیرازہ بکھرنے سے محفوظ رہا یہی اس امت کا کمال ہے۔ یہ طریقہ کار آج بھی صورت حال کے لحاظ سے قابل عمل ہیں۔

کافر کون ہے: یہ مسئلہ قیامت تک کے لیے طے ہوگیا :

جو اہل قبلہ نہیں ہیں وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں، جو اہل قبلہ[1] ہیں ان میں بعض گروہ ایسے ہیں جن کے یہاں کفر پایا جاتا ہے لیکن وہ کافر نہیں۔ اہل السنّت والجماعت کے طریقے سے الگ طریقہ رکھے

---

[1] دور سلف از صحابہ کرام تا محدثین کرام و آیمہ اربعہ مین کفر سازی کے فتوے نا ہونے کے برابر تھے، یہ دور اجتہاد و محدثیت کا دور تھا، بعد مین جب سب اپنے اپنے فقہ مین جامد ہوکر فرقہ کہلانے لگے تب یہ مباحث پیدا ہونے، اول اسکی ابتدا فرقہ خوارج و روافض مین سیاسی حکومتی مباحث مین دور خلفائے راشدین مین شہادت عثمانی کے بعد شروع ہوئی۔ معج

والوں کو اہل سنت بدعتی کہتے ہیں لیکن بدعتی مسلمان ہیں ان کی امامت جائز ہے اور ان کی امامت میں نماز پڑھ کر لوٹانے والے کو امام احمد حنبل بدعتی کہتے ہیں۔

کون کون مسلمان ہے: یہ مسئلہ بھی قیامت تک کے لیے طے ہو گیا :

اہل قبلہ مسلمان ہیں، اہل بدعت مسلمان ہیں، اسی اصول کے تحت خوارج مسلمان ہیں اور تمام دیگر مکاتب فکر بھی مسلمان ہیں، اس کے باوجود اگر کوئی مکتب فکر ان اصولوں کی موجودگی میں کسی کو کافر کہتا ہے تو اسے فرمان رسالت مآبؐ یاد رکھنا چاہیے کہ "جب ایک مسلم دوسرے مسلم کو کافر کہتا ہے تو یقیناً ان میں سے ایک کافر ہے"۔ یہ قول رسول امت کے لیے ہدایت ہے اور مشعل راہ بھی۔

وحدت امت: ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھو :

وحدت امت کا تقاضہ ہے کہ بنیادی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھی جائے کیوں کہ نماز اجتماعیت کا مظہر ہے اس مظہر کو ہر صورت میں وحدت کی علامت ہونا چاہیے۔ سلف کا طریقہ یہی تھا۔ امام ابن تیمیہؒ کا فتویٰ ہے کہ جس امام کے پیچھے نماز پڑھو اس کے طریقے کی پیروی کرو، امام احمد بن حنبلؒ اور امام مالک میں جسم سے خون بہہ نکلنے پر وضو برقرار رہنے پر اختلاف ہے لیکن اس بنیادی اختلاف کے باوجود احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ اگر سعید بن مسیب اور امام مالکؒ نماز پڑھا رہے ہوں تو میں ان کی اقتداء کروں گا حالانکہ ان کے مسلک میں خون بہنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ مولانا ثناءاللہ امرتسری اعلیٰ حضرت بریلوی اہل قبلہ کی تکفیر کے قائل نہیں۔ امام شافعیؒ معتزلہ کی امامت کو درست سمجھتے تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ خوارج کو مسلمان تسلیم کرتے تھے۔ حضرت حسن بصری بدعتی کے پیچھے نماز درست قرار دیتے ہیں۔ احمد بن حنبلؒ بدعتی کے پیچھے نماز پڑھ کر لوٹانے والے کو بدعتی کہتے ہیں، عبداللہ بن عمرؓ حجاج جیسے ظالم کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے۔ ابن تیمیہؒ شیعہ حضرات کے پیچھے نماز پڑھنا ٹھیک سمجھتے ہیں۔ احمد بن حنبلؒ جہمیہ اور مرجۂ سے مناظروں کے باوجود ان کی مغفرت کی دعاء کرتے تھے۔ ابن تیمیہؒ شیعہ مکتب فکر کو نہ کافر کہتے ہیں نہ مرتد، انھیں اہل قبلہ میں شامل کرتے ہیں۔ نماز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ جب مدینہ میں باغی حضرت عثمانؓ کو قتل کرنے کے لیے جمع ہوئے اور لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ کیا ان باغیوں کے پیچھے نماز جائز ہے تو حضرت عثمانؓ نے اسلامی ریاست کے باغیوں اور متوقع قاتلوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے پیچھے بھی نماز پڑھو اور قرآن کی وہ آیت پڑھی کہ نیکی کے کاموں میں سب کا ساتھ دو اور گناہوں کے کام میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ امام غزالیؒ کا رسالہ "التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ" اس موضوع پر معرکۃ آراء رسالہ ہے۔ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کا رسالہ تکفیر الملحدین بھی اہم رسالہ ہے۔ اس سلسلے کی تفصیلات آپ مضمون "اہل قبلہ میں کوئی کافر نہیں" میں مطالعہ فرمائیں۔[1]

---

[1] اہل قبلہ کے عموم و تخصیص پر کالم کیا گیا ہے، مگر اتنا سلف کا مجموعی عمل تھا کہ فروع میں کفرسازی سے پرہیز کرتے تھے، مگر بدعتوں اور انکے قائلین سے روبط سے نفرت فرماتے تھے، مزید یہ کہ اصول دین کے معاملے میں کفر کے نمونے بحرحال مل جاتے ہیں، جبکہ اس دور کے تمام فقہ قریبا اصول میں ایک تھے مگر اشعری، ماتریدی اور اہل حدیث کے محدثین میں جب ظاہر الفاظ، مجاز، باطن اور علم کلام پر بحث شروع ہوئی تو اصول میں بھی تاویل کے دروازے وا ہوئے، جنسے محدثین نے حتی الامکان اجتناب کیا تاوقتیکہ معتزلہ کا سیاسی عروج اور اہل سنت کے کچھ لوگوں کا انکی طرف رجحان معاملات خراب کرگیا۔ معج

یہ امت: تاریخ کے سفر میں:

تاریخ نے یہ بتا دیا ہے کہ مسلم امت ہر مشکل مرحلے سے زندگی پا کر نکلی ہے یہ اپنی خاکستر سے ققنس کی طرح بار بار جی اٹھتی ہے اس کی مٹی پر پانی کے چند چھینٹے بھی پڑ جائیں تو یہ مٹی لہلہانے لگتی ہے اس امت کی مثال اس کٹے پھٹے مجروح مضروب درخت جیسی ہے جس کے ہر حصۂ زخم سے نئی کونپلیں نئے شگوفے پھوٹتے ہیں نئی کلیاں مسکراتی ہیں اور نئے پھولوں کی فصل بہار لہلہا اٹھتی ہے تاریخ کے ہر دور میں یہ امت چوٹ کھا کر زخم پا کر مر کر بھی بار بار زندہ ہوتی رہی ہے اس امت نے آب حیات پی رکھا ہے یہ ہر نازک دور سے گزر کر اس طرح طلوع ہوتی ہے جس طرح رات کی تاریکی چھٹنے کے بعد اذان سحر کے ساتھ ہی سورج جگمگا اٹھتا ہے۔ اور زمین اس کی روشنی سے حرکت، حرارت تپش اور زندگی حاصل کر لیتی ہے۔ دنیا میں آباد تمام اقوام میں صرف مسلمان واحد امت ہے جس نے مغربی تہذیب کی تمام تجلیات کو جزوی طور پر قبول کرنے کے باوجود سیکولرائزیشن اور لبرلائزیشن کو عملاً مسترد کر دیا ہے۔ اس امت کا قلب آج تک مغربی تہذیب، مغربی ثقافت اور مغرب کے غلبے کو عملی اور نفسیاتی طور پر قبول کرنے پر آمادہ نہیں اس کی واحد وجہ اس امت میں مدارس، مساجد اور علماء کا مقدس وجود ہے یہ مدارس مساجد اور علماء یقیناً اس مقام و مرتبے کے حامل نہیں رہے جس طرح ماضی میں تھے مگر زوال کے اس دور میں بھی انہی مدارس، مساجد اور علماء نے امت مسلمہ کو اپنی تاریخی روایت سے ذہنی اور جذباتی طور پر وابستہ کر رکھا ہے اسی لیے آج بھی کسی گناہ گار مسلمان کے سامنے رسول اللہ کی غیرت و حرمت کا معاملہ آ جائے تو اس کی آنکھوں سے پہلے آنسو گرتے ہیں، اس کی روح لرزتی ہے دل دھڑکتا ہے ہونٹ کپکپاتے ہیں اور پھر اس کی آنکھوں میں لہو اتر آتا ہے یہ لہو ایمان اور عقیدے کا حاصل ہے جس کا تحفظ گزشتہ چودہ سو سال سے صرف اور صرف مساجد، مدارس اور علماء کے وسیلے سے ہو رہا ہے اس وسیلے کی حفاظت، اس سے محبت: اور اس سے والہانہ عقیدت ایمان کا تقاضہ ہے اس عقیدت کے ساتھ ساتھ اس وسیلے کو معیار مطلوب تک لے جانے کے لیے جدوجہد ہماری زندگی کا حاصل ہے۔

امت مسلمہ ہمیشہ ماضی کی طرف دیکھتی ہے:

امت مسلمہ کو اس روایت سے وابستہ رکھنے کا سب سے عظیم الشان ثمر یہ ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اپنے ماضی سے رشتہ توڑ چکی ہیں اور ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتی ہیں اور آئندہ کے بارے میں محو جستجو رہتی ہیں مگر امت مسلمہ دنیا کی واحد امت ہے جو ہمیشہ پیچھے کی طرف دیکھتی ہے اس کی تاریخ کے سارے سوتے چودہ صدی پہلے حجاز اور مدینہ کے گلی کوچوں، در و دیوار، نقش و نگار اور گل و گلزار سے پھوٹتے ہیں ماضی سے یہ بے پناہ وابستگی ہر خطے اور عہد کے مسلمان کو جذباتی اور روحانی طور پر عہد رسالت سے عملاً وابستہ کر دیتی ہے مدینے کے تصور سے وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ آقائے کائنات مدینہ میں محو سفر ہیں اور ان کا امتی مجسم قرآن کو چلتا ہوا دیکھ رہا ہے وہ اپنے آپ کو جماعت صحابہ کا ہم رکاب پاتا ہے جو رسول اللہ کے لیے جانیں نثار کر رہے تھے اپنے آپ کو میدان بدر، غزوہ احد،

سے لے کر سوق عکاظ تک رسول کی ہمراہی میں محو سفر پاتا ہے یہ جذباتی تعلق اس روایت کا تسلسل ہے جو قرآن و سنت عمل صحابہ اور امت کے تسلسل و متواتر عمل کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے اس لیے اقبال کا یہ کہنا بہت اہمیت کا حامل ہے کہ ''خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی اگر مسلمان اپنی تاریخ و تہذیب کے دور زریں سے اس وجہ جذباتی طور پر وابستہ نہ ہوں تو ان کا وجود دنیا کی کسی قوم کے لیے ناگوار نہ رہے مغرب، مغربی تہذیب اور امریکی استعمار تمام اقوام امت مسلمہ کو ان کے ماضی سے کاٹ کر مستقبل کے مادہ پرستانہ نظام سے جوڑنا چاہتے ہیں اس خواہش کی شدید ترین عملی مزاحمت امت مسلمہ کی جانب سے ہوئی ہے جو رسول اللہ سے اپنے جذباتی تعلق کو کسی قیمت پر ترک کرنے پر آمادہ نہیں۔

مغرب میں حفظ مراتب زندیقی ہے:

توہین رسالت کی سزا کے مسئلے پر مغرب کے شور و غوغا، ہنگامہ آرائی کا اصل مقصد حقوق انسانی کے نام پر اس تہذیب کا فروغ ہے، جہاں حفظ مراتب کو زندیقی سمجھا جاتا ہے اور جہاں کوئی بڑا نہیں سب برابر ہوتے ہیں اور مساوات کا حق مراتب وجود کا خاتمہ کر کے مذہبی اقدار کا بھی خاتمہ کر دیتا ہے۔ آزادی اظہار رائے کے حق انسانی کے نام پر توہین رسالت کا مقصد اس محبت کو زائل کرنا ہے جو ایمان کی اساس ہے۔ اس ہدف کے ذریعے رسالت مآبؐ سے اس جذباتی تعلق کو کم کرنے کی کوشش مقصود ہے جو مغربی تہذیب اور امریکہ کا اصل ہدف ہے اگر توہین رسالت کی سزا کا مسئلہ فی الحقیقت امریکہ اور مغرب کے لیے اہم ہوتا تو فقہ حنفی کی امہات کتب کے حوالوں کو انسانی حقوق کے استدلال کے طور پر استعمال کر سکتا تھا مگر مسئلہ توہین رسالت کی سزا کا نہیں بلکہ اس کی آڑ میں عشق رسول کے جذبے کو سرد کرنا ہے عشق رسول کی حدت جس دن بھی کم ہوئی امت مسلمہ اپنی انفرادیت کھو دے گی لہذا محبت رسول ہمارے ایمان کا تقاضہ ہے اس محبت کو زندہ پائندہ رکھنے کی ہر کوشش خواہ کسی مکتبہ فکر کی جانب سے کسی صورت میں ہو ایمان کی حفاظت کا عمل ہے۔

اس دور کا المیہ ہے کہ تاریخ کے بہت سے اسباق جان بوجھ کر فراموش کر دیے گئے ہیں عموماً بڑے بڑے محققین، مفکرین اور علماء کرام تک نہایت تاسف سے یہ کہتے ہیں کہ امت کا اتحاد ممکن نہیں ہے اختلافات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ اب اتحاد کی باتیں خوبصورت تو بہت ہیں مگر قابل عمل نہیں اس مایوسی اور پسپائی کو یقین اور اعتماد میں بدلنے کے لیے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے عہد میں برپا فرقہ وارانہ تنازعات اور مذہبی اختلافات کا تاریخی جائزہ ''فرقہ وارانہ تنازعات میں اعتدال کی راہ'' میں لیا گیا ہے۔

اسلامی تاریخ کا سب سے پر آشوب خطرناک اور خوفناک دور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ جب خوارج، مرجئہ اور معتزلہ جیسے فرقے وجود پذیر ہوئے اور ان کے درمیان تاریخی جنگیں لڑی گئیں اس عہد کی مختصری تاریخ ''مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کی ابتدا اور اس کے اسباب'' میں دی گئی ہے۔

اس عہد میں بھی امت مسلمہ کی پچانوے فیصد اکثریت سواد اعظم اہلسنت کی صورت میں ان تمام تنازعات سے الگ تھلگ رہی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اہلسنت والجماعت میں گزشتہ چودہ صدیوں کے درمیان ایک بھی فرقہ پیدا نہ ہوسکا البتہ پانچ مسالک موجود ہے اس کے علاوہ بہت سے ائمہ و علما انفرادی طور پر اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے رہے مگر یہ تمام مسلک اہل سنت کے بنیادی عقائد میں متفق اللفظ تھے لیکن رفتہ رفتہ گروہ بندی کا دائرہ عمل اور ردعمل کے تاریخی جبر کے باعث بڑھتا رہا۔ مرجیہ، اباضیہ، شیعہ، خوارج اور معتزلہ میں بے شمار فرقے پیدا ہوئے اور ان میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ایک مختصری تحقیق کے مطابق پانچویں صدی ہجری تک ان مکاتب فکر میں بے شمار فرقے تھے خوارج کے فرقوں کی تعداد ۲۱ سے اوپر ہے اور معتزلہ جو اسلامی تاریخ میں علم، عقل، دانش، سائنس، جدیدیت کے سب سے بڑے علمبردار سمجھے جاتے تھے اور خرد افروزی کی تحریک کے بانی تھے ان کے فرقوں کی تعداد بھی ۵۲ سے زیادہ تھی اور سب سے زیادہ تشدد اسی معتزلہ فرقے نے کیا جو جدیدیت کا سب سے بڑا علمبردار تھا مگر اس تشدد کے نتیجے میں اہل سنت نے صرف صبر اور توقف کا دامن تھاما اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف ستر برس کے عرصے میں معتزلہ کا وجود مٹ گیا اہل سنت دوبارہ افق پر طلوع ہوئے اب معتزلہ کی کتابیں بھی تاریخ کے دفتر میں دستیاب نہیں ہیں استبداد اور آمریت اپنے ہاتھوں اپنی لحد کھودتی ہے اور خود اس میں ہمیشہ کے لیے اتر جاتی ہے یہی صورت حال دیلمی، قرامطہ اور فاطمیین مصر کے عہد میں وجود پذیر ہوئی خانہ کعبہ سے حجر اسود اکھاڑ کر لے جایا گیا اور عالم اسلام میں تقریباً ساٹھ برس تک اہل سنت کے مدارس مکمل طور پر بند رہے اس کے جواب میں صبر اور عزیمت کی راہ اختیار کی گئی اور پھر تاریخ کا سفر صحیح سمت میں شروع ہو گیا۔

اہل قبلہ میں کوئی کافر نہیں ہے:

امام ابو حنیفہؒ نے ”الفقہ اکبر“ میں کفر و اسلام کے جو پیمانے مقرر کیے وہی پورے عالم اسلام کی میراث بن گئے۔ ان سے پہلے بھی اس امت کی اکثریت کا عمل اسی پر تھا مگر اس عمل کو باقاعدہ تحریری پیکر عطا کرنے کا سہرا حضرت امام ابو حنیفہؒ کے سر ہے۔ ”الفقہ اکبر“ میں انھوں نے جو توازن اعتدال ولائل کی صورت میں پیش فرمایا اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ امت کئی صدیوں تک افتراق کے عمل سے خالی رہی۔ اس توازن و اعتدال کی بنیاد پر خوارج، معتزلہ جیسے فرقوں کو بھی کافر، غیر مسلم، مشرک، ملحد، مرتد کے القابات سے نوازا نہیں گیا۔ اسی مسلک اعتدال کے باعث اس امت کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کبھی شیعہ مکتب فکر کو غیر مسلم قرار نہیں دیا گیا۔ حالاں کہ بنیادی عقائد، معاملات اور مصادر شریعت کے سلسلے میں اہل تشیع سے بنیادی اختلافات کے باوجود اس امت نے متفقہ طور پر اہل تشیع کو ہمیشہ دائرہ اسلام میں داخل سمجھا۔ حدود حرم میں کبھی ان کا داخلہ ممنوع نہیں قرار دیا گیا۔ اہل تشیع کی مساجد سے بلند ہونے والی اذان جس کے اختتامی کلمات میں حضرت علیؓ کے خلیفہ بلافصل ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے ان کلمات پر بھی کبھی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ امویوں اور عباسیوں کے دور حکومت میں آل علیؓ نے مختلف مواقع

پر خلفائے وقت کے خلاف اڑسٹھ خروج کیے [تاریخ طبری جمہرۃ الانصاب[١] العرب لابن حزم تاریخ ابن کثیر] یہ مسلسل خروج اس بات کی علامت ہیں کہ اس عہد میں تلوار اٹھانے کی بھی اجازت رہی اگر یہ اجازت نہ ہوتی تو اڑسٹھ خروج کیسے ممکن ہوتے۔ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی جو مسلمانوں کی اجتماعیت، سادگی اور بے ریا طرز زندگی کے آئینے ہیں ان کی حدود میں کبھی کسی شخص کو ایک ہی طریقے سے عبادت کے لیے مجبور نہیں کیا گیا۔ یہ اللہ اور اس کے محبوب کا دربار ہے، یہاں حاضری اور حضوری اللہ اور عبد کا براہ راست معاملہ ہے، لہٰذا کوئی کسی کی عبادت میں مخل نہیں ہوتا۔ ہر فرد اپنی روحانی دنیا میں محصور اللہ سے ہم کلام ہے، اس ہم کلامی کے مناظر حدود حرم اور صحن مسجد نبوی میں شب و روز دیکھے جاسکتے ہیں۔ امت مسلمہ کی تاریخ میں کبھی بھی نہ تو شیعہ مساجد و مدارس پر کوئی پابندی عائد کی گئی۔ نہ ان کی کتب کی اشاعت ممنوع قرار پائی گئی۔ نہ ان کی مجالس کے معاملات پر کوئی قدغن عائد کی گئی یہ وسعت فراخ دلی رحمت العالمین کی امت کی معراج ہے اور اسے آج کے حالات میں بھی اسی طرح قائم و دائم رکھنا دین اور ایمان کا تقاضہ ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں خوارج عروج پر تھے امت مسلمہ کی تاریخ میں خوارج سے زیادہ بدتر کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا جس نے امت مسلمہ کے دو جلیل القدر اصحاب اہلسنت حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کو کافر قرار دیا ان کا خون حلال ٹھہرایا اور پوری امت مسلمہ کو کافر و مشرک بنادیا تاریخ کے کسی دور میں خوارج جیسا فرقہ دوبارہ ظہور پذیر نہیں ہوا مگر امت مسلمہ کے ان دونوں جلیل القدر اور عظیم الشان بزرگوں حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ نے اس کے جواب میں نہ تو خوارج کو کافر و مشرک قرار دیا نہ ان کے مال و اولاد کو کسی مسلمان کے لیے حلال ٹھہرایا نہ خوارج کو امت مسلمہ سے الگ کوئی فرقہ قرار دیا بلکہ ان کو وہی حقوق دیے گئے جو امت مسلمہ کے ہر فرد کو حاصل تھے خوارج نے کئی بار قتل کی دھمکی دی مگر اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے فرمایا دھمکی ہے عمل تو نہیں کیا۔

خوارج نے حضرت علیؓ و حضرت معاویہؓ کو کافر قرار دیا:

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا خوارج کے بارے میں متفقہ مسلک یہی تھی کہ کلمہ گو مسلمان ہیں لہٰذا ان کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو امت مسلمہ کے ایک فرد کے طور پر دوسروں کو حاصل ہیں ان کے مساجد میں داخلے پر کوئی پابندی نہیں ہوگی ان کی شر انگیز کارروائیوں کے باوجود ان کے خلاف کبھی ہتھیار اٹھانے میں پہل نہیں کی جائے گی اگر وہ حملہ آور ہوں تو صرف دفاع کیا جائے گا اور جیسے ہی دفاع کامیاب ہو جائے ہتھیار رکھ دیے جائیں گے ان کے مخصوص علاقوں میں جاسوسی کا کوئی نظام کبھی قائم نہیں کیا گیا نہ ہی ان کی مساجد پر پہرے بٹھائے گئے اور نہ انھیں تقریر و تحریر سے روکا گیا ان کی مساجد میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کو کافر و مشرک کہا گیا ان کے قتل کی سازشیں تیار ہوئیں اسلامی حکومت پر کئی حملے ہوئے مگر حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ نے کبھی اقدام کر کے اس گروہ کی سرکشی کی سرکوبی نہیں کی یہ اس امت کا وہ عمل ہے جس پر آج بھی عمل کر کے ہم فرقہ واریت کے مسئلے کو

---

[١] جمہرۃ الانساب العرب..ابن حزم اندلسی:صحیح:جمہرۃ الانصاب: غلط

لمحوں میں حل کر سکتے ہیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی اس مشترکہ روایت کو امام ابوحنیفہؒ نے ایک جملے میں سمو کر کفر و اسلام کا فرق واضح فرما دیا۔ آپ نے کہا کہ جو قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھتا ہے اور ہمارا ذبیحہ کھاتا ہے وہ ہم میں سے ہے۔ اس اصول کے تحت فرقہ بندی اختلاف، نفرت، تشدد کا آج بھی لمحوں میں خاتمہ ممکن ہے دہشت گردی کی وارداتوں کو مدارس سے جوڑنے والے جدیدیت پسند پندرہ سو سال میں اہل سنت کے کسی کے مدرسے کا کوئی فتویٰ نہیں دکھا سکتے جس میں اہل تشیع کے خون کو مباح قرار دیا گیا اور لوگوں کو ان کے قتل پر اکسایا گیا ہو آج بھی دنیا کے کسی مدرسے سے ایسا فتویٰ نہیں لیا جا سکتا۔

امام اعظم امام ابوحنیفہؒ نے خوارج، شیعہ، معتزلہ، مرجۂ کے معاملے میں جو علمی استدلال اختیار کیا اور اہل سنت والجماعت کا عقیدہ اور مسلک جس عظمت کے ساتھ ''الفقہ الاکبر'' میں بیان کیا یہ ایک معرکۃ آرا کام ہے اس کام کی تفصیلات آپ اس شمارے میں پڑھ سکتے ہیں عصر حاضر کے تمام مسالک و مکاتب فکر کے فرقہ وارانہ اختلافات کا حل ''الفقہ الاکبر'' کے ذریعے تلاش کیا جا سکتا ہے جس میں تمام بنیادی اختلافی مباحث کے مدلل جوابات تحریر کیے گئے ہیں۔

اس امت کی وسعت فراخی اور عظمت کا اندازہ محض اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امام بخاریؒ جیسے جلیل القدر محدث عالم نے جن کی کتاب بخاری اصح الکتاب بعد القرآن سمجھی جاتی ہے۔ تاریخ صغیر میں امام ابوحنیفہؒ کے انتقال سے متعلق جو روایت درج کی ہے وہ احناف کے لیے سخت قابل اعتراض ہے۔ لیکن اس روایت کے باوجود احناف کے کسی مدرسے میں بخاری کی تعلیم و تدریس پر قدغن عائد نہ کی گئی۔ کبھی امام بخاریؒ پر تبرّیٰ نہیں کیا گیا بلکہ ان کا ذکر اور احترام امام ابوحنیفہؒ سے بھی زیادہ کیا جاتا ہے۔ امام بخاریؒ کی اس سخت روایت کے باوجود آج تک کسی حنفی عالم یا فقیہہ نے امام بخاریؒ کی اس روایت پر تنقید کی نہ گفتگو اس کی وجہ یہی ہے کہ امام بخاریؒ کا جو عظیم الشان کام ہے اس کے مقابلے میں اس نقد کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ یہ وسعت یہ فراخی اس امت کی میراث ہے۔

دیو بندی، بریلوی، شیعہ مسئلہ بہت ہی معمولی نوعیت کا مسئلہ ہے اصلاً پہلے دونوں مکاتب فکر فقہ حنفی کے پیروکار ہیں مگر بعض تاریخی غلط فہمیوں اور بعض تاریخی حادثات کے باعث دونوں گروہ ایک دوسرے سے فاصلے پر کھڑے ہو گئے ہیں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عقائد کے معاملات میں دونوں گروہوں کی کتابیں اور مسائل یکساں ہیں دیو بندی، بریلوی اختلافات کو رفع کرنے کی عظیم الشان کوشش سلطان المشائخ حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا رسالہ ''فیصلۂ ہفت مسئلہ'' ہے اصلاً یہ رسالہ دیو بندی مکتب فکر میں پیدا شدہ اضطراب اور اختلاف کو رفع کرنے کے لیے تحریر کیا گیا تھا اختلاف کرنے والے بعض اہل دیوبند کا کم و بیش وہی موقف تھا جو اب تاریخی طور پر بریلوی حضرات کا موقف قرار پا چکا ہے اس لیے دیو بندی بریلوی اختلافات کا عمدہ ترین حل حضرت مہاجر مکیؒ کا رسالہ ''ہفت مسئلہ'' ہے۔ جس میں تنازعات کو طے کرنے کا وہ طریقہ بتایا گیا ہے جس کو اختیار کر کے آج بھی دیو بندی، بریلوی

اختلافات لمحوں میں طے کیے جاسکتے ہیں۔

مختلف مسالک اور مکاتب فکر کے جید علماء نے کفر و اسلام کی جو حدود متعین کی ہیں اور ان مسالک میں اختلافات کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے اس کی تفصیلات آپ کو ان عنوانات کے تحت مطالعے کے لیے پیش کی جارہی ہیں:

[۱] اہل قبلہ میں کوئی کافر نہیں [۲] مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کے اسباب [۳] فرقہ وارانہ تنازعات میں اعتدال کی راہ [۴] اصحاب حدیث اور اصحاب فقہ کا اختلاف [۵] مذاہب فقہ اور اہل حدیث میں کوئی اصولی اختلاف نہیں [۶] فرقہ واریت: فتویٰ نویسی [۷] صدر اول میں اجتہاد کا طریقہ [۸] تقلید جامد ائمہ اربعہ کا کردار [۹] اسلامی ریاست میں گمراہ فرقوں کے مقام و مرتبے کے اصول [۱۰] عصر حاضر میں جہاد و خروج کی حکمت عملی [۱۱] خروج کے سلسلے میں امام ابو حنیفہؒ اور فقہ احناف کا مسلک [۱۲] خروج کی تاریخ وار تفصیلات [۱۳] پر تشدد تحریک کے ضمن میں مولانا مودودیؒ کا موقف اور اس کی اہمیت۔

ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر مسلم مکتب فکر ہر مسلک ہر تحریک اور ہر دینی جماعت کا یکساں احترام، ان سب سے یکساں محبت رکھی جائے، کسی گروہ کو کسی دوسرے گروہ پر تفوق نہ دیا جائے۔ بلکہ ان تمام گروہوں کے کاموں میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ تفوق فرقہ واریت کی جانب لے جاتا ہے اور تطبیق پیدا کرنے کا عمل وحدت امت کی سمت سفر کو تیز کر دیتا ہے ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ تبلیغی جماعت ہو یا دعوت اسلامی اہل دیو بند ہوں یا اہل بریلوی، جماعت اسلامی ہو یا جماعت شاہ ولی اللہ، جماعت اہل حدیث ہو یا دیگر مسلم مکاتب فکر [اپنی کم زوریوں، خامیوں کے باوجود جن میں اصلاح کی ضرورت ہے] ان کی نیت میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں یہ سب اپنے اپنے دائروں میں نہایت قیمتی اور نفیس کام کر رہے ہیں۔ ہر ایک نے اپنے لیے خاص دائرہ منتخب کیا ہے اور اسی دائرے میں محو سفر ہے، زندگی بے شمار دائروں کا سفر ہے لہٰذا ہر دائرے کی اہمیت ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تعلیم، تدریس، خطابت، تبلیغ، تلقین، جہاد، سیاست غرض ہر دائرہ امت کے کام کا دائرہ ہے کسی نے کسی دائرے میں اختصاص کیا ہے تو اس سے اس کی عظمت کم نہیں ہوتی۔ یہ دائرے مل کر ایک بہت بڑے دائرے کی تکمیل کرتے ہیں جس کا نام امت ہے، لہٰذا ان تحریکوں، جماعتوں کو تفریق کے بجائے تطبیق کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ ایک کی کمی دوسرا دائرہ پوری کرتا ہے اس طرح یہ دائرے ایک ہی سمندر کی موجیں، ایک ندی کی لہریں ایک آسمان کے ستارے، ایک مسجد کے منارے اور ایک دریا کے کنارے بن جاتے ہیں جو بظاہر الگ بھی ہوں تو اصلاً ایک ہی ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں متوازی نظر آتے ہیں لیکن ان کی اساس اور ان کی منزل ایک ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اس بات کا امکان ہے کہ ایسا اجتہاد وقوع پذیر ہو سکے۔ جماعت کے اختلاف کا دائمی خاتمہ کر دے۔

امت کا مسلک: اہل قبلہ میں کوئی کافر نہیں!

ہمارے اسلاف کسے کافر سمجھتے ہیں

حضرت علیؓ: اختلاف خلافت کی حقیقت:

”ایک یہودی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ لوگوں نے تو ابھی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دفن بھی نہ کیا تھا کہ اُمت میں فساد برپا ہو گیا تھا۔ کوئی جدید یت پسند ہوتا تو کہہ دیتا واقعی ہمارا دین تو اسی روز ختم ہو گیا تھا۔ رسالت مآب کی تجہیز و تکفین سے پہلے ہی وحدت امت کی تجہیز و تکفین ہو گئی تھی، امت تو اسی روز منتشر ہو گئی تھی لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور کیا خوب فرمایا کہ ہمارا اختلاف پیغمبر کے بارے میں نہیں ہوا بلکہ ان سے منسوب روایات کے بارے میں ہوا۔ کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ نعوذ باللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جھوٹے ہیں۔ سب لوگ ایمان پر قائم رہے۔ اختلاف روایات کے فہم پر تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر نہیں۔ گویا لوگوں نے حدیث کی تشریح میں اختلاف کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے برحق ہونے پر کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ یہودی کے الزام کو رد فرمانے کے ساتھ ساتھ آپ رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کو بھی آئینہ دکھایا اور کہا تم ذرا اپنے گریبان میں تو جھانک کر دیکھو۔ فرعون کی غرقابی کے بعد تمہارے پاؤں سے بحیرۂ قلزم کا پانی ابھی خشک نہیں ہوا تھا خود حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان موجود تھے کہ تم نے ایک قوم کو بچھڑے کی پوجا کرتے دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تقاضا شروع کر دیا کہ ہمیں بھی ایسا خدا بنا کر دو جس طرح کا ان لوگوں کا ہے۔ یہ مطالبہ کر کے نہ صرف تم دین سے پھر گئے تھے بلکہ توحید کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا۔

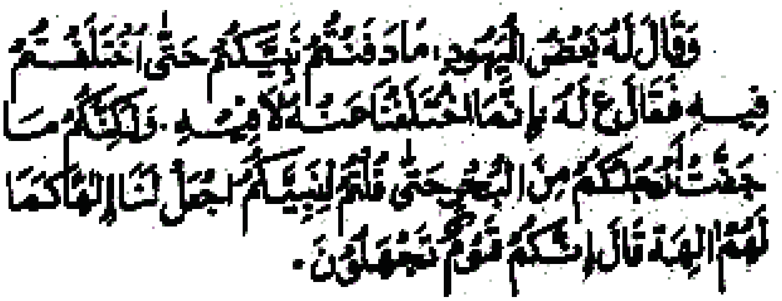

وَقَالَ لَهُ بَعْضُ الْيَهُودِ: مَا دَفَنْتُمْ نَبِيَّكُمْ حَتَّى اخْتَلَفْتُمْ
فِيهِ. فَقَالَ عَ لَهُ: إِنَّمَا اخْتَلَفْنَا عَنْهُ لَا فِيهِ. وَلَكِنَّكُمْ مَا
جَفَّتْ أَرْجُلُكُمْ مِنَ الْبَحْرِ حَتَّى قُلْتُمْ لِنَبِيِّكُمْ: اجْعَلْ لَنَا إِلٰهاً كَمَا
لَهُمْ آلِهَةٌ، فَقَالَ: إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ.

[نہج البلاغہ مع شرح الشیخ محمد عبدہ الجزء الثانی ص ۱۱]

اختلاف کے اسباب: صحابہ کرام میں:

حدیثوں کے بارے میں اختلافات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان بھی تھے۔ اس کی ایک مثال شیخین [بخاری و مسلم] کی یہ روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ اگر جنبی کو غسل کے لیے پانی نہ ملے تو وہ تیمم سے پاک نہیں ہو سکتا لیکن حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ وہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمسفر تھے انہیں غسل کی حاجت ہو گئی پانی میسر نہ اسکا تو انھوں نے مٹی میں لوٹ پوٹ لگائی بعد میں رسول اکرم صلی اللہ و آلہ وسلم سے اس عمل کا تذکرہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا صرف اس قدر کر لینا کافی تھا [یہ کہتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور چہرہ مبارک اور ہاتھوں پر مسح کیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے اس بیان کو تسلیم نہیں کیا۔ یہ روایت ان کے نزدیک دلیل نہ ٹھہری۔ اگرچہ بعد کے زمانہ میں بکثرت طریقوں سے یہ حدیث مشہور ہو گئی اس کے ضعیف ہونے کا وہم ماند پڑ گیا اور لوگ اس پر عمل پیرا ہو گئے۔

اختلاف کا ایک سبب یہ بھی ممکن ہے کہ صحابی تک کوئی حدیث پہنچی ہی نہ ہو۔ مثلاً امام مسلم رحمۃ اللہ کی یہ روایت کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہا عورتوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ غسل کرتے وقت وہ اپنے بال کھولیں۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سنا تو تعجب فرمایا اور کہا کہ عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ عورتوں کو بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں وہ کیوں نہیں کہتے کہ عورتیں بال ہی منڈوا لیں۔ حالاں کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہی برتن سے غسل کرتے تو میں اس کے سوا کچھ نہ کرتی کہ اپنے بالوں پر تین دفعہ پانی بہا لیتی امام زہری رحمۃ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ ہند رضی اللہ عنہ کو یہ علم نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استحاضہ کی حالت میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس لیے وہ اس حالت میں نماز نہ پڑھتیں اور ترک نماز کے غم سے رویا کرتیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلافات کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صحابۂ کرام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک عمل کرتے دیکھا۔ لیکن اس عمل کی حیثیت کے تعین میں اختلاف ہو گیا بعض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فعل کو کار ثواب خیال کیا اور بعض نے ایک امر جائز سمجھا مثلاً تحصیب [وادیٔ محصب میں نزول]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر حج کے دوران ابطح کی وادی میں قیام فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہاں قیام کرنا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک تو کار ثواب ٹھہرا اور انھوں نے اسے حج کی سنتوں میں شمار کیا جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک وہاں اترنا ایک اتفاقی امر تھا نہ کہ کسی ثواب کی خاطر۔

ان واقعات کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو بتایا جائے کہ بظاہر اصحاب رضی اللہ عنہم کے درمیان انتہائی بُعد کے باوصف کسی نے دوسرے کو کافر تو کجا گمراہ اور رجاہل بھی نہ کہا لیکن آج کل ہمارا رویہ جارحانہ ہوگیا ہے۔

کیا یہ رویہ آج ممکن ہے؟

مولانا یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے "معارف السنن" میں ایک واقعہ درج کیا ہے ایک روز قاضی ابو عاصم حنفی رحمۃ اللہ نماز مغرب کے لیے جا رہے تھے وہ القفال شافعی رحمۃ اللہ کی مسجد میں داخل ہوگئے جن سے مختلف مسائل کے بارے میں ان کے مباحثے اور مناظرے ہوا کرتے تھے۔

القفال شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی ابو عاصم حنفی رحمۃ اللہ کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا تو مؤذن سے کہا کہ آج اذان ترجیع کے بغیر [جس میں کلمات کو واپس دہرایا جاتا ہے] حنفی طریقے سے دی جائے اذان کے بعد علامہ القفال شافعی نے ابو عاصم حنفی رحمۃ اللہ سے نماز پڑھانے کی درخواست کی تو ابو عاصم حنفی رحمۃ اللہ نے رفع یدین وغیرہ کے ساتھ شافعی طریقہ کے مطابق نماز پڑھائی۔

وحدت امت ضروری ہے

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مُطابق مسئلہ یہ ہے کہ آپ نے چاند دیکھ لیا مہینہ انتیس تاریخ کو ختم ہوگیا لیکن دوسرے مسلمانوں نے چاند نہیں دیکھا۔ قاضی کو بھی اعتبار نہیں آیا۔ اور اس نے حکم دے دیا کہ روزہ رکھو تو عید کا چاند اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے باوجود وحدتِ اُمت کی خاطر آپ کو بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ روزہ رکھنا ہوگا۔ اس کے برعکس اگر روزہ افطار کرنے کا حکم دیا جائے تو افطار کرنا ہوگا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

الصوم يوم تصومون والفطر يوم تفطرون والاضحى يوم تضحون [1]

[سلسلة الاحاديث الصحيحة للالباني ج ١، حديث ٢٢٣، ص ٣٨٩]

"جس دن دوسرے مسلمان روزہ رکھیں، تم بھی رکھو اُس وقت روزہ کھول دو جب دوسرے افطار کریں۔ جس روز لوگ قربانی کریں تم بھی کرو"۔

گویا اگر اسلامی حکومت نے روزہ رکھنے کا اعلان کر دیا ہے تو روزہ رکھو خواہ تم نے چاند اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو اور اس وقت روزہ کھول دو جب دوسرے افطار کریں اور لوگوں کے ساتھ ہی قُربانی کریں۔ اصل مقصد وحدتِ اُمت اور اطاعتِ خداوندی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمت کو متحد رکھنے اور انتشار سے بچانے کے لیے جماعتی حکم پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی اجتماعی عبادتوں میں جمہور مسلمانوں کا ساتھ دینا وحدتِ اُمت کو برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔

---

[1] مجھے جامعی صاحب کی حوالہ کردہ حدیث سلسلہ کے اوردو ترجمہ میں حدیث عدد ،جلد عدد اور صفحہ عدد کے لحاظ سے نہیں ملی ہے،شاید انکے زیر نظر کوئی عربی نسخہ ہوگا،مگر بحرحال حدیث صحیح اور مشہور طور پر ثابت ہے معج

اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز:

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے بہ خوشی نماز پڑھ لیتے تھے کیوں کہ انہیں اُمت میں انتشار مطلوب نہ تھا وہ اس اختلاف کو رسالت مآبؐ کے الفاظ میں فی الاصل رحمت سمجھتے تھے اور اس اختلاف میں وسعت دیکھتے تھے۔ فہم اختلاف کے فطری عمل کو صحابہ کرام اچھی طرح سمجھتے تھے لہٰذا یہ اختلاف ان کی محبت اور مودت میں کسی کمی کے بجائے اضافے کا سبب بنتا تھا۔ مثلاً بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا فتویٰ تھا کہ وضو کر لینے کے بعد بالغ عورت کو ہاتھ لگ جانے پر وضو ٹوٹ جاتا ہے خواہ وہ ماں بہن ہی کیوں نہ ہو اور نیت کیسی بھی ہو اس طرح شرم گاہ کو چھو لیا تو وضو جاتا رہا جسم کے کسی حصے سے خون بہہ نکلا وضو ساقط ہو گیا حتیٰ کہ بعض اونٹ کا گوشت کھا لینے کے بعد تجدید وضو کو ضروری گردانتے تھے لیکن ان کے برعکس بعض صحابہ کے خیال میں ان اعمال کے سرزد ہونے کی صورت میں وضو پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ جن کا خیال تھا کہ ان اعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے وہ وضو کر لیتے تھے اور جن کا خیال اس کے برعکس تھا وہ دوبارہ وضو کو ضروری نہ سمجھتے تھے لیکن ایک دوسرے کے پیچھے نماز بہ خوشی پڑھتے تھے۔ انھیں کوئی تردد نہیں ہوتا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سفر میں پوری نماز پڑھا کرتے تھے یعنی ظہر، عصر اور عشاء کی چار رکعات پڑھتے تھے بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دوگانہ ادا کرتے تھے اگر امام چار پڑھانے والا ہوتا تو سب چار پڑھ لیتے۔ اور اگر امام دوگانہ نماز پڑھا رہا ہوتا تو چار رکعتوں کا موقف رکھنے والے اس کے پیچھے نماز پڑھ لیتے۔ یہ اختلاف ان لوگوں کو ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے سے نہ روکتا تھا اور وہ اپنی نماز کو درست سمجھتے تھے۔

امام ابو داؤد روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہٗ نے مِنٰی میں چار رکعت نماز ادا کی دوگانہ نہیں پڑھا حالانکہ حج کے موقع پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر اور خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہم دوگانہ پڑھتے تھے۔ بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار پڑھنا شروع کر دی۔ دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حسب سابق قصر ہی کرتے رہے۔

تاہم جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھنے کا موقع آیا تو انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں چار رکعتیں ہی پڑھیں پوچھنے والے نے بظاہر اس تضاد کے بارے میں دریافت فرمایا تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا۔ اُمت میں اختلاف پیدا کرنا شر ہے چار کیا؟ دو کیا؟ ان کا مسلک اپنی جگہ میرا اپنی جگہ لیکن اس اختلاف کو وجہ انتشار بنانا درست نہیں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عمل سے اختلاف کے باوجود حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں چار رکعتیں ہی پڑھیں۔ صحابۂ

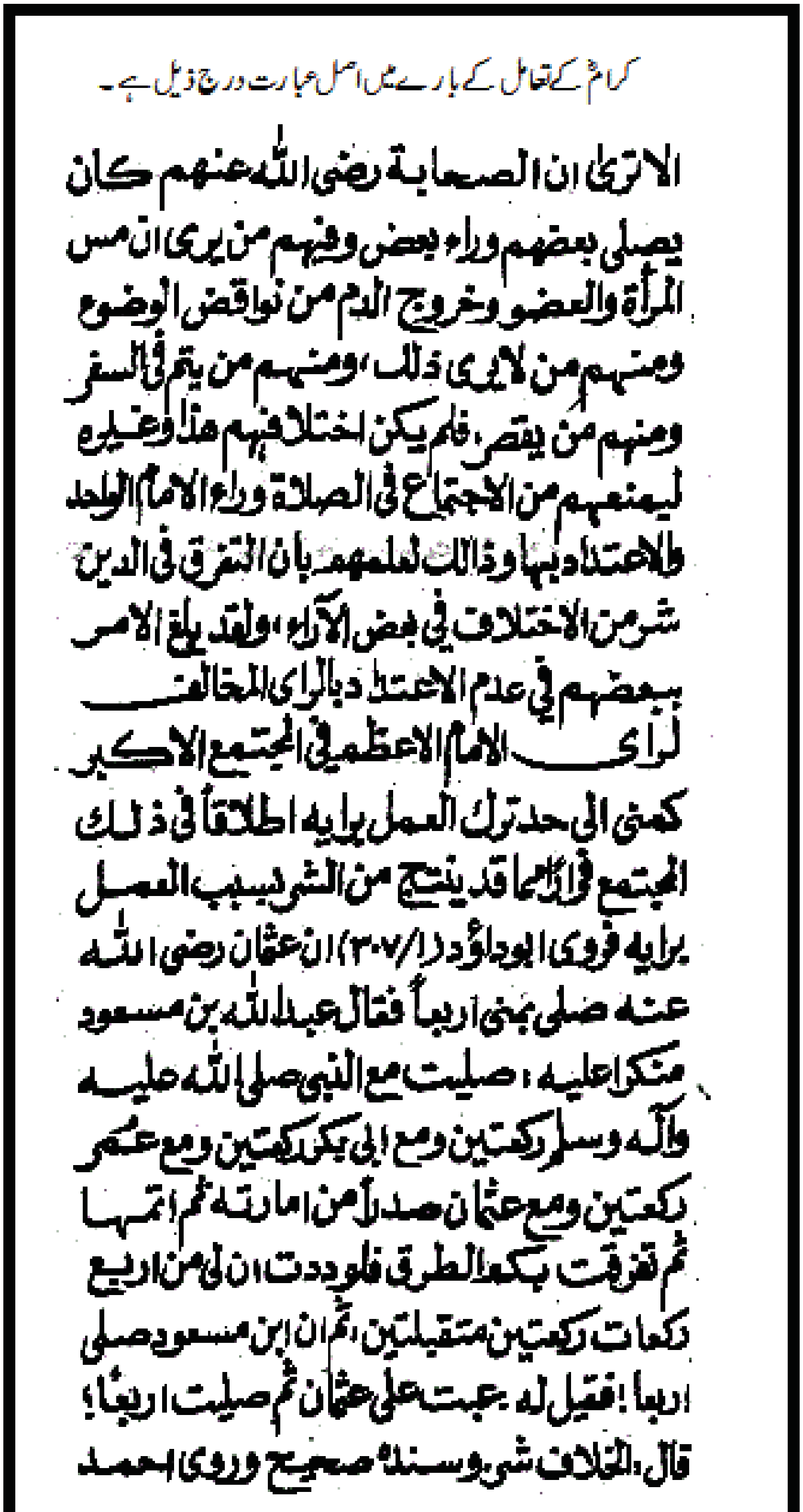

کرام کے تعامل کے بارے میں اصل عبارت درج ذیل ہے۔

الا ترى ان الصحابة رضي الله عنهم كان
يصلي بعضهم وراء بعض وفيهم من يرى ان مس
المرأة والعضو وخروج الدم من نواقض الوضوء
ومنهم من لا يرى ذلك، ومنهم من يتم في السفر
ومنهم من يقصر، فلم يكن اختلافهم هذا وغيره
ليمنعهم من الاجتماع في الصلاة وراء الامام الواحد
والاعتداد بها وذالك لعلمهم بان التفرق في الدين
شر من الاختلاف في بعض الآراء، ولقد بلغ الامر
ببعضهم في عدم الاعتداد بالرأي المخالف
لرأي الامام الاعظم في المجتمع الاكبر
كمنى الى حد ترك العمل برأيه اطلاقا في ذلك
المجتمع فرارا مما قد ينتج من الشر بسبب العمل
برأيه فروى ابو داؤد (۱/۳۰۷) ان عثمان رضي الله
عنه صلى بمنى اربعا فقال عبد الله بن مسعود
منكرا عليه، صليت مع النبي صلى الله عليه
وآله وسلم ركعتين ومع ابي بكر ركعتين ومع عمر
ركعتين ومع عثمان صدرا من امارته ثم اتمها
ثم تفرقت بكم الطرق فلوددت ان لي من اربع
ركعات ركعتين متقبلتين، ثم ان ابن مسعود صلى
اربعا! فقيل له عبت على عثمان ثم صليت اربعا!
قال الخلاف شر، وسنده صحيح وروى احمد

(ه/١٥٥) نحو هذا عن ابی ذر رضی اللّٰہ عنہم اجمعین۔

فليتأمل فی هذا الحديث وفی الأثر المذكور أولئك الذين لا يزالون يتفرقون فی صلواتهم ولا يقتدون ببعض أئمة المساجد وخاصة فی صلاة الوتر فی رمضان بحجة كونهم على خلاف مذهبهم وبعض أولئك الذين يدعون العلم بالفلك ممن يصوم ويفطر وحده متقدماً أو متأخراً عن جماعة المسلمين معتداً برأيه وعلمه، غير مبال بالخروج عنهم فليتأمل هؤلاء جميعاً فيما ذكرناه من العلم لعلهم يجدون شفاءً لما فی نفوسهم من جهل وغرور۔

[سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ للالبانی ج۔۱، حدیث ۲۲۴، ص ۳۹۱ تا ۳۹۳]

نماز وحدت امت کی علامت:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل پر ان لوگوں کو غور کرنا چاہیے جو مختلف فقہی مسالک کا بہانہ بنا کر ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور انتشار کو ہوا دیتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ دینی فہم رکھنے والا کون ہو سکتا ہے؟ ان کی عظمت کو تسلیم کرنے کے باوجود آج لوگ اس راستے پر چلنے سے اجتناب کیوں کرتے ہیں جس راہ پر چل کر انھوں نے وحدت ملت کو پارہ پارہ ہونے سے بچایا۔ اگر وہ اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ لینے میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے تو آج ہم فقہی مسالک کے اختلافات کو ہوا دے کر دین کی کون سی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مقتدی امام کی مکمل تقلید کرے[1]:

مقتدی کو چاہیے کہ جس امام کے پیچھے نماز پڑھے اس کی پیروی کرے۔ اگر امام قنوت پڑھتا ہے [جس طرح حنفی اور حنبلی مسالک کے لوگ وتروں میں قنوت پڑھتے ہیں] تو قنوت پڑھے اور اگر امام قنوت نہیں پڑھتا [شافعی لوگ رمضان کے آخری پندرہ دنوں میں پڑھتے ہیں مالکی سال بھر میں ایک دن بھی وتر میں قنوت نہیں پڑھتے] اور آپ اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں تو قنوت ترک کر دیں۔ فساد برپا نہ کریں۔ کیونکہ یہ طریقہ کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔

---

[1]۔ سید صاحب نے اس تحریر میں اختلاف فقہ کےباوجود نماز کا مشورہ دیا ہے مگر،انھونے اللہ جانے اپنے رجحانات یا پھر غیر قصداً تقلید کا لفظ استعمال کیا ہے ،حالانکہ اس بحث میں کہیں نماز کے لئے تقلید کا لفظ نہیں آیا ہے،خود انکی نقل کردہ عربی عبارت میں بھی یہ لفظ نہیں آیا ہے،انھونے جو بحث کا حوالہ دیا وہاں یہ حدیث وہ بحث علامہ البانی کی مجھے نہیں مل سکی،مگر بحرحال اس موضوع کی حدیث مجھے بخاری میں مل گئی(۶۸۹)جس میں کہا گیا ہے کہ:انما جعل الامام لیوتم بہ فاذا صلی قایماً فصلو قیاماً۔یعنی امام اس لئے مقرر کیا جاتا ہے کہ اسکا اتباع کیا جائے۔

خود انکے دی گئی عربی عبارت میں بھی آخر لفظ،یقتدون کو دیکھیں:صاحب حوالہ نے یہاں اقتدا و تقلد کو ہم معنی مترادف کے طور پر پیش کرکے حدیث کے معنی مفہوم میں ابہام پیدا کردیا ہے۔معج

ابن تیمیہ کا مسلک: وحدت امت امام کی تقلید:[1]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے بارے میں مداہنت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ کسی مسئلہ کے بارے میں نرمی اختیار کریں گے۔ فرماتے ہیں۔

> ولهذا ينبغي للمأموم ان يتبع[2] امامه فيما يسوغ فيه الاجتهاد فاذا قنت قنت معه وان ترك القنوت لم يقنت فتاوى ابن تيمية ج۲۳

مقتدی کو چاہیے کہ جس امام کے پیچھے نماز پڑھے اس کی پیروی کرے۔ اگر امام قنوت پڑھتا ہے [جس طرح حنفی اور حنبلی مسالک کے لوگ وتروں میں قنوت پڑھتے ہیں] تو قنوت پڑھے اور اگر امام قنوت نہیں پڑھتا [شافعی لوگ رمضان کے آخری پندرہ دنوں میں پڑھتے ہیں مالکی سال بھر میں ایک دن بھی وتر میں قنوت نہیں پڑھتے] اور آپ اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں تو قنوت ترک کر دیں۔ فساد برپا نہ کریں۔ کیونکہ یہ طریقہ کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔

وضو کا مسئلہ اور احترام مسلک:

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے جسم سے خون بہہ نکلنے پر بھی وضو باقی رہے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ اور امام احمد بن حنبل ؒ کے نزدیک وضو باقی نہیں رہے گا کسی نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ سے سوال کر دیا کہ آپ کا عقیدہ ہے کہ خون بہہ نکلے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اگر کسی کا خون بہہ نکلا اس نے صاف کر دیا لیکن دوبارہ وضو نہیں کیا تو آپ ایسے شخص کی اقتداء میں نماز پڑھیں گے؟

امام نے فرمایا کہ سید التابعین سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ یا امام العصر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نماز پڑھا رہے ہوں۔ اور میں ان کی امامت میں نماز ادا نہ کروں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ میرا مسئلہ میرے لیے ان کا ان کے لیے لیکن میں ان کی اقتداء میں نماز ضرور پڑھوں گا۔

امام مالک کا انکار:

امام مالک رحمۃ اللہ کا حوالہ اوپر آیا ہے اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جب آپ نے چالیس سال کی محنت سے موطا جیسی گراں قدر کتاب تالیف فرمائی جس میں اہل حجاز کی قوی احادیث اور مستند اقوال اصحابہ و فتاویٰ تابعین جمع کر دیے اور اس کے بہترین فقہی ابواب قائم کیے تو خلیفۂ وقت نے جب اس کے چند نسخے نقل کرا کے دوسرے شہروں اور ملکوں میں بھیجنے کا ارادہ کیا تا کہ لوگ اس فقہ پر عمل کریں اور پیدا شدہ اختلافات ختم ہو جائیں تو سب سے پہلے امام مالک رحمۃ اللہ ہی نے اس خیال کی مخالفت فرمائی اور فرمایا۔

---

[1] جامعی صاحب نے یہاں پھر امام صاحب کی غلط ترجمانی فرمائی ہے، اتبع امام فی الصلواۃ کو تقلید مجتہد مخصوص میں بدلنے کا مغالطہ پیدا کیا ہے۔ معج

[2] اس عبارت میں بھی شیخ الاسلام نے لفظ یتبع امامہ استعمال کیا ہے پھر آگے فیہ الجتہاد کہ کر اشارہ کیا ہے ان مقامات پر قنوت کی ادائیگی اور عدم ادائیگی پر فقہا نے اجتہاد کیا ہے، حیران کن بات ہے کہ سید صاحب دوسروں پر تصرف لفظی کرنے کا اشارہ کرتے ہیں جیسے شبلی کی ایک عبارت پر انھوں نے کیا، یہاں باوجود امت کا اتحاد انکے پیش نظر ہے، اور وہ فقہ میں اختلاف کی عدم اہمیت کی طرف اپنا رجحان ظاہر کر رہے ہیں، اور پھر ایسے متنازعہ الفاظ کو بروئے کار لا رہے ہیں جہاں اختلاف کے ساتھ ساتھ معنی مفہوم میں تصرف و نزاع پیدا ہو رہا ہے۔ معج

۔ امام ابن تیمیہ ؒ و ابن قیم نے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے، میں بس دو جملے نقل کرتا ہوں: ایک جگہ لکھتے ہیں کہ صرف نبیؐ کا اتباع کرنا اور کسی کا تباع نہیں کرنا چاہیے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ مجتہد کو بس شرعی دلیل کا اتباع کرنا ضروری ہے، اور شرک کے جائز ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور شیخ کی کل بحثوں میں شرک کو سرے سے اہمیت ہی نہین دی گئی ہے، اور اسکے یا بدعات کے سبب عقیدہ کی خرابی اور دین کی خرابی سے وہ پہلو بچاتے ہیں۔
، فقہ الاحکام من فتاوی شیخ الاسلام مکتبہ اسلامیہ۔ لاہور صہ: ۲۷۸، ۶۱

"امیر المومنین! آپ ایسا نہ کریں لوگوں تک بہت سی باتیں اور احادیث و روایات پہنچ چکی ہیں اور ہر جگہ کے لوگ ان میں سے کچھ کو اپنا چکے ہیں۔ جس سے خود ہی فقہی اختلاف رونما ہو چکا ہے اور اب اس اقدام سے مزید اختلافات پیدا ہو جائیں گے اس لیے انھوں نے اپنے لیے جو اختیار کر لیا ہے اسی پر انہیں آپ چھوڑ دیں اور ایسا ہی ہوا کسی ایک فقہ کو تمام امت پر مسلط کرنے کی یہ تجویز امام مالک رحمۃ اللہ کے مشورہ پر خلیفہ وقت نے خود ہی رد کر دی۔

[اسلام میں اختلاف کے اصول و آداب مصنف ڈاکٹر طٰہٰ جابر فیاض العلوانی مترجم ایم اختر ص ۱۰۸، ۱۰۹]

نمازوں میں اختلافات مسائل کی حقیقت :اہل حدیث مسلک

فقہی اختلافات کے سلسلہ میں مسلک اہلحدیث کے متبحر عالم حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ فروعی اختلافات کی حقیقت کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں۔

"یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے اگر تبدیلی ممکن نہیں تو پھر یہ اختلاف کیسے ظہور پذیر ہوا۔ جو آج ہم دیکھتے ہیں مسلمان مختلف مکاتب فکر کے پیرو ہیں اسی نماز ہی کو دیکھ لیں اس میں کوئی آمین بالجہر کا قائل ہے تو کوئی آہستہ آمین کہنے پر مصر ہے کسی نے حالت نماز میں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے ہیں کسی نے زیر ناف ہاتھ باندھنا ضروری قرار دے رکھا ہے اور کسی نے سرے سے باندھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کچھ ایسے ہیں کہ رفع الیدین کرتے ہیں اور کچھ دوسرے نہیں کرتے۔

نماز میں ہاتھ باندھنا فرض نہیں:

اس کا جواب یہ ہے کہ سارے کام فعلی ہیں اور سنت سے ثابت ہیں باہمی فقہی اختلافات کے باوجود کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ نماز میں ہاتھ باندھنا فرض ہے اور پھر سنت بھی اس قسم کی ہے کہ اس کے ترک سے نماز ہو جاتی ہے۔ انور شاہ صاحب نے بھی اسے تسلیم کیا ہے اسی طرح اذان اقامت کے مسائل ہیں ان تمام مسائل میں اختلاف جواز کا نہیں بلکہ اختیار کا ہے۔ اور دونوں طرح جائز ہے۔ کوئی اس طرح کرے اور کوئی اس طرح کرے"۔

[بحوالہ ص ۸۱ درس صحیح بخاری۔ مرتبہ منیر احمد السلفی۔ طبع اول ۱۹۹۲ء اسلامک پبلشنگ ہاؤس لاہور]

کیا احناف کافر ہیں: مولانا ثناءاللہ امرتسری کا جواب:

مناظر اسلام مولانا ثناءاللہ امرتسری رحمۃ اللہ سے کسی نے پوچھا "کیا آپ مقلدین مذاہب اربعہ کو عموماً اور حنفیہ کو خصوصاً کافر کہتے ہیں اور دائرہ اسلام سے خارج جانتے ہیں اور کیا ان کے کفر کے متعلق آپ نے کوئی تحریر بھی شائع کی ہے" مولانا نے جواب میں لکھا مجھے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے شرم آتی ہے کہ یہ سوال مجھ جیسے شخص سے کیوں پوچھا گیا جس نے کبھی کسی کے فتوے کفر پر دستخط نہیں کیے۔ کیونکہ میرا اس باب میں وہی

مسلک ہے جو امام المحتاطین امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا ہے۔

لا نکفر اهل القبلة [فتاوی ثنائیہ جلد اول، ص ۳۶۳]

اعلیٰ حضرت احمد رضا بریلوی کا مسلک:[١]

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلویؒ اپنی کتاب تمہید الایمان کے صفحہ ۸۰ طبع اول پر یوں رقم طراز ہیں:

"ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ سلم نے اہل لا الہ الا اللہ کی تکفیر سے منع فرمایا ہے جب تک وجہ کفر آفتاب سے زیادہ روشن نہ ہو جائے اور کلمۂ اسلام کے لیے اصلاً کوئی ضعیف سا ضعیف محمل بھی باقی نہ رہے"۔

فان الاسلام یعلو ولا یعلی

[بحوالہ کتاب انکشاف حق مصنفہ مفتی محمد خلیل احمد خاں برکاتی قادری بدایونی ص ۸۶]

مشہور حنفی عالم مُلا علی قاریؒ شرح شفا جلد ۲، ص ۴۲۵ پر فرماتے ہیں کہ "مسلمین اہل تاویل اگر چہ وہ اپنی تاویل کتاب اللہ میں خطا پر ہوں پھر بھی ان کی تکفیر سے عند المحققین احتراز واجب ہے۔

[بحوالہ کتاب انکشاف حق مصنفہ مفتی محمد خلیل احمد خاں برکاتی، قادری، بدایونی ص ۸۳]

چند اور حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں۔

معتزلہ کے پیچھے نماز جائز ہے: معتزلہ مسلم ہیں

منہاج الطالبین کی شرح لکھتے ہوئے الشیخ محمد الخطیب الشربینی فرماتے ہیں۔

واوّل نصّ الشافعي بتكفير القائل بخلق القرآن بان المراد كفران النعمة لا الاخراج عن الملة قاله البيهقي وغيره من المحققين لاجماع السلف والخلف على الصلوة خلف المعتزلة ومناكحتهم وموارثتهم .

[مغنی المحتاج الی معرفۃ معانی الفاظ المنہاج ص ۱۳۵، ج ۴]

[شرح الشیخ محمد الخطیب الشربینی علی متن منہاج الطالبین للامام ابی زکریا بن شرف النووی۔ دار الفکر]

ترجمہ: امام شافعی رحمۃ اللہ کے اس قول میں کہ "قرآن کو مخلوق کہنے والا کافر ہے"۔ کفر سے مراد کفران نعمت لی گئی ہے نہ کہ اسلام سے نکل جانا۔ [یعنی ایسا شخص مسلم ہے۔ مگر اس کی یہ بات غلط ہے] یہ امام بیہقی

---

[١] یہاں بھی خالد صاحب نے حسن نیت کے سبب احمد رضا صاحب کے ایک چاہنے والے کا حوالہ دے دیا ،حالانکہ احمد صاحب نے ،سید احمد شہید،شاہ اسمعیل شہید، احناف دیوبند اور اہل حدیث سب کو ایک قرار دے کر کافر قرار دیا بلکہ جو انکے کفر پر شرک کرے انکو کافر قرار تحریک پاکستان سے لیکر علما تک انکی نگاہ میں بڑی تعداد کفر کی مرتکب قرار پاتی ہے ،فتاوی رضویہ،احکام شریعت جیسی کتب میں بہت کچھ پڑھنے کو مل جائیگا:الکوکب الشہابیہ:صہ:۴۵۔۔عرفان شریعت:ج:۱:صہ:۲۴. فرماتے ہیں جو:انکے کفر و عذاب میں شک کرے وہ خود کافر:حسام الحرمین:صہ:۱۱۳۔سید احمد،رشید احمد،خلیل احمد،اشرف علی کے کفر میں جو شک کرے وہ خود کافر(احکام شریعت) حسام الحرمین:صہ:۴۳ (سید احمد خان)وہ تو ایک خبیث مرتد تھا. ملفوظات اعلی حضرت:ج:۳:صہ:۷۱.

رحمۃ اللہ اور دوسرے محققین نے لکھا ہے اور یہ تاویل اس وجہ سے کی گئی ہے کہ سلف وخلف کا اجماع ہے کہ معتزلہ کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے ان کے ساتھ رشتہ ناتہ کیا جا سکتا ہے وہ مسلمان کی میراث لیں گے اور مسلمان ان کا وارث ہوگا۔

پیر مہر علی شاہؒ: مسلم کون ہے؟

حضرت پیر مہر علی شاہؒ صاحب گولڑوی نے مسلمانوں کی تکفیر کے رد میں ایک رسالہ "اعلا ءکلمۃ اللہ" کے نام سے لکھا ہے اس رسالہ میں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"معلوم ہونا چاہیے کہ التزام کفر یہ ہے کہ ایک شخص نص کے مدلول کو نص کا مدلول سمجھتے ہوئے اور حکم شرعی کو حکم شرعی جانتے ہوئے انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے میں جانتا ہوں یہ شارع علیہ السلام کا حکم ہے لیکن میں اس کو قبول نہیں کرتا۔ لزوم کفر یہ ہے کہ جہالت اور نادانی کے باعث یا غلط تاویل کی وجہ سے اس پر کفر لازم آتا ہے پس التزام کفر سے انسان کافر ہو جاتا ہے لزوم کفر سے اس پر کفر کا فتویٰ عائد نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے فقہا نے کلماتِ کفر ذکر کرنے کے بعد متکلم کے جہل کو عذر شمار کیا ہے باقی جن فقہا نے یکفر لکھ دیا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے کفر والا کام کیا ہے نہ یہ کہ وہ کافر ہو گیا ہے۔ بحر الرائق میں موجود ہے کہ جامع الفصولین میں طحاوی نے ہمارے اصحاب حنفیہ سے روایت کی ہے کہ آدمی کو ایمان سے اس چیز کا انکار نکال سکتا ہے جس کے اقرار نے اس کو ایمان میں داخل کیا تھا۔

کافر کسے کہہ سکتے ہیں: پیر مہر علی شاہؒ:

مسلمان کے کلام کو جب تک اچھے محل پر حمل کرنا ممکن ہو یا اس کے کفر میں اختلاف ہو خواہ ضعیف روایت ہی سے کیوں نہ ہو کفر کا فتویٰ نہیں لگانا چاہیے یہاں کفر کے جو الفاظ ذکر کیے گئے ہیں ان کے تکلم سے فوراً کفر کا حکم لگانا درست نہیں میں نے اس بات کا اپنے نفس پر التزام کیا ہے کہ ان الفاظ سے کسی مسلمان کو کافر نہ کہوں گا۔ بحر الرائق میں لکھا ہے کہ حق یہ ہے جو کچھ مجتہدین سے ثابت ہے وہ حقیقت ہے اور ان کے سوا کسی دوسرے کے قول کی وجہ سے کفر کا فتویٰ دینا درست نہیں۔ اسی لیے "فتح القدیر" باب البغاۃ میں محقق ابن ہمام نے لکھا ہے کہ خوارج کے بارہ میں مجتہدین سے عدم تکفیر مذکور ہے باقی اکثر اہل مذہب کے کلام میں ان کی تکفیر مذکور ہے لیکن وہ مجتہدین میں سے نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کا کوئی اعتبار نہیں درالمختار باب المرتد میں لکھا ہے کہ کفر لغت میں چھپانے کو کہتے ہیں اور شرعاً ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کرنا جس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا ہے کفر کے الفاظ اہل فتوے نے نقل کیے ہیں میں نے بھی اس مسئلہ میں یک علیحدہ کتاب تالیف کی ہے لیکن میں اُن میں سے کسی لفظ سے بھی کفر کا فتویٰ دینا صحیح نہیں سمجھتا ہاں اس صورت میں جس میں تمام مشائخ کا اتفاق ہو۔ بحر الرائق نے بھی کہا ہے میں نے اپنے نفس پر یہ التزام کیا ہے کہ کسی مسلمان کو ان الفاظ سے کافر نہ کہوں گا۔

بعض اہل کلام محدثین اور فقہا اعمال کے لحاظ سے تو ہر گناہ گار کو کافر نہیں سمجھتے مگر اعتقادات بدعیہ کی وجہ سے کافر کہتے ہیں خواہ وہ اعتقاد رکھنے والا متاول ہی کیوں نہ ہو اور اس بارے میں مجتہد مخطی اور غیر مخطی میں بھی فرق نہیں کرتے بلکہ ہر بدعتی کو کافر کہتے ہیں یہ قول بھی خوارج اور معتزلہ کے قریب قریب ہے۔ اہل بدعت اور اہل سنت میں یہی فرق ہے کہ اول الذکر ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں اور موخر الذکر غلط اعتقاد والے کو خطا کی طرف نسبت کرتے ہیں کافر نہیں کہتے۔

علماء کو چاہیے کہ اپنی تمام تر توجہ اور سعی کسب اقتضائے **کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر** امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں صرف فرمائیں۔ نہ یہ کہ عوام کالانعام کے کافر بنانے میں ہی پورے جوش کا اظہار کرتے پھریں سراج المنیر میں ہے کہ اگر ایک مسلہ میں بہت سے وجوہ کفر کے مقتضی ہیں اور صرف ایک وجہ کفر کو منع کرتی ہے تو مفتی کو مسلمان پر حسن ظن رکھتے ہوئے اسی ایک وجہ کی طرف میلان کرنا چاہیے۔

حضرت گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے حوالے سے پیر زادہ محمد بہاؤالحق قاسمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ میں اکثر نماز عصر کے وقت حضرت گولڑوی رحمۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ ایک روز حضرت کے مصاحب خاص مولانا محبوب عالم صاحب مرحوم نے میری طرف اشارہ کر کے حضرتؒ سے کہا: "اب کے تمام جماعتوں نے ان کے پیچھے نماز عیدادا کی ہے"۔ تو حضرت گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے مخاطب کر کے پنجابی زبان میں فرمایا: "تسیں تے جامع المفرقین نکلے" میرے لیے یہ وہ اعزاز ہے جس پر میں جس قدر فخر کروں کم ہے۔ [رسالہ اسوہ اکابر ص ۳]

اہل بدعت کی اقتداء جائز ہے: حضرت مولانا اسماعیل سلفیؒ ۱

مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں:

اہل تحقیق کو امام بخاریؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی طرح وسیع الصدر ہونا چاہیے اور اقتداء کے معاملہ میں اہل بدعت کو بھی بالکل نظر انداز نہیں کرنا چاہیے ملاحظہ ہو فتاویٰ ابن تیمیہ مطبوعہ اہل نجد جدید ص ۴ے فتاویٰ سلفیہ مولانا محمد اسماعیل السلفی اسلامک پبلشنگ ہاؤس ۲، شیش محل روڈ نزد داتا دربار لاہور۔]

بدعتی کے پیچھے نماز پڑھو: حضرت حسن بصریؒ

وقال الحسن صل خلفه وعليه بدعته ۔ باب امامۃ المفتون والمبتدع صحیح بخاری مع فتح الباری ج ۲، ص ۱۸

قولہ والمبتدع ای من اعتقد شیئا مما یخالف اہل السنۃ والجماعۃ قولہ [وقال الحسن صل وعلیہ بدعتہ] وصلہ سعید بن منصور۔

بدعتی کے پیچھے نماز نا ہونا کثیر اہل حدیث اور امام مالک،حنبلؒ کا موقف ہے، باقی خوارج،و معتزلہ پر کفر و شرک اور ان سے متعلقہ مباحث کی گمراہی ویسی نہیں تھی جیسی آج ہے ،ان سب کو فلسفیا نہ موشگافیوں نے تباہ حال کیا تھا،باقی بدعات اگر کفر و شرک کی بحث سے وابستہ ہیں تو ان پر یہود و نصاری کے اعتقاد پر قیاس کیا جایگا،جیسا کہ قران و سنت مین انکی مذمت اور انکی پیروی سے پرہیز کا کہا گیا،ہے بقول رسول اللہ :کل بدعتہ ضلالتہ۔بدعتی کا ہر عمل مردود ہوگا۔باقی بدعت کس قسم کی اور انکا اعتقاد سے کیا تعلق ہے ،اسکا بھی فرق پڑتا ہے،بارہ ربیع اول مناتا ثابت نہیں مگر،یہ اعتقادی بدعت نہیں لہذا اسکا قایل امام اگر باقی سب مین درست ہو اسکے پیچھے نماز درست ہوگی،وسیلہ کے مسایل مین خرابیاں ہیں مگر عین کفر نہیں اسکے مداح کےصرف اس موقف پر اسکے پیچھے نماز نا پڑھنے پر تنقید ممکن ہے ،مگر شرک فی الذات،صفات،ربوبیت و عبودیت کی تاویل و بد عقدیگی توحید کی مخالفت کے سبب اسے اتبع کا اہل نہیں بنا سکتی ہے۔

مولانا اسمعیلؒ جنکا حوالہ دیا گیا کہتے ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے لا یقبل اللہ صاحب بدعۃ صرفاً ولا عدلاً یعنی بدعتی کے فرض اور نفل دونوں اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا ۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ ایک غیر مقبول نماز کی امامت سے ہمیں کیا حاصل ہے؟ اس لیے آپ اگر اہل تعزیہ کی اقتداء نہیں فرماتے تو اطمینان رکھیے کہ یہاں سے بھی کوئی پیغام بھیجنے کی کوشش نہیں کی جائے گی **فتاوی سلفیہ:دھلی:۱۱۶،۱۱۷۔خضری بک: تاریخ فقہ اسلامی:دارالشاعت کراچی۔امام مالک۔**

ترجمہ: "تو بدعتی کے پیچھے نماز پڑھ اس کی بدعت کا وبال اس کی گردن پر ہے"۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ بدعتی وہ ہے جو اہل السنۃ والجماعت کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے۔

اہل سنت کے مخالف عقیدہ والے کے پیچھے بھی نماز پڑھیے:

امام حسن بصری رحمۃ اللہ[1] کے اس قول کو سعید بن منصور نے ابن المبارک کی روایت سے ہشام بن حسان سے بیان کیا ہے کہ حسن بصری نے فرمایا بدعتی کے پیچھے نماز پڑھ کر اس کی بدعت کا گناہ اس کی گردن پر ہے"۔ [بدعتی وہ ہے جو اہل السنۃ والجماعت کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے، اس اصول کے تحت جملہ اہل سنت غیر اہل سنت کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں ان کی نماز باطل نہیں ہے، یہ وحدت امت کے لیے ضروری ہے۔]

حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

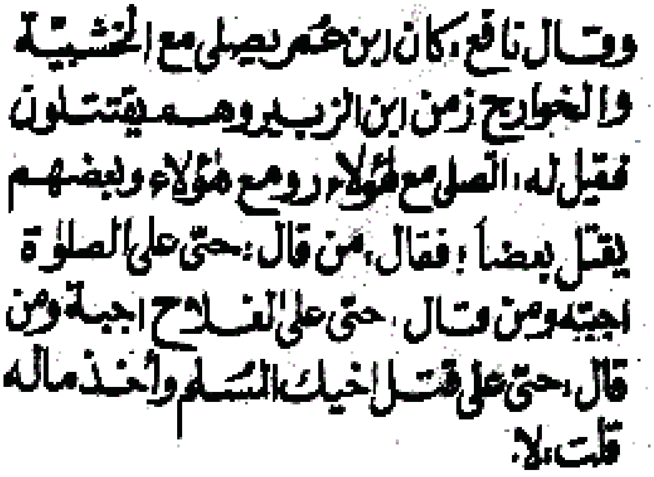

وقال نافع: كان ابن عمر يصلي مع الخشبية
والخوارج زمن ابن الزبير وهم يقتتلون
فقيل له: اتصلي مع هؤلاء ومع هؤلاء وبعضهم
يقتل بعضاً؟ فقال: من قال: حيّ على الصلوٰة
اجبته ومن قال: حيّ على الفلاح اجبته ومن
قال: حيّ على قتل اخيك المسلم وأخذ ماله
قلت: لا.

[رواه سعید ص ۱۸۶، ج ۲، المغنی لابی محمد عبداللہ بن احمد بن قدامۃ الریاض الحدیثہ]

ابن عمرؓ خارجیوں کی اقتداء درست سمجھتے تھے:[2]

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں خارجیوں کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے۔ جب کہ ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کی خارجیوں کے ساتھ جنگ ہو رہی تھی آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ ابن الزبیر رضی اللہ عنہ اور خوارج دونوں کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی آپس میں جنگ ہے آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو حی علی الصلوۃ کہے گا میں اس کی آواز پر لبیک کہوں گا جو بھی حی علی الفلاح کہے گا میں اس کے ساتھ آواز ملاؤں گا۔ لیکن جو کسی مسلمان بھائی کو قتل کرنے اور اس کا مال لوٹنے کے لیے پکارے گا میں اس کی بات نہیں مانوں گا۔ [واضح رہے کہ خارجیوں نے پوری مسلم امت کو کافر کہا کیونکہ امت کی قیادت حضرت علیؓ و حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں تھی اور خارجی دونوں اصحاب کو کافر کہتے تھے۔]

---

[1] قول تابعی: کے رد و قبول میں ہم حق رکھتے ہیں، کیونکہ وہ ہمارے جیسے انسان تھے: امام ابو حنیفہؒ

[2] سلف کا بڑا طبقہ خوارج کی اقتدا میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا۔

بدعتی کے پیچھے نماز پڑھ کر لوٹانے والا بدعتی ہے: احمد بن حنبلؒ[1]

جمعہ اور عید کی نمازیں ہر ایک نیک و بد کے پیچھے پڑھی جائیں گی۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ یہ نمازیں معتزلہ کے پیچھے پڑھ لیتے تھے یہی عمل ان کے زمانے کے دوسرے علما کا تھا حوالہ متعلقہ حسب ذیل ہے۔

(فاما الجمع والاعياد فانها تصلی خلف کل بر وفاجر وقد کان احمد یشھدها مع المعتزلة و کذلك العلماء الذین فی عصره.

[ص ۱۸۹، ج ۲، المغنی]

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جو شخص جمعہ کی نماز کسی کے پیچھے پڑھنے کے بعد دوبارہ پڑھے گا وہ بدعتی ہے اس روایت سے ظاہر ہے کہ فاسق یا بدعتی کے پیچھے جمعہ یا عید کی نماز پڑھنے کے بعد اسکا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ اصلی عبارت حوالہ متعلقہ کی یوں ہے۔

،وروی عنه انه قال، من اعادها فهو مبتدع وهذا یدل بعمومه علی انها لا تعاد خلف فاسق ولا مبتدع.

[ص ۱۸۹، المغنی]

ابن عمر حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے:

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے معمول کے متعلق روایت ہے۔

وکان ابن عمر یصلی خلف الحجاج ونجدة، احدهما خارجی، والثانی افسق البریة. وکان ابن عمر یقول: الصلوة حسنة ما ابالی من شرکنی فیها.

[ص ۲۱۳، ج ۳، المحلی لابی محمد علی بن احمد بن سعید بن حزمؒ]

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہ حجاج اور نجدہ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے ان میں سے ایک بدترین خلائق تھا اور دوسرا خارجی۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے اس سے کیا غرض کہ میرے ساتھ کون شریک نماز ہے۔

مختار کذاب کے پیچھے نماز جائز ہے:

عبدالرزاق رحمۃ اللہ نے سفیان ثوری رحمۃ اللہ سے انھوں نے عقبہ رحمۃ اللہ سے روایت کیا ہے:

---

[1] سعودیہ میں فقہ حنبلی کے مشہور امام اور فتوی کمیٹی کے رکن شیخ العثیمین نے اہل بدعات کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ۱: جنکی بدعتیں کفر تک پہنچانے والی ہوں ۲: جنکی کفر تک نا پہنچانے والی ہوں: اول الذکر کے پیچھے انکے فتوے کی رو سے نماز نہیں ہوتی ہے: فتاوی اسلامیہ: دار السلام: ج: ۱: صہ: ۳۸۹۔

– سید جی کے زیادہ تر حوالے یا تو اقوال تابعین ہیں یا پھر ثابت شدہ صحابہ کرام کے منقطع اقوال ہیں مگر اتنا طے ہیں کہ سلف میں چونکہ کفر و شرک نا ہونے کے برابر تھا، بدعات تباہ کن نہیں تھیں، فرقہ جات موجود نہیں تھے جبھی اقتدا نماز میں اتبع عام تھا، لہذا انکا اتنا مقدمہ بلکل درست ہے۔ معج

وعن عبد الرزاق عن سفیان الثوری عن عقبة
عن ابی وائل، انہ کان یجمع مع المختار الکذاب۔
وعن ابی الاشعث (۱) قال، ظهرت الخوارج علینا
فسألت یحیی بن ابی کثیر فقلت یا ابا نصر کیف
تری فی الصلوٰۃ خلف هؤلاء، قال القرآن امامك
صل معهم ما صلوها

[بحوالہ کتاب المحلی ص ۲۱۴، ج ۴]

ترجمہ: ابووائل رضی اللہ عنہ مختار کذاب کے پیچھے جمعہ پڑھتے تھے ابواشعث کی روایت ہے کہ خارجی ہم پر غالب آ گئے تو میں نے یحییٰ بن کثیر رحمۃ اللہ سے دریافت کیا اے ابونصر ان کے پیچھے نماز کے بارے میں کیا خیال ہے انھوں نے جواب دیا تیرا امام قرآن ہے تو ان کے پیچھے نماز پڑھ جب تک وہ نماز پڑھیں۔

حسن بصری کا قول ہے:

وعن الحسن، لا تضر المومن صلاته خلف
المنافق ولا تنفع المنافق صلاته خلف المومن۔

[ص ۲۱۴، ج ۴]

ترجمہ: مومن، منافق کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کی نماز کا کوئی نقصان نہیں اور منافق مومن کے پیچھے پڑھے تو اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

علی ابن حزم رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ما نعلم احدا من الصحابة رضی اللہ عنهم
امتنع من الصلاة خلف المختار وعبید اللہ بن زیاد
والحجاج ولا فاسق افسق من هؤلاء۔

[ص ۲۱۴، ج ۴]

ترجمہ: ہمارے علم میں کوئی صحابی بھی ایسا نہیں جس نے مختار، عبید اللہ بن زیاد اور حجاج کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کیا ہو حالاں کہ ان سے بڑھ کر کوئی فاسق نہیں۔

اہل قبلہ کے پیچھے نماز جائز ہے:

نزل الابرار من فقہ النبی المختار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہے:

فتجوز امامة الرافضي والخارجي والمعتزلي والمقلد

[ص ۷۴۲، ج ۱]

نزل الابرار من فقه النبي المختار صلى الله عليه وآله وسلم

ص ۹۷، ج ۱

رافضی، خارجی، معتزلی اور مقلد کی اقتداء میں نماز جائز ہے۔ مولانا وحید الزماں حیدر آبادی نزل الابرار میں لکھتے ہیں۔

وليعلم ان هناك فرقا بين الكافر والمكفر فمنا من كفر الروافض ومنا من كفر الخوارج فهم ليسوا بكافرين بل مكفرين بلسان البعض والكافر من كفره صريح ومتفق

[ص ۹۷، ج ۱]

ترجمہ: یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ کافر اور مکفر میں فرق ہے ہم میں سے بعض نے روافض کی تکفیر کی ہے اور بعض نے خوارج کی تو یہ کافر نہیں ہیں بلکہ بعض نے ان کی تکفیر کی ہے ان کی بعض باتوں کو کفریہ ٹھہرا ہے] کافر وہی ہوگا جس کا انکار صاف ہو اور اس کے کفر پر اتفاق ہو"۔

مولانا وحید الزمان رحمۃ اللہ اسی کتاب کے دوسرے مقامات پر لکھتے ہیں۔

ويصلى على الملك الظالم السافك للدماء عسى الله ان يغفر له وعلى العصاة من المسلمين ولو كانوا اصحاب الكبائر والبدعات كالرفضة والخوارج والمعتزلة والجهمية

[ص ۱۷۴، ج ۱]

ترجمہ: ظالم اور خوں ریز بادشاہ کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ شاید اللہ اس کو معاف فرما دے۔ گناہ گار مسلمانوں کا جنازہ بھی پڑھا جائے گا۔ اگر چہ وہ مرتکب کبیرہ ہوں یا بدعتی ہوں مثلاً روافض، خوارج و معتزلہ۔

اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں:

ويجوز مناكحة المعتزله والامامية والجهمية و اهل البدعات لانا لانكفر احدا من اهل القبلة۔

[ص۳۰، ج:۳]

یعنی "معتزلہ" امامیہ جہمیہ اور بدعتی لوگوں سے رشتہ ناتا جائز ہے کیونکہ ہم اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے۔

امام ابن تیمیہؒ کا فتویٰ: رافضی کے پیچھے نماز جائز ہے:

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ولهذا كان الصحابة يصلون خلف الحجاج والمختار بن ابي عبيد الثقفي وغيرهما الجمعة والجماعة. فتاوىٰ ابن تيمية.

[ص۳۴۷، ج:۲۳]

"صحابہ رضی اللہ عنہم حجاج اور مختار بن ابی عبید ثقفی کے پیچھے جمعہ اور جماعت کی دیگر نمازیں پڑھ لیتے تھے"۔

وانما تصح مثل هذه الصلوٰت خلف الائمة اهل البدع كالرافضة ونحوهم.

[فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۲۳، ص۳۵۵]

"جمعہ اور عیدین وغیرہ کی نمازیں اہل بدعت مثلاً رافضی اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے پیچھے پڑھی جائیں گی۔

بدعتی کے پیچھے جمعہ جائز ہے: ابن تیمیہؒ

واذا كان الامام مبتدعا فانه يصلى خلفه الجمعة وتسقط بذلك

[ص۳۶۱، ج:۲۳]

امام بدعتی ہو تو اس کے پیچھے جمعہ درست ہے اور وہ ادا ہو جائے گا۔ سطور بالا میں ہم نے مختلف فتاویٰ کو جمع کر دیا ہے۔ صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ وحدتِ امت کے لیے اکابرین نے کس طرح وسعت کا

ثبوت دیا فرقہ معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ پرانے فرقے ہیں جو موردِ عتاب اور محلِ غضب رہے ہیں۔ صاحب الدر المختار نے ان کی بابت سخت الفاظ لکھے۔ نماز کے مسائل بیان کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ بدعتی ہیں گیارہویں صدی ہجری میں دمشق کے علامہ محمد امین شامی نے ردالمختار لکھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد فقہ حنفی کی کوئی اور کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

ردالمختار: اہل قبلہ کے حقوق

علامہ صاحب نے اپنی شرح میں لکھا ہے کہ اکثر متکلمین اور فقہاء نے صاحب درمختار سے اختلاف کیا ہے۔ جن لوگوں پر تند و تیز حملے کیے گئے ہیں وہ بھٹکے ہوئے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کے پیچھے نماز بھی پڑھی جائے گی ان کا جنازہ بھی پڑھایا جائے گا اور ان کی مغفرت کے لیے دعا بھی کی جائے گی۔ مرنے کے بعد جائیداد کی تقسیم کے سلسلہ میں انہیں مسلمان شمار کیا جائے گا۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فتاویٰ میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ جہمیہ اور مرجیہ فرقوں کے لوگوں سے خلق قرآن کے عقیدہ کے بارے میں مناظرے کرتے رہے ان کے عقائد کی تردید میں کتابیں لکھیں ان کے عقائد کو کفریہ کہا لیکن اُن کے مرنے کے بعد ان کی بخشش کے لیے دعا کرتے۔

امام حنبل جہمیہ مرجیہ[1] کے لیے دعائے مغفرت کرتے تھے:

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

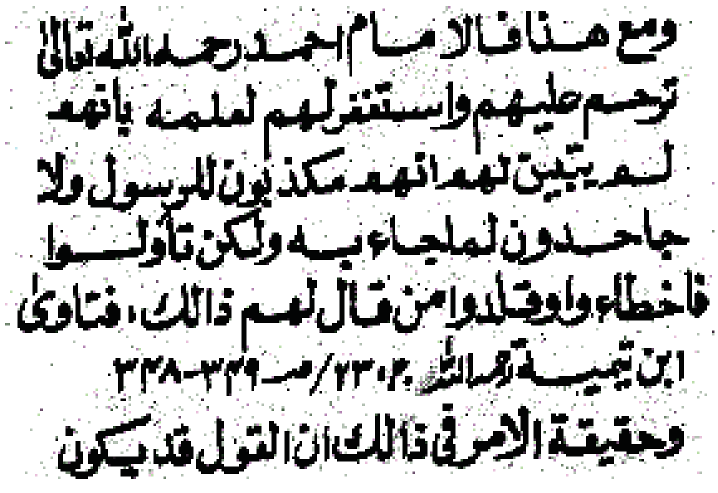

ومع هذا فالامام احمد رحمه الله تعالى ترحم عليهم واستغفر لهم لعلمه بانهم لم يتبين لهم انهم مكذبون للرسول ولا جاحدون لما جاء به ولكن تاولوا فاخطاوا وقلدوا من قال لهم ذالك، فتاوى ابن تيمية رحمه الله ج۲۳/ص۳۴۹-۳۴۸

وحقيقة الامر في ذالك ان القول قد يكون

---

[1] یہ دونوں مرجئی و جہمیہ(صفوانی) فلسفیانہ نظریات سے متاثر تھے اور محدثین کے گروہ کے نزدیک معطون تھے ،جبکہ امام احمد اور اکثر آیمہ فقہ چونکہ فقہ اور حدیث دونوں کے جامع اور منہج استدلال کے عمل کار تھے لہذا ان دونوں میں کفر و شرک کی جگہ بد عقیدگی کے فلسفیانہ اساس کے سبب انکی مغفرت کی گئی باقی امام احمد اور اکثر آیمہ سے منسوب اکثر اقوال و اسناد مجروح ہیں تاوقتیکہ انکی تعدیل و اسناد ثابت نا ہوجائیں۔معج

كفراً فيطلق القول بتكفيره ويقال من قال كذا فهو كافر لكن الشخص المعين الذي قاله لا يحكم بكفره حتى تقوم عليه الحجة التي يكفر تاركها ٢٣/٣٤٦ وهكذا الأقوال التي يكفر قائلها قد يكون الرجل لم تبلغه النصوص الموجبة لمعرفة الحق وقد تكون عنده ولم تثبت عنده أو لم يتمكن من فهمها وقد يكون عرضت له شبهات يعذره الله بها فمن كان من المؤمنين مجتهداً في طلب الحق وأخطأ فإن الله يغفر له خطأه كائناً ما كان سواء كان في المسائل النظرية أو العملية هذا الذي عليه أصحاب النبي صلى الله عليه وآله وسلم وجماهير أئمة الإسلام وما قسموا المسائل إلى مسائل أصول يكفر بإنكارها ومسائل فروع لا يكفر بإنكارها.

[ج٢٣، ص٣٤٦]

امام صاحب فرماتے ہیں کہ ہماری نظر میں ان کی باتیں کفریہ ہیں مگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ یہ باتیں دین کے خلاف ہیں تاہم انھوں نے تحقیق کے بعد جو کچھ سمجھا کہہ دیا حالاں کہ وہ نہ نبی کے منکر تھے اور نہ دین کے شاید اللہ ان کا عذر قبول کر لے اللہ کے ہاں رحمت کی کمی نہیں ہے اگر کوئی سمجھتا ہے کہ وہ کسی کو روکنے کے لیے جنت کے دروازے پر کھڑا ہو جائے گا تو یہ اس کی نادانی ہے کیوں کہ رسول اللہ کے کسی امتی کے لیے جنت کے دروازے بند نہیں ہوتے۔

امام ابن تیمیہ شیعہ حضرات کو کافر نہیں کہتے:

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ نے شیعیت کے رد میں ایک کتاب تحریر کی ہے اس کا نام منہاج السنۃ النبویۃ فی نقض کلام الشیعۃ والقدریۃ ہے اس کتاب کے بارے میں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ عرب دنیا میں اس موضوع پر یہ پہلی اہم کتاب ہے۔ اس کے بعد ابن الخطیب کی کتاب ہے اور سب سے اہم کتاب اس موضوع پر موسیٰ جار اللہ کی الوشیعہ ہے اس موضوع پر زیادہ علمی و تحقیقی کام ہندوستان میں ہوا کیونکہ یہاں اہل تشیع کی تمام کتابیں دستیاب تھیں۔

١۔ اس موضوع پر امام صاحب سے صدیوں قبل بھی بہت کچھ تفصیل سے لکھا گیا تھا، روافض کے اعتراضوں پر قاضی ابو بکر ابن العربی: کی العواصم من القواسم اسکے علاوہ تلبیس ابلیس: ابن جوزی اور الملل و النحل از ابن حزمؒ جیسی لاتعداد کتب موجود ہیں، مگر باقاعدہ بلتفصیل فلسفیانہ، محدثانہ، مفسرانہ و کلامی تفصیل میں منہاج السنتہ سب کی سرتاج کتاب اختصار میں سمجھو یہ العواصم کی شرح ہے، مگر العواصم صرف طعن کے جواب میں ایک محدثانہ و مورخانہ جواب ہے، باقی اس موضوع پر ہزاروں لاتعداد کتب لکھی گئی ہے۔ معج

امام صاحب جب بحث کے دوران اس بات پر پہنچے کہ خوارج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ سب کو کافر کہتے ہیں جبکہ شیعہ ان دونوں کو بھی کافر سمجھتے ہیں۔ باوجود رد کرنے کے امام صاحب نے پوری فصل لکھی جس میں فرمایا:

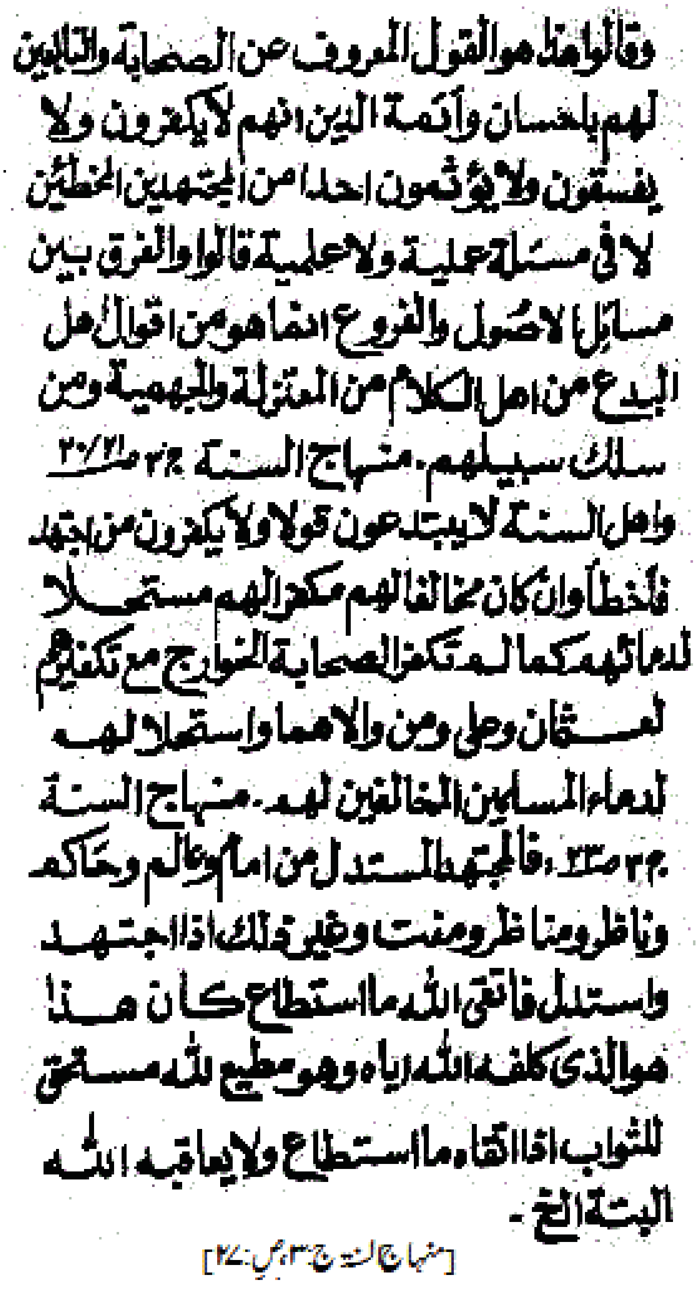

وقالوا هذا هو القول المعروف عن الصحابة والتابعين لهم بإحسان وأئمة الدين انهم لا يكفرون ولا يفسقون ولا يؤثمون احدا من المجتهدين المخطئين لا في مسئلة علمية ولا عملية قالوا والفرق بين مسائل الاصول والفروع انما هو من اقوال اهل البدع من اهل الكلام من المعتزلة والجهمية ومن سلك سبيلهم. منهاج السنة ج۳ ص ۲۰/۲۱

وأهل السنة لا يبتدعون قولا ولا يكفرون من اجتهد فأخطأ وان كان مخالفا لهم مكفرا لهم مستحلا لدمائهم كما لم تكفر الصحابة الخوارج مع تكفيرهم لعثمان وعلي ومن والاهما واستحلالهم لدماء المسلمين المخالفين لهم. منهاج السنة ج۳ ص۲۳، فالمجتهد المستدل من امام وعالم وحاكم وناظر ومناظر ومفت وغير ذلك اذا اجتهد واستدل فاتقى الله ما استطاع كان هذا هو الذي كلفه الله اياه وهو مطيع لله مستحق للثواب اذا اتقاه ما استطاع ولا يعاقبه الله البتة الخ۔

[منہاج السنہ ج ۳، ص: ۲۷]

”مسئلہ اصول کا ہو یا فروع کا فقہ کا ہو خواہ عقائد کا اگر کسی نے مسئلہ کو سمجھنے کی جدوجہد کی تو گویا اس نے دین کو سمجھنے کی سعی کی لہٰذا وہ بھی اجر و ثواب کا مستحق ٹھہرے گا خواہ وہ خارجی ہو یا شیعہ ان میں نہ کوئی کافر ہے نہ مرتد۔

صاحب فواتح الرحموت: کافر کون ہے؟

علامہ عبد العلی اصول فقہ حنفی کی کتاب مسلم الثبوت کی شرح فواتح الرحموت میں لکھتے ہیں:

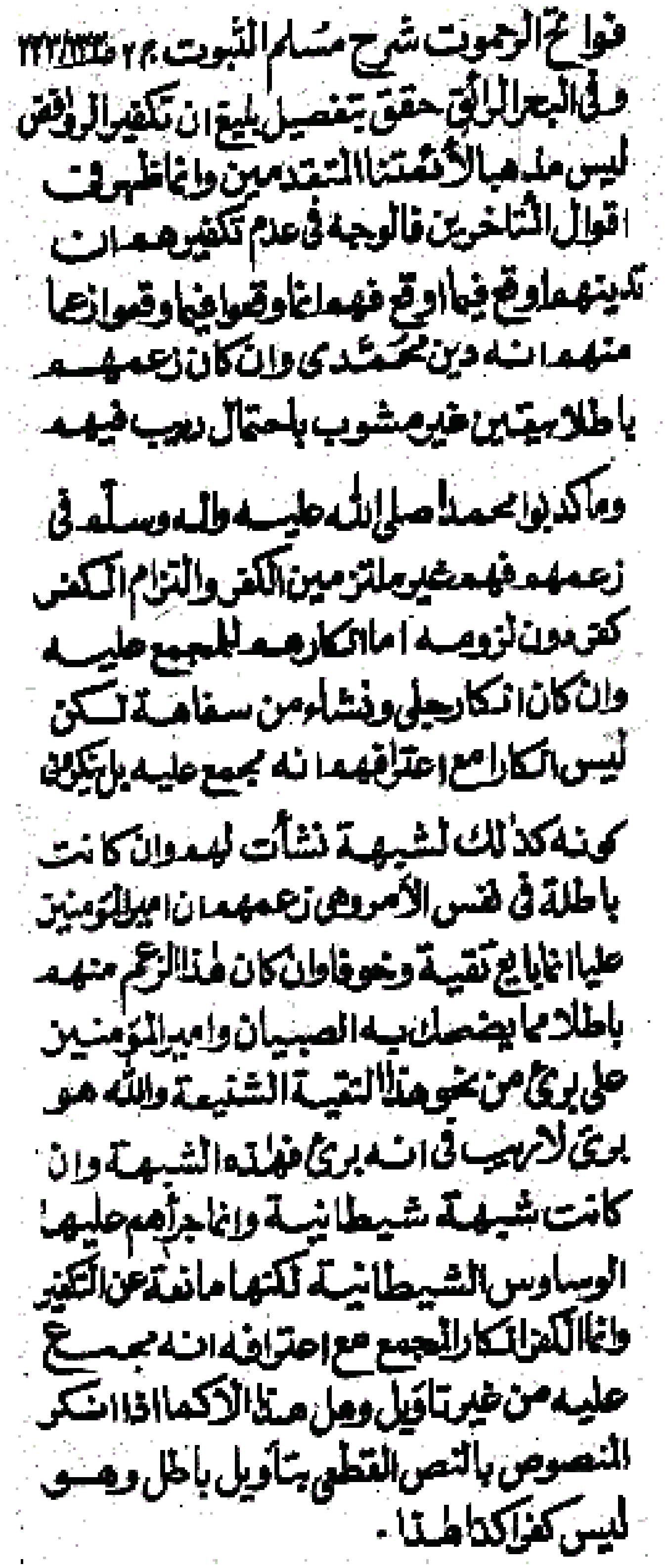

فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ج۲ ص۲۲۲/۲۲۳

وفی البحر الرائق حقق بتفصیل بلیغ ان تکفیر الروافض
لیس مذهبا لأئمتنا المتقدمین وانما ظهر فی
اقوال المتأخرین فالوجه فی عدم تکفیرهما ان
تدینهما وقع فیما اوقع فهمهما وقصوا فیها وقصوا زعما
منهما انه دین محمدی وان کان زعمهم
باطلا بیقین غیر مشوب باحتمال ریب فیهم
وما کذبوا محمدا صلی الله علیه واله وسلم فی
زعمهم فهم غیر ملتزمین الکفر والتزام الکفر
کفر دون لزومه اما انکارهم للمجمع علیه
وان کان انکارا جلیا ونشأ من سفاهة لکن
لیس انکارا مع اعترافهما انه مجمع علیه بل انکروا
کونه کذلك لشبهة نشأت لهم وان کانت
باطلة فی نفس الأمر وهی زعمهما ان امیر المؤمنین
علیا انما بایع تقیة وخوفا وان کان هذا الزعم منهم
باطلا مما یضحك به الصبیان وامیر المؤمنین
علی بری من نحو هذا التقیة الشنیعة والله هو
بری لا ریب فی انه بری فهذه الشبهة وان
کانت شبهة شیطانیة وانما جرأهم علیها
الوساوس الشیطانیة لکنها مانعة عن التکفیر
وانما الکفر انکار المجمع مع اعترافه انه مجمع
علیه من غیر تأویل ومن هذا الا کما اذا انکر
المنصوص بالنص القطعی بتأویل باطل وهو
لیس کفرا کذا هذا ۔

فرماتے ہیں کہ کوئی حدیث کو درست تسلیم کرتا ہے مگر رسول اللہ کے بارہ میں کہتا ہے کہ معاذ اللہ وہ جھوٹے ہیں تو وہ کافر ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ میں نہیں مانتا کہ رسول اللہ نے واقعی ایسا فرمایا تھا تو وہ راوی یا روایت کو رد کر رہا ہوتا ہے۔ رسول اللہ کو نہیں۔ ہاں اگر رسول اللہ موجود ہوں اور کوئی یہ بات کہے کہ میں نہیں مانتا تو وہ کافر ہے چونکہ بہت سی روایات کمزور اور ضعیف ہیں لہٰذا ان کو رد کرنے والا کافر نہیں ٹھہرے گا۔ ہم خود بعض فرقوں کی بیان کردہ حدیثوں کی صحت کا انکار کرتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی حدیث کی صحت کے بارے میں شبہ کا اظہار کرنے پر کوئی کافر نہیں ہوتا۔ جب تک وہ دیدہ دلیری سے یہ نہ کہہ دے کہ ہاں میں مانتا ہوں کہ قرآن میں یہ لکھا ہے لیکن میں نہیں مانتا یا حدیث کے بارے میں ایسے الفاظ ادا کرے لیکن اگر کوئی حدیث کی صحت کے بارہ میں شک کرتا ہے یا کوئی شخص کسی آیت کے مفہوم کے بارے میں اختلاف کرتا ہے تو اس کی تصحیح کرنا اور سمجھانا بہتر ہوگا نہ کہ اسے دائرہ اسلام سے ہی خارج کر دیا جائے۔

امام غزالیؒ کا کارنامہ: التفرقہ بین الاسلام والزندقہ

امام غزالی رحمۃ اللہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں وہ فلسفی، دانشور اور علم کلام کے ماہر کے طور پر معروف ہیں ان کی کتاب احیاء علوم الدین اہل علم میں بے حد مقبول ہے۔ امام صاحب کے دور میں بھی تکفیر کا طوفان برپا تھا آج کی طرح اس وقت بھی بات بات پر کفر کے فتوے صادر ہوتے تھے مخالفین کا جینا دوبھر تھا یہاں تک کہ ایک معتزلی عالم ۲۵ سال تک اپنے گھر سے نہ نکل سکے۔ ایسے وقت میں امام صاحب نے نعرۂ حق بلند کیا اور مشہور رسالہ "التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" تحریر کیا۔ نو سو سال پہلے لکھی جانے والی اس موضوع پر یہ پہلی تحریر ہے۔

اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کر سکتے:

امام غزالی رحمۃ اللہ کی اس علمی و اصلاحی کوشش کی اگرچہ ابتداء میں بہت مخالفت ہوئی۔ لیکن بالآخر یہ علم کلام کا مسئلہ بن گیا کہ اہل قبلہ جس قدر ہیں سب مسلمان ہیں چنانچہ علم کلام کی تمام کتابوں کا خاتمہ اسی مسئلہ پر ہوتا ہے۔ رسالہ التفرقہ بین الاسلام والزندقہ اس مسئلے پر نہایت اہمیت کا حامل رسالہ ہے۔

شاہ ولی اللہؒ: اختلافات کی حقیقت:

شاہ صاحب رحمۃ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ مذکورہ میں ایک باب بعنوان اسباب اختلاف الفقہاء قائم کیا ہے اس میں لکھتے ہیں

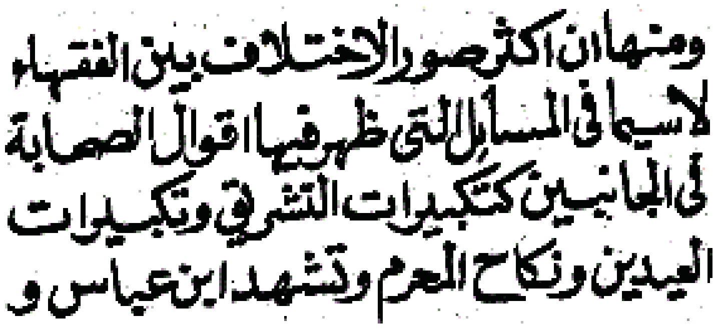

ومنها ان اكثر صور الاختلاف بين الفقهاء
لاسيما في المسائل التي ظهر فيها اقوال الصحابة
في الجانبين كتكبيرات التشريق وتكبيرات
العيدين ونكاح المحرم وتشهد ابن عباس و

حجۃ اللہ البالغہ جز اول ص ۱۵۹۔۱۵۸

ابن مسعود والاخفاء بالبسملة وبآمين والاشفاع
والايتار في الاقامة ونحو ذلك انما هو في
ترجيح احد القولين وكان السلف لا يختلفون
في اصل المشروعية وانما كان خلافهم في
اولى الامرين: وقد كان في الصحابة والتابعين
ومن بعدهم من يقرأ البسملة ومنهم من لا
يقرؤها ومنهم من يجهر بها ومنهم لا يجهر بها
وكان منهم من يقنت في الفجر ومنهم من لا
يقنت ومنهم من يتوضأ من الحجامة والرعاف
والقيئ ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومنهم
من يتوضأ عن مس الذكر ومس النساء بشهوة
ومنهم من لا يتوضأ من ذلك ومنهم من يتوضأ
مما مسته النار ومنهم من لا يتوضأ من ذلك
ومنهم من يتوضأ من اكل لحوم الابل ومنهم
من لا يتوضأ من ذلك ومع هذا كان بعضهم
يصلي خلف بعض مثل ما كان ابو حنيفة او اصحابه
والشافعي وغيرهم رضي الله عنهم يصلون
خلف ائمة المدينة من المالكية وغيرهم
وان كانوا لا يقرؤن البسملة لا سرا ولا جهرا و
صلى الرشيد اماما وقد احتجم فصلى الامام
ابو يوسف خلفه ولم يعد وكان افتاه الامام

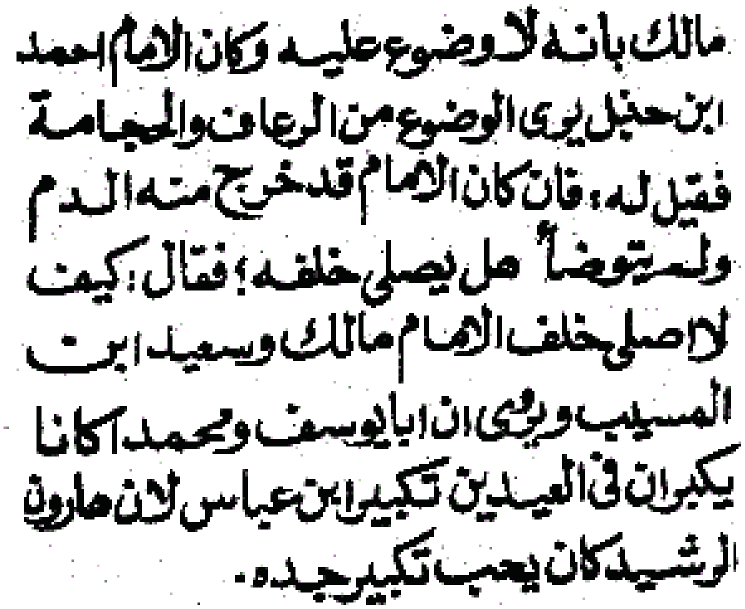

مالك بانه لا وضوء عليه وكان الامام احمد
ابن حنبل يرى الوضوء من الرعاف والحجامة
فقيل له، فان كان الامام قد خرج منه الدم
ولم يتوضأ هل يصلي خلفه؟ فقال: كيف
لا اصلي خلف الامام مالك وسعيد ابن
المسيب وروى ان ابا يوسف ومحمد اكانا
يكبران في العيدين تكبير ابن عباس لان هارون
الرشيد كان يحب تكبير جده.

[حجۃ اللہ البالغہ جلد نمبر ۲، ص ۱۵۸۔۱۵۹]

اس کے ذیل میں لکھتے ہیں مثلاً کوئی عید کی سات اور پانچ تکبیریں کہتا ہے کوئی حنفی تین بتاتا ہے کوئی وتروں میں قنوت پڑھتا ہے کوئی نہیں پڑھتا۔ کوئی بسم اللہ اونچی آواز سے کہتا ہے کوئی اونچی آواز سے نہیں کہتا وتر کوئی جوڑ کر پڑھتا ہے کوئی الگ۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ ان سب کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے زمانے سے یہ باتیں چلی آرہی ہیں اور کسی نے نہیں کہا کہ یہ جائز ہے اور یہ نا جائز ہے سارے گروہ متفق تھے کہ سب باتیں جائز ہیں۔ ایک عمل ٹھیک ہے لیکن یہ ذرا زیادہ اچھا ہے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ عمل کیا اس لیے زیادہ اچھا ہے وہ اختلاف ضرور کرتے تھے لیکن سلف میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ عمل سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ دونوں عمل موجود تھے ہم سات اور پانچ تکبیریں کہتے ہیں بسم اللہ اگر کوئی حنفی امام تین تکبیروں سے عید پڑھا دے تو دکھ کس بات کا جب کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی آسمان کے سورج کی طرح روشن روایت موجود ہے کہ جب وہ کوفہ میں حاکم تھے تو حنفیوں کی طرح تین تکبیروں سے عید پڑھاتے تھے ابن حزمؒ فرماتے ہیں جس طرح سورج میں کوئی شک نہیں اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔

قاضی ابو یوسف کا مسلک اور ہارون الرشید:

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں چیف جسٹس تھے۔ ہارون الرشید نے نماز پڑھائی اس دور میں خلیفہ نماز پڑھاتے تھے آج کل کی طرح نہیں کہ امامت بھی نہیں کراتے [نماز اس حالت میں پڑھائی کہ اس نے وضو کے بعد سینگیاں لگوائیں خون نکلوایا وضو نہیں کیا قاضی صاحب کے مطابق وضو ٹوٹ گیا تھا لیکن قاضی ابو یوسفؒ نے خلیفہ کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ اور بعد میں اسے دہرایا نہیں ہارون الرشید نے اس لیے ایسا کیا کہ امام مالکؒ نے یہ فتوی دے رکھا تھا کہ اس طرح وضو نہیں ٹوٹتا اس لیے

اس نے اس پر عمل کیا قاضی صاحب رحمۃ اللہ بھی چُپ رہے کہ ہمارے مسلک کے بارے میں کوئی وحی تو نازل نہیں ہوئی کہ ہمارا مسلک ہی درست ہے۔ دوسرا جو بہتر سمجھتا ہے اس پر عمل کرے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ اور امام محمد رحمۃ اللہ دونوں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے شاگرد تھے ان کا مسلک تھا کہ عیدین میں تین زائد تکبیریں ہیں۔ مگر جب نماز پڑھاتے تو سات اور پانچ تکبیریں کہتے کیونکہ خلیفہ عباسی تھا اور وہ اپنے دادا کے طریق کا پیرو کار تھا۔ اس لیے کہ ہارون الرشید کو اپنے دادا کا طریقہ پسند تھا اس پر ان دونوں اماموں نے کہا کہ فروعات میں الجھ کر امت کو تقسیم کرنے کا کیا فائدہ وحدت امت کو قائم رکھا جائے۔

کافر کون ہے: احادیث کی روشنی

مشکوٰۃ شریف میں صحیح ترین حدیث ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک بڑے عابد نے ایک خطا کار کے متعلق کہا کہ ”خدا کی قسم تو نہیں بخشا جائے گا اس خود بینی کی بنا پر اس کی تمام نیکیاں برباد ہو گئیں اور اسے دوزخ میں ٹھونس دیا گیا۔ اس شخص نے دوسرے کو دوزخ کی وعید دے کر خود دوزخ خرید لی ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو کافر کہتا ہے تو یقیناً ان میں سے ایک کافر ہوتا ہے۔ پہلی حدیث شریف مذکور کی اصل عبارت ذیل میں دی جارہی ہے۔

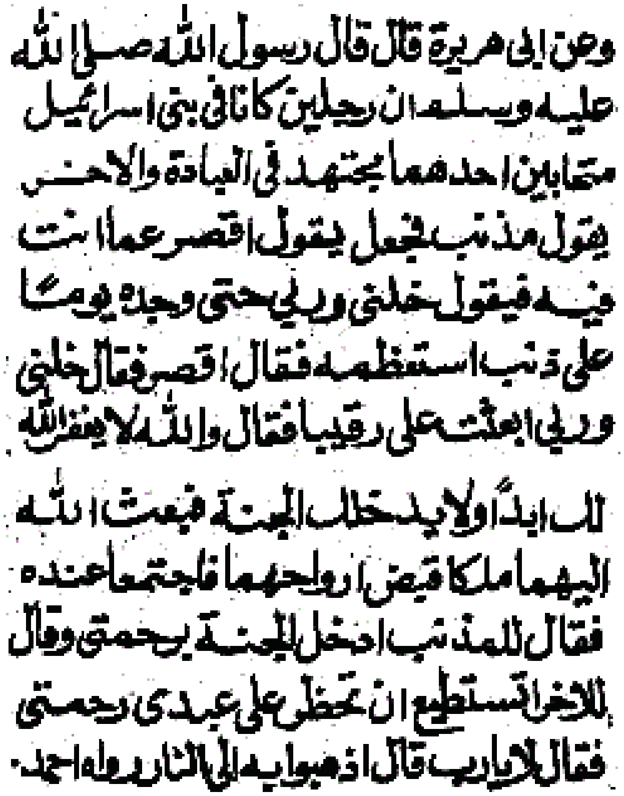

وعن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم ان رجلین کانا فی بنی اسرائیل
متحابین احدھما مجتھد فی العبادۃ والآخر
یقول مذنب فجعل یقول اقصر عما انت
فیہ فیقول خلنی وربی حتی وجدہ یوما
علی ذنب استعظمہ فقال اقصر فقال خلنی
وربی ابعثت علی رقیبا فقال واللہ لا یغفر اللہ
لک ابدا او لا یدخل الجنۃ فبعث اللہ
الیھما ملکا فقبض ارواحھما فاجتمعا عندہ
فقال للمذنب ادخل الجنۃ برحمتی وقال
للآخر اتستطیع ان تحظر علی عبدی رحمتی
فقال لا یا رب قال اذھبوا بہ الی النار رواہ احمد۔

عجیب و غریب حدیث کاش اثر کر سکے

فرمایا رسالت مآبؐ نے جب کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو کافر کہتا ہے تو ان میں سے ایک یقیناً کافر ہوتا ہے۔

حصہ دویم

وفاقی وزیر پیر نور الحق قادری، قبلہ ایاز اور کچھ علماء پریس کانفرنس میں عوام کو کورونا سے ڈراتے رہے۔ علماء کا کام لوگوں میں خدا کا یا خالق کا خوف پیدا کرنا ہے یا بے خوف عوام میں کورونا مخلوق کا خوف پیدا کرنا ہے۔

ان علماء نے سعودی عرب کے بارے میں کوئی فتویٰ نہیں دیا جہاں حرم مکہ اور حرم مدینہ بند ہیں ان کی بندش نص کی خلاف ورزی ہے۔ مساجد اللہ بھی بند نہیں کی جا سکتیں ان کی بندش نصوص کا انکار ہے۔ پاکستان کے تمام اہل حدیث علماء کا یہی موقف ہے۔ حیرت ہے کہ قبلہ ایاز صاحب پیر نور الحق قادری نے سعودی عرب سے حرمین اور مساجد کو فوراً کھولنے کا مطالبہ تک نہیں کیا یہ کیسے علماء ہیں؟

پیر نور الحق قادری اور قبلہ ایاز صاحب نے زندگی بھر سائنس کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا لہٰذا اب امت کو گمراہ کرنے سے پہلے سائنس پر دو چار کتابیں پڑھ لیں ۔ پھر بات کریں۔ مساجد بند کرنا حرام ہے یہ نص صریح سے ثابت ہے بند کرنے والا گناہ گار سے وہ توبہ کرے

قبلہ ایاز صاحب اپنا عقیدہ درست کریں اسلامی علمیت میں بیماری، موت، تقدیر اللہ کے حکم سے آتی ہے دوا علاج شفاء متبادل اصطلاحات نہیں لہٰذا اسلام میں علاج فرض نہیں اللہ علاج کے بغیر بھی شفاء دے سکتا ہے لیکن کسی بیمار کے لئے نماز معاف نہیں کیوں کہ انسان کو عبادت کے لئے ، پیدا کیا گیا ہے۔ مساجد اللہ کے گھر ہیں نمازی اللہ کے مہمان ہیں لہٰذا مساجد کسی حال میں نمازی پر بند نہیں کی جاسکتیں۔

سید خالد جامی

پیر نور الحق قادری، ڈاکٹر قبلہ ایاز اور ان کے ہم خیال علماء و مشائخ کی یہ رائے بالکل غلط ہے کہ ریاست اور طبی شخصیات کی بات پر من و عن عمل کیا جائے (جنگ کراچی ۱۷ اپریل ۲۰۲۰) اگر ریاست اور طبی شخصیات کی رائے کسی مطلق، قطعی، حتمی، سچی علمیت یعنی اسلامی علمیت سے آتی تو اس پر من و عن عمل کیا جاتا مگر ان کی رائے WHO سائنس اور میڈیکل سائنس کے دائرے سے آ رہی ہے۔ جس میں کوئی رائے، اصول، نظریہ، نتیجہ نہ حتمی ہے نہ قطعی نہ مطلق وہ ہر لمحہ ارتقاء پذیر ہے لہٰذا ریاستی سائنسی منہاج علمی اپنے مفادات اور اعداد و شمار کے باعث ہر وقت بدلتا رہتا ہے تو ایسے علم پر کیسے ایمان رکھا جا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیر نور الحق قادری اور ڈاکٹر قبلہ ایاز نے کبھی سائنس کے اصول ہی نہیں پڑھے سائنس اپنے بارے میں کیا کہتی ہے سائنس جن دس بنیادی اصولوں پر کھڑی ہے وہ خود غیر سائنسی ہیں ایک کتاب پڑھ لیں۔

The Delusions ofScience

سائنس دان کتنے جھوٹے، چور، پیسے کے پجاری ہوتے ہیں اور کس طرح غلط سائنسی تحقیقات پیش کرتے ہیں۔ صرف ایک کتاب پڑھ لیجئے۔

The Merchant of Doubts

ریاست سائنس اور سرمائے کی تنظیم کا نام ہے لیکن ریاست بھی سائنس دانوں کی صرف وہ تحقیق تسلیم کرتی ہے جس سے مارکیٹ، ریاست، Tax اور عوام کو نقصان نہ پہنچے ورنہ سائنس دانوں کو گرفتار کر کے بند کر دیتی ہے، ضمانت مسترد کر دیتی ہے، سرمایے کے مقابلے میں سائنس داں کی کوئی عزت نہیں ایک کتاب پڑھ لیجئے The collapse of Western civilization سائنس کی پوری تاریخ بحران، تماشوں، تباہی، بربادی کی تاریخ ہے۔ چند کتابیں پڑھ لیجئے۔

1)P. Dicken Getting Science wrong

2)ALGORE An In convincement truth

3)N. Clane Capitalism VS Climate

4)S. M. Rees Our Final Hour

5)DJ. Diamond collapse: How societies choose to Fail & Succeed

6)I. Cook The politics of the final hundred years of humanity 2030-2130
7)E. Eyre Death in mud lick
8)The Corporation
9)Toyne B. A. The world &the west
10Christopher Caudwell Studies in a dying culture
11)Rozak Children of Technology
12)Spenglar Decline of the west

جدید سائنس کی حقیقت جاننے کے لئے اردو میں ہمارے شاگرد ظفر اقبال کی دو کتابیں پڑھ لیجئے :

ظفر اقبال اسلام اور سائنس نئے تناظر میں
ظفر اقبال اسلامیت اور جدیدیت کی کشمکش

جاری کردہ ۲۳ اپریل ۲۰۲۰ء

جمہوری جدو جہد سے پاکستان میں تبدیلی ممکن نہیں

شاہ نواز فاروقی

پاکستانی مذہبی سیاسی جماعتوں کی جمہوری جدو جہد لا حاصل ہے: ایک سوال

پاکستان میں انتخابی، جمہوری، سیاسی، عمل کے ذریعے تبدیلی ممکن ہی نہیں تبدیلی کا راستہ صرف جرنیلوں کی مرضی پر منحصر ہے۔ برادر محترم شاہ نواز فاروقی کی اس تحقیق کی روشنی میں جماعت اسلامی پاکستان اور پاکستان کی مذہبی سیاسی جماعتیں تبدیلی کے لئے دوسرے راستوں کی طرف جائیں گی یا جمہوریت میں ہی اپنی فلاح تلاش کریں گی

جمہوریت سے بچنے کا مطلب استقراء کے تحت عسکری راستہ ہے مگر

استقراء یقین کا فائدہ نہیں دیتا لہٰذا اصول استقراء Induction Method کا اطلاق کر کے صرف اور صرف عسکری جدوجہد کو متبادل راستہ بتانا سائنسی طریقہ کار ہے اور درست طریقہ نہیں عسکری راستہ بے شمار راستوں میں سے ایک راستہ اور واحد راستہ نہیں

رمضان میں شہباز شریف نے انٹرویو میں کہا تھا کہ ۲۰۱۸ کے الیکشن کے لئے سب کچھ طے ہو گیا تھا جرنیلوں نے چند نامور صحافیوں کے ذریعے کابینہ کے نام بھی طے کر دیئے تھے مگر اچانک کچھ اور ہو گیا لیکن مستقبل ہمارا ہے۔

پروفیسر غفور احمد نے ادریس بختیار سے کہا تھا کہ PNA اور IJI خفیہ اداروں نے بنائی تھی۔

شاہ نواز فاروقی لکھتے ہیں فوجی وڈیرے پورے پاکستان کو کنٹرول کرتے ہیں 75 فی صد حلقے ایسے ہیں جہاں سے صرف نام نہاد

Electables ہی منتخب ہو سکتے ہیں یہ ہر اس اسمبلی میں ہمیشہ ہوتے ہیں پاکستان کے تمام انتخابات دھاندلی زدہ ہیں نتائج پہلے طے ہوتے ہیں الیکشن بعد میں ہوتے ہیں وہ جس کو چاہیں جتا دیتے ہیں جس کو چاہیں ہرا دیتے ہیں [جسارت ۲۹ مئی ۲۰۲۰، فرائیڈے اسپیشل] ہمارا سوال شاہ نواز صاحب سے یہ۔ ہے کہ ان حقائق کے ہوتے ہوئے جماعت اسلامی ستر سال سے جو سیاسی و آئینی و جمہوری جدوجہد کر رہی ہے اس جدوجہد کا فائدہ کیا ہے؟ جماعت اسلامی PNA, IJI جیسے سیاسی اتحادوں میں شامل ہوتی رہی۔ PTI سے اتحاد کیا، پرویز مشرف، یحییٰ خان، ضیاء الحقؒ کی فوجی آمریتوں میں شامل رہی تو یہ جدوجہد کیا کہلائے گی۔ کیا اب راستہ بدلنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔

شاہ نواز فاروقی صاحب اردو انگریزی کالم نگاروں میں واحد کالم نگار

ہیں جو نہایت تسلسل کے ساتھ عسکری اشرافیہ پر مسلسل اور مستقل ٹھوس تنقید دلائل اور براہین کے ساتھ مگر نہایت جرات مندانہ اور شائستہ لہجے میں کرتے رہتے ہیں مارشل لاء کی سیاست اور عسکری اشرفیہ نے پاکستان کو کب کب اور کیسے کیسے کیا نقصان پہنچایا اس کا میزانیہ وہ پیش کرتے ہیں اس ادارے کو وہ قومی سلامتی کا دشمن قرار دیتے ہیں مشرقی پاکستان سے لے کر سندھ بلوچستان کی قوم پرستی اور کراچی کی MQM کی ذمہ داری وہ فوج پر ڈالتے ہیں مگر دوسری طرف وہ پاکستان کے جوہری پروگرام کے محافظوں کو مسلسل خراج تحسین بھی پیش کرتے ہیں سوال یہ ہے کہ اس جوہری پروگرام کا تحفظ وہی فوج کیسے کر رہی ہے جو پاکستان کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے؟ محبت ونفرت کے یہ متضاد جذبات سلیم احمد کی زبانی فاروقی صاحب کے حال دل کی ترجمانی کرتے ہیں

اتنی کوشش بھی نہ کر میری اسیری کے لیے تو کہیں میرا گرفتار نہ سمجھا جائے

عالم اسلام میں انقلاب برپا کرنے والوں کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ ان کا اصل مقابلہ کس سے ہے وہ سیاسی تبدیلی، انقلاب ، بغاوت کی باتیں کرتے ہیں مگر ان کے فکری علمی مباحث میں ریاست سرے سے موضوع گفتگو ہی نہیں اصل ہدف ہی نہیں ان کا انقلاب آئے گا تو کس کو کس چیز سے بدلے گا شرع اسلامی آئے گی تو کیا وہ اسی دلدل میں قدم جمائے گی یا اس کے لیے کوئی دوسرا ماحول منظر موسم ہوا فضا موجود ہوگی_ اس ماحول منظر موسم کو کیسے خلق کیا جائے گا انقلابی تحریکیں اور مفکرین جدید ریاست کے بارے میں کوئی کلام نہیں کرتے بس مارکیٹ سرمایہ اور انسانی حقوق پر تنقید تک محدود رہ جاتے ہیں اگرچہ ان کا کام نہایت عمدہ، قیمتی اور تخلیقی نوعیت کا ہے مگر اس کام میں وسعت اور جامعیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے تا کہ یہ وقیع کام انقلاب کے برگ و بار

اور آثار پیدا کر سکے اس کام پر تنقید کے بجائے اس کی توسیع کی ضرورت ہے تبدیلی کے لیے ہر قابل قدر کام کا احترام اور اس کا اعتراف اور اس سے استفادہ ضروری ہے سب مل کر کام کریں گے تو کام آگے بڑھے گا

شاہ نواز صاحب کے افکار میں محسوس ہونے والا تضاد اصلاً جدید ریاست کی حقیقت، ماہیت اور اصلیت سے ہماری عدم واقفیت ہے کورونا۔ نے جدید ریاست کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے دنیا میں طاقت کا اصل مرکز محور جدید ریاست ہے اس موضوع پر عالم اسلام میں کوئی کام نہیں ہوا جدید ریاست کی تفہیم جیسے ہی ممکن ہو گی شاہ نواز کی تنقید کا تضاد ویسے ہی حل ہو جائے گا

سید خالد جامعی

برادر محترم ومکرم شاہ نواز فاروقی اردو صحافت کے ان چند گنے چنے لوگوں میں شامل ہیں جن کا دامن ہر داغ سے صاف ہے جن کے اخلاص، نیت میں کسی کو شک نہیں

ہوسکتا، جوصرف گفتار کے نہیں کردار کے بھی غازی ہیں۔ ان کا انداز تحریر جادو کا اثر رکھتا ہے۔ مغرب کی تفہیم، جمہوریت، انسانی حقوق، جدید ریاست، جدید علوم اور سائنس کے مباحث کے بارے میں ان کے بعض علمی مباحث سے شدید اختلاف کے باوجود بحیثیت مجموعی ان کی تحریریں اور ان کا سحر انگیز قلم لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔

اپنے حالیہ کالم " کرپشن سے بنا پاکستان کا سیاسی نظام " (جسارت ۲۹ مئی ۲۰۲۰) میں انہوں نے پاکستان کی تمام دینی مذہبی سیاسی جماعتوں کی سیاسی جدوجہد کو لاحاصل جدوجہد قرار دیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ نہیں ہیں مگر مفہوم بالکل یہی ہے۔ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے ملک کا آئین اسلامی ہے مگر جرنیل بھٹوز شریفین اسلام کو آئین سے نکلنے ہی نہیں دیتے۔ آئین اسلام کا قید خانہ ہے۔ فوجی سول حکمراں سود کے نظام کے طرف دار ہیں۔ جنرل ضیاء نے جونیجو لیگ کا تحفہ دیا ضیاء نے ۲۰۰ ارب روپے سے زیادہ کے قرضے معاف کیئے، یہی کام پرویز مشرف نے کیا۔ فوجی وڈیرے پورے پاکستان کو کنٹرول کرتے ہیں ۵۷ حلقے ایسے ہیں جہاں سے صرف نام نہاد Electable ہی منتخب ہوسکتے ہیں۔ یہ ہر اسمبلی میں ہمیشہ ہوتے ہیں پاکستان کے تمام انتخابات دھاندلی زدہ ہیں، نتائج پہلے طے ہوتے ہیں۔ الیکشن بعد میں ہوتے ہیں، وہ جس کو چاہے جتا دیتے ہیں جس کو چاہے

ہرا دیتے ہیں (جسارت ۲۹ مئی ۲۰۲۰ فرائڈے اسپیشل)۔ ہمارا سوال شاہ نواز صاحب سے یہ ہے کہ ان حقائق کے ہوتے ہوئے جماعت اسلامی ستر سال سے جو سیاسی و آئینی و جمہوری جدوجہد کر رہی ہے اس جدوجہد کا فائدہ کیا ہے؟ جماعت اسلامی PNA, IJI جیسے سیاسی اتحادوں میں شامل ہوتی رہی۔ PTI سے اتحاد کیا، پرویز مشرف، یحیٰ خان، ضیاء الحق کی فوجی آمریتوں میں شامل رہی تو یہ جدوجہد کیا کہلائے گی۔ کیا اب راستہ بدلنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ تمام مذہبی جماعتیں عموماً جماعت اسلامی کی حکمت عملی کی ہی پیروی کرتی ہیں۔

شاہ نواز لکھتے ہیں کہ مارشل لاء اخلاقی سیاسی آئینی کرپشن ہے فوجی اور سول اشرافیہ نے ہمیشہ ملک وقوم کی آزادی وخودمختاری کا سودا کیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہماری مذہبی سیاسی جماعتیں اور شاہ نواز صاحب کی سب سے پسندیدہ جماعت، جماعت اسلامی ہمیشہ سول اور فوجی حکمرانوں کے اتحاد میں شامل رہتی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا جمہوری آئینی جدوجہد کے سوا دوسرے راستے موجود نہیں عموماً جمہوریت کے سوا ہر راستہ عسکری جدوجہد کا راستہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا برادرم شاہ نواز دوسرے راستوں کی طرف جماعت اسلامی اور دیگر مذہبی جماعتوں کی رہنمائی فرمائیں۔

جمہوریت، عسکریت، اکثریت کے سوا بھی جدوجہد کے ایک ہزار طریقے ہیں قرآن

کریم اور اسلامی تاریخ اس کا ثبوت ہے مگر جد و جہد کی پہلی منزل کردار سازی، نفوس کا تزکیہ اور نیک لوگوں کی تیاری ہے جن کا عقیدہ بھی درست ہو اور جن کے اعمال بھی روشن ہوں اسی لیے قرآن میں سورہ الفرقان آیت نمبر ۷۴ میں دعا ہے کہ اے اللہ ہمیں متقیوں کا امام بنا۔ وَالَّـذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّیَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْیُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ إِمَاماً

شاہ نواز صاحب بھٹو خاندان کے شدید مخالف ہیں اور اسے ملک دشمن قرار دیتے ہیں مگر ان کے ممدوح ڈاکٹر قدیر خان اپنے کالم میں لکھتے ہیں ایٹمی پروگرام کا پورا کریڈٹ مرحوم بھٹو کو جاتا ہے بعد میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے ایسا ہی بھروسہ اور اعتماد کر کے مجھے مختلف قسم کے میزائل بنانے کا موقع دیا۔ میں ملک کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا مگر اس کے لیے بھٹو صاحب اور۔ بے نظیر صاحبہ غلام اسحاق آغا شاہی جیسے لوگوں کی مدد اور راہنمائی چاہیے [یوم تکبیر اور ملکی حالات قدیر خان جنگ کراچی یکم جون ۲۰۲۰ء] سوال یہ ہے کہ ملک کے غدار بھٹو خاندان کے بارے میں ڈاکٹر قدیر خان کیا لکھ رہے ہیں اور شاہ نواز صاحب کیا بتا رہے ہیں دو مختلف نقطہ ہائے نظر میں تطبیق کیسے پیدا کی جائے قومی ریاست اور جدید ریاست کی تفہیم کے بغیر ایسے Paradox حل نہیں ہوسکتے ہر ادارے چہرے، قوت، تنظیم — کو قومی

شاہ نواز فاروقی صاحب سے چند مزید سوالات

(قسط دوئم)

سید خالد جامعی

محترم شاہ نواز فارقی صاحب ایک صاحب ایمان، غیرت منداور صاحب علم مفکر ہیں اللہ تعالی نے انھیں بے شمار خوبیوں سے نوازا ہے ان کی تحریر اتنی خوب صورت ہوتی ہے کہ ۔ پڑھنے والا اس کے سحر میں کھو جاتا ہے ان سوالات کا مقصد شاہ نواز صاحب کی مخالفت، تحقیر و تضحیک نہیں صرف تبادلہ خیالات ہے یہ بہت اہم سوال ہیں جن کا جواب شاہ نواز صاحب دیں گے تو اسلامی تحریکوں کو جدوجہار کے نئے دریچوں اور راستوں کا حصول ممکن نظر آئے گا ہم تمام راسخ العقیدہ اسلامی تحریکوں سے محبت رکھتے ہیں ان کی اصلاح ہمارا مقصد ہے ان سوالات کو اسی تناظر میں پڑھا جائے۔

جدید ریاست کے فلسفے اور تاریخ و تناظر سے واقف ہر شخص اور فلسفی جانتا ہے کہ جدید ریاست نے خدا کی جگہ حاصل کر لی ہے جس طرح ہر انسان اللہ کا عبد پہلے ہے اس کے بعد اس کی کوئی حیثیت ہے بالکل اسی طرح جدید ریاست سے ایک فرد کا تعلق سب سے پہلے Citizen کا ہے کوئی شخص پہلے ریاست کا شہری ہے اس کے بعد وہ کسی کا باپ، بیٹا پوتا، دادا ہے ہر مذہبی، لسانی، علاقائی شناخت کی کوئی حیثیت نہیں اصل شناخت ریاست کی دی ہوئی ہے جرمنی کے فلسفی کارل اشمتھ نے اپنے فلسفے میں ریاست کے فلسفے کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ جس طرح خدا کو اس کائنات پر کامل تصرف حاصل ہے اور وہ اپنے معجزات کے ذریعے کائنات کے نظام میں تعطل پیدا کر کے اپنے استثناء State Of Exception کا اظہار کرتا ہے بالکل اسی طرح جدید ریاست جب چاہے اپنے کسی اصول قانون کو توڑ سکتی ہے یہ استثنائی حیثیت صرف ریاست کو حاصل ہے ہر شخص اس کے سامنے مجبور محض ہے اسی لیے جدید ریاست میں علماء اور اسلامی تحریکوں کی صرف اور چار حیثیتیں ہیں ۔

۱۔ سیکولرائزنگ ایجنٹ ۲۔ قومی سلامتی اور قوم پرستی کے بلامعاوضہ وکیل ۳۔ ریاست کے آلہ کار ۴۔ پریشر گروپ جناب شاہ نواز صاحب بتائیں کہ اسلامی تحریکوں کی ان چار حیثیتوں کے سوا کیا حیثیت ہے ستر سال کے تجربات کے بعد بھی ان حالات کو دیکھتے ہوئے علماء اور اسلامی جماعتیں اپنے مقام حیثیت سے آگاہ نہیں اور مفتی تقی عثمانی صاحب کو انتہائی دکھ سے یہ سوال پوچھنا پڑا کہ پاکستان کی ریاست بتا دے کہ وہ ہمیں کیا سمجھتی ہے۔ ہماری کیا حیثیت ہے کیا اسلامی قوتوں کو اپنی حیثیت کا علم ابھی تک نہیں ہوسکا یہ کیسی ریاست ہے جہاں علماء ریاست کی راہنمائی کی بجائے ریاست سے اپنی حیثیت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟

☆ ۔مذہبی جماعتیں اور پاکستان کی ریاست جنگ یا جہاد کے ذریعے اگر بالفرض مقبوضہ کشمیر کو فتح بھی کرلے تو ہمارا شاہ نواز صاحب سے یہ سوال ہے کہ اس جنگ یا جہاد کے اختتام پر کشمیر میں کیا اسلامی شریعت نافذ ہوگی یا جدید آئین؟ پاکستان کو ستر سال ہوگئے اور یہاں آج تک اسلام نافذ نہیں ہوسکا تو ایسی جنگ کشمیر کا کیا فائدہ جس کا انجام پاکستان جیسا ہو___ ۔ خون بہانے کے بعد بھی نتیجہ حاصل نہ ہو تو ایسی لاحاصل جدوجہد کے کیا معنی کیا کشمیری آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں یا ان کی آزادی کا اصل مقصد نفاذ شریعت ہے شریعت کے بغیر جہاد کے کیا معنی___ طالبان جیسی قوت نے مجاہدین کا مقدمہ لڑنے کے بجائے جہاد کے عالمی و دائمی تصور سے ہی رجوع کرلیا اچانک طالبان کی جدوجہد عالمی، آفاقی ہونے کی بجائے مقامی، علاقائی، قومی اور افغانی ہوگئی تو کشمیر کی آزادی کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ نتیجے کے بغیر جدوجہد کا کیا مقصد ہے؟

☆ ۔جناب سراج الحق نے کہا کہ ہم جہاد کے ذریعے بھارت میں نیا پاکستان بنا دیں گے سوال یہ ہے کہ کیا جماعت اسلامی ہندوستان اس جہادی جدوجہد میں پاکستان کے ساتھ ہوگی یا ہندوستان کے ساتھ یا غیر جانبدار ہوگی؟ قومی ریاستوں نے مذہب، عقیدے اور ایمان پر بھی غلبہ پالیا وہ ان سب سے ماورا ہوگئی ہندوستان کے مسلمان ہندوستانی ریاست کے وفادار ہیں، بوہری وہاں مودی کے حق میں ریلیاں نکال

رہے ہیں اور پاکستانی بوہری پاکستانی ریاست کے ساتھ ہیں جمعیت علمائے ہند ۔ بھارت بھارتی حکومت کے ساتھ پاکستان میں جمعیت پاکستانی ریاست کے ساتھ ہے پاکستان کی ہندو اقلیت پاکستان کی وفادار ہے بھارت کی اقلیتیں بھارت کی وفادار ہیں کیوں کہ جس کا مفاد جہاں ہے وہ اسی کا وفادار ہے لہٰذا اسلامی جماعتوں، تنظیموں، تحریکوں کی جدوجہد بھی عالمی، آفاقی نہیں مقامی، قومی علاقائی ہوگئی۔ ہے مثلاً دعوت اسلامی پاکستان میں کشمیر میں ظلم کے خلاف اور اس کی آزادی کی حامی ہے لیکن کیا ہندوستان کی دعوت اسلامی کا بھی یہی ہدف اور طریقہ کار ہے؟ ظاہر ہے قومی ریاست۔ نے ہمارے عقیدے پر بھی ہاتھ صاف کر دیا ہے کیا شاہ نواز صاحب اس سے اختلاف کریں گے جماعت اسلامی نے 1971 میں پاکستان کا اور پاکستانی فوج کا ساتھ دیا مشرقی پاکستان میں عظیم قربانیاں دیں۔ ۔ بنگلہ دیش کی زبردست مخالفت کی لیکن بنگلہ دیش بن جانے کے بعد جماعت اسلامی بنگلہ دیش الگ بن گئی تو اس کے امیر پروفیسر غلام اعظم نے جمعیت کے سرکاری رسالے ''ہم قدم'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے کبھی بنگلہ دیش کی مخالفت نہیں کی ____ اس بیان کا پس منظر جدید ریاست ہے۔ ۔ جدید ریاست اپنے شہریوں سے کامل وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے وہ خدا کی طرح شہریوں سے عبدیت، بندگی، خود سپردگی، طلب کرتی ہے غلام اعظم صاحب کا بیان اسی تناطر میں تھا یہ ان کی مجبوری تھی۔ کیا شاہ نواز صاحب ہمارے نقطہ نظر سے اتفاق کریں گے یا اختلاف؟ جماعت اسلامی بنگلہ دیش وہاں مخلوط حکومت میں شامل رہی بنگلہ دیش کا پرچم ، آئین، بنگلہ دیش سے وفاداری کا حلف اُٹھایا حالانکہ 1971 میں وہ پاکستان، پاکستانی پرچم کی جنگ لڑ رہے تھے دیش بدلتے ہی سب کچھ بدل گیا۔ جدید قومی ریاست نے جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کا رخ کیسے بدلا شاہ نواز صاحب اس بارے میں جماعت کی راہنمائی کریں کیا اس واقعے سے قومی ریاست کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی کہ وہ خدا کا درجہ حاصل کر چکی ہے کارل اشمتھ کو پڑھیے۔

۔امریکی صدر بش نے افغانستان پر حملہ کیا تو اس نے تقریر کی دنیا کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ امریکہ ، کے

ساتھ ہے یا طالبان کے ساتھ ــــ ۔ امریکہ نے زبردستی پوری دنیا کو اپنا حامی بنا لیا اس نے کسی کے لیے غیر جانبدار ہونے کا راستہ بھی نہ چھوڑا۔ پوری دنیا تمام اسلامی ممالک خادم حرمین شریفین، ترکی ، سب امریکی پٹھو بن کر امریکہ کے ساتھ غریب افغانی غیرت مند طالبان کے ساتھ جنگ لڑ رہے تھے کسی ملک ، اسلامی مملکت، مسلم حاکم کو یہ جرات بھی نہیں ہوئی کہ وہ یہ کہہ سکتا کہ ہم غیر جانب دار ہیں کوئی ایسا باغیرت مسلم حاکم سامنے نہیں آیا جو کہے کہ ہم غیرت مند طالبان کے خلاف جنگ میں امریکہ کا ساتھ نہیں دیں گے مسلم حکمرانوں میں کی بے غیرتی کا یہ عالم ہے کہ امریکی صدر اوبامہ نے توہین رسالت کرنے والوں کے خلاف ردعمل پر شدید تنقید کرتے ہوئے UNO۔ کے فورم پر کھڑے ہو کر آصف زرداری، طیب اردگان، احمد نژادی، محمد مرسی کی موجودگی میں کہا کہ توہین رسالت کو روکنے کا ایک ہی طریقہ۔ ہے کہ توہین رسالت کی اور آزادی دو اور آزادی دو اس نے کہا کہ آزادی قدر ہے عقیدہ ہے اور پوری دنیا اس پر ایمان رکھتی ہے لہذا توہین رسالت کے جرم پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی ــ امریکی صدر کی اس تقریر کو سننے کے بعد زرداری، اردگان، احمد نژادی، مرسی۔ نے تقاریر کیں لیکن کسی ایک کو جرات نہ ہوئی کہ وہ امریکی صدر کے خلاف بولتا آزادی کے عقیدے کو باطل، لغو اور بکواس قرار دیتا ہے۔ شاہ نواز صاحب امریکی صدر کی تقریر پڑھ لیں۔

We have taken these positions because we believe that freedom and self-determination are not unique to one culture. These are not simply American values or Western values - they are universal values. Here in the United States, countless publications provoke offense. Like me, the majority of Americans are Christian, and yet we do not ban blasphemy against our most sacred beliefs. As President of our country and Commander-in-Chief of our military, I accept that people are going to call me awful things every day - (laughter) - and I will always defend their right to do so. (Applause.)

Americans have fought and died around the globe to protect the right of all people to express their views, even views that we profoundly disagree with. We do not do so because we support hateful speech, but because our founders understood that without such protections, the capacity of each individual to express their own views and practice their own faith may be threatened.

We do so because given the power of faith in our lives, and the passionthat religious differences can inflame, the strongest weapon against hateful speech is not repression; it is more speech - the voices of tolerance that rally against bigotry and blasphemy, and lift up the values of understanding and mutual respect.

But in 2012, at a time when anyone with a cell phone can spread offensive views around the world with the click of a button, the notion that we can control the flow of information is obsolete.

[Remarks from President Barack Obama to the UN General Assembly, New York, 2012.09.26

آج اسلامی تحریکیں انہی حکمرانوں کے تصور اسلام کو پیش کر رہی ہیں شاہ نواز صاحب اسلامی تحریکوں کو بتائیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا تماشہ ہے؟ اسلامی علمیت کے ساتھ ہم سب مل کر کیا کھیل کر رہے ہیں کیا ہم سب اللہ کے غصے کو دعوت دے رہے ہیں؟

شاہ نواز صاحب اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ بتائیں کہ اگر امریکی صدر کی تقریر کے بعد آپ کو تقریر کا موقع ملتا تو آپ کیا کہتے؟ ایک مرتبہ آپ نے ہم سے گفتگو میں ایک عجیب جملہ کہا تھا ''اگر شیطان اور امریکہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو میں شیطان کا انتخاب کروں گا'' آپ کی نظر میں امریکہ شیطان سے بھی بدتر ہے اس شیطان کے نمائندے .اوبامہ نے کہا کہ توہین رسالت کی آزادی دیتے رہو____ یہی توہین رسالت کے مسئلے کا حل ہے اس تقریر کے بعد محمد مرسی

شہید، اردگان، احمد نژادی، زرداری نے تقاریر کیں لیکن کسی نے اوبامہ کی تقریر پر تنقید نہیں کی یہ ہوتی ہے غالب حاضر موجود ڈسکورس کی طاقت کہ اسلامی علمیت کے نمائندوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں کہ ہم غالب ڈسکورس کے عقیدہ آزادی کی تردید کیسے کریں اس کے لیے بہت زبردست، یقین اور ایمان کی ضرورت ہوتی ہے عالم اسلام تو سو سال سے انسانی حقوق کے کافرانہ منشور کی اسلامی وکالت کر رہا ہے ادارہ ترجمان القران نے محمد صلاح الدین کی کتاب ''انسانی حقوق'' شائع کی ہے وہ پڑھ لیجیے۔ اس کتاب میں اس منشور کی مابعد الطبعیات، جدید تصور انسان، تصور کائنات، تصور نفس اور Fedralist Papers کا ذکر ہی نہیں۔ بے چارے خالد اسحاق اور محمد صلاح الدین صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں تھا حالانکہ خالد اسحاق صاحب بہت بڑے وکیل تھے ان کے کتب خانے میں بیٹھ کر صلاح الدین صاحب نے کتاب لکھی تھی۔ کانٹ نے جدید انسان کی تعریف کی ہے وہ تعریف بھی اس میں موجود نہیں ایسی ہی کتابوں نے منشور حقوق کو خطبہ حجۃ الوداع سے ماخوذ ثابت کرنے میں کردار ادا کیا ہے کانٹ لکھتا ہے کہ انسان کون ہے؟

Laziness and cowardice are the reasons why such a large part of mankind gladly remain minors all their lives, long after nature has freed them from external guidance. They are the reasons why it is so easy for others to set themselves up as guardians. It is so comfortable to be a minor. If I have a book that thinks for me, a pastor who acts as my conscience, a physician who prescribes my diet, and so on--then I have no need to exert myself. I have no need to think, if only I can pay; others will take care of that disagreeable business for me. Those guardians who have kindly taken supervision upon themselves see to it that the overwhelming majority of mankind--among them the entire fair sex--should consider the step to maturity, not only as hard, but as extremely dangerous. First, these guardians make their domestic cattle stupid and carefully prevent the docile creatures from taking a single step without the leading-strings to which they have fastened them. Then they show them the danger that would threaten them if they should try to walk by themselves. Now this danger is really not very great; after stumbling a few times they would, at last, learn to walk. However, examples of [What Is such failures intimidate and generally discourage all further attempts.

.پاکستان کو فخر تھا کہ اس نے چھ ستمبر 1965ء کی جنگ میں کامیابی حاصل کی بھارت کو نقصان پہنچایا اس کے جہاز گرائے۔ .چونڈہ کے محاذ پر ٹینکوں کی جنگ لڑی لاہور میں آ کر جم خانہ میں شراب پینے کے بھارتی جنرل کے خواب کو چکنا چور کیا لہذا ہر سال چھ ستمبر کو عام تعطیل ہوتی تھی یہ دن بڑے فخر سے منایا جاتا تھا ۔اسکولوں کالج یونیورسٹی میں تقریبات ہوتی تھیں اخبارارت خصوصی شمارے شائع کرتے تھے ملک کے ہر ہر شہر میں عوامی مقامات پر فوجی مشقیں، ہوائی جہاز کے کرتب، اسلحہ کی نمائش اور لڑائی کے مناظر پیش کر کے عوام کو گرمایا جاتا تھا لیکن اچانک مشرف دور میں چھ ستمبر کی چھٹی ختم کر دی گئی یوم دفاع پاکستان کے اسباق کو اردو اور شہریت کی کتابوں سے نکال دیا گیا اخبارات میں یوم دفاع کے خصوصی صفحات کی اشاعت اچانک ختم ہوگئی یہ مشرف حکومت کا بیانیہ تھا بھارت سے اچھے تعلقات کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا تھا___ سوال یہ ہے کہ یہ سب کیوں ہوا اس کی اجازت کیوں دی گئی MMA مشرف کے ساتھ حکومت میں شامل تھی اس نے یوم دفاع کے بارے میں کیا کوشش کی. – گزشتہ چند سالوں سے دوبارہ اخبارات میں یوم دفاع پر کچھ شائع ہونے لگا ہے اس سال یوم دفاع اور کشمیر کو ایک ،ساتھ منایا گیا لہذا یوم دفاع پر سرکاری سرگرمیاں واضح طور پر نظر آئیں ISPR نے پرومو دیا___ ''آیئے شہیدوں کے گھر چلیے'' اچانک جنگ ستمبر کے شہدا قوم کو یاد آ گئے سوال یہ ہے کہ اب تک ہم انھیں کیوں بھولے ہوئے تھے کشمیر یاد آیا تو جنگ ستمبر کیوں یاد آ گئی۔ اچانک بیانیہ کیوں تبدیل ہوگیا۔ .پرومو تو اصولاً یہ ہونا چاہیے تھا کہ آیئے کشمیر کے شہیدوں کے گھر چلتے ہیں آیئے آگ بجھانے کشمیر چلتے ہیں لیکن ظاہر ہے جدید ریاست کو دوسری

ریاست میں جانے کا اختیار نہیں بین الاقوامی قوانین کے تحت یہ ممکن نہیں ـــــ یہ UNO کے اصولوں کی خلاف ورزی ہے مگر سوال یہ ہے کہ بھارت بغیر کسی دفاع اور وجہ کے 1971ء میں مشرقی پاکستان میں گھس کر اسے تباہ کر کے آزاد علاقہ بنا کر چلا گیا تو بین الاقوامی قانون، UNO اسوقت کہاں مر گئے تھے جناب شاہ نواز صاحب نے اس بارے میں قوم کو کچھ نہیں بتایا۔ 6 ستمبر کو نعرہ دیا گیا شہیدوں کے گھر چلیے ـــــ تو کن شہیدوں کے گھر وہ شہید جو ہندوستان سے جنگ لڑتے ، ہوئے شہید ہوئے یا جو دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑ کر پاکستان کے اندر شہید ہوئے . ریاست کس عقل مندی سے اپنے نعرے، وعدے ، بیانیے بدلتی ہے اس کا اندازہ کر لیجیے۔ .وہ مذہبی جماعتیں جو آج تک جدید ریاست کو امارت، خلافت پر قیاس کر رہی ہیں وہ کبھی ان مباحث کو سمجھ ہی نہیں سکتیں لہذا ہماری اسلامی جدوجہد بے سمت مسافر کا سفر ہے شاہ نواز صاحب کیا فرماتے ہیں کیا جدید ریاست مذہبی ہو سکتی ہے؟ اگر کسی نے جدید ریاست کے فلسفے ، اس کی تاریخ اور اس کے اس کے فلاسفہ کو پڑھا ہے تو وہ اسلامی تحریکوں کی راہنمائی کریں یہ ریاست تو خدا ہے۔

شاہ نواز صاحب بار بار مضامین میں لکھتے ہیں کہ ہم ایٹمی طاقت ہیں لہذا ہمیں بھارت سے جنگ کرنی چاہیے سوال یہ ہے کہ ایٹم بم کا مقصد جنگ کرنا ہے یا ایٹم بم کا مقصد امن رکھنا ہے یہ تو Detrent ہے اس کی موجودگی میں جنگوں کا امکان مستقل طور پر ختم ہو جاتا ہے اور پائیدار امن قائم ہو جاتا ہے۔ خود شاہ نواز صاحب نے اپنے کالم میں لکھا کہ پلوامہ واقعہ کے بعد پاکستانی فوج نے اپنے وار ہیڈ بھارت کی طرف بلند کر کے پیغام دے دیا تھا کہ ہم ایٹم بم پھینکنے والے ہیں ڈرتے نہیں لہذا فوراً عالمی برداری متحرک ہو گئی اور جنگ کا خطرہ ٹل گیا ـــــ لہذا ثابت ہوا کہ ایٹم بم ایٹمی قوت پھینکنے کے لیے نہیں بناتی جنگ سے بچنے اور فوج پر اُٹھنے والے بھاری اخراجات سے ہمیشہ کے لیے نجات کے لیے بناتی ہے تو پاکستانی فوج سے ایٹم بم کے استعمال کی توقع رکھنا ایک غیر عسکری رویہ نہیں ہے؟ امریکہ کو ایٹم بم جرمنی پر پھینکنا چاہیے تھا

یا روس پر لیکن اس نے گوری نسلوں کو اس عذاب سے مخفوظ رکھا جاپان تو جنگ ہار چکا تھا اسے شکست ہو چکی تھی لیکن دنیا کو سبق سکھانے کے لیے اور اپنی سفید نسل پرستی کو ثابت کرنے کے لیے اس نے کمزور قوم جاپان پر بم پھینکا اور اس عمل کو پرل ہاربر پر جاپانی حملے کا ردعمل قرار دیا امریکہ نے یورپ کو جوہری آلودگی تباہی بربادی سے محفوظ رکھ کر سفید نسل پرستی کا اظہار کیا اور جاپان کو نشان عبرت بنا کر کانٹ کے فلسفے Epistimologoical Racism کا عملی مظاہرہ کیا کانٹ وہ مفکر ہے جس نے یہ فلسفہ پیش کیا کہ گوری اقوام سب سے زیادہ عقل مند چالاک ذہین اور تمام اقوام سے برتر اور اعلی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں Rational Capacity سب سے زیادہ ہے کانٹ کے اسی فلسفے کے بعد تمام گوری مغربی اقوام نے کالونیل ازم اور امپرل ازم کا آغاز کیا پوری دنیا کو غلام بنالیا امپریل ازم کا فلسفیانہ جواز کانٹ نے ہی پیش کیا تھا وہ کالے لوگوں کو انسان ہی نہیں سمجھتا تھا زندگی میں ایک مرتبہ اس نے ایک کالے شخص کو دیکھا جو بالکل انسانوں جیسی حرکات وسکنات کر رہا تھا تو اسے ،بہت حیرت ہوئی تھی کہ کالے لوگ بھی انسانوں جیسے ہو سکتے ہیں جس شخص کو انسانوں کی نسلوں، علاقوں، مزاج، رویوں، عادات واطوار انداز. کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کالے انسان ہی ہیں اس نے دنیا کی تمام اقوام کو چھ قسموں میں تقسیم کیا گوری قوموں کو اعلی، بہتر، برتر، عظیم نسل قوم قرار دے کر پوری دنیا کو کالونیل ازم میں مبتلا کر دیا۔

کانٹ کے خیالات اسلام کے بارے میں نہایت مضحکہ خیز توہین آمیز بلکہ تمسخر انگیز ہیں اس کی تحقیق یہ تھی کہ مسلمان شراب کو حرام سمجھتے ہیں اور افیم کو حلال قرار دیتے ہیں وہ اسلام کے بارے میں اپنے روحانی مذہبی پیشوا مارٹن لوتھر سے زیادہ نفرت انگیز اور توہین آمیز خیالات رکھتا تھا کانٹ کا فلسفہ اخلاق [Moral Philosophy] ہر شے کو تجرباتی بنیادوں پر دیکھنے کا آرزومند ہے اس کے اپنے الفاظ میں

every thing empirical. Only emperical & therefore belonging to

Carefully Purified ofanthropology

انھی معنوں میں کانٹ عقل محض Pure Reason اور تجربیت محض Pure empricisim کے

آمیختے کو ہی علم سمجھتا ہے اسی لئے کانٹ کے فلسفے کے بعد ہر وہ علم ___ علم کے دائرے سے خارج ہو گیا جو عقلیت اور تجربیت کے پیمانے، معیار، کسوٹی اور دائرے ۔ میں نہیں آ سکتا لہٰذا مغرب مذہب سے لاتعلق ہو گیا صرف عقل و تجربے کا روحانیت سے کیا تعلق؟

احمد جاوید صاحب کے بارے میں ہمیں ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب نے بتایا کہ وہ کانٹ کے فلسفے سے تصوف کا اثبات کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کانٹ کا فلسفہ صوفیانہ ہے وہاں سے تصوف کی روایت نکلتی ہے کانٹ سے تصوف کی روایت نکالنا عجیب بات تھی کانٹ اسلام سے بھی شدید نفرت کرتا تھا اس کی نفرت کے حوالے ایک کتاب میں پڑھیں حضرت والا اگر Ian Almond کی کتاب

History of Islam in German thoughts(ROUTLEDGE)

پڑھ لیتے تو کانٹ کے بارے میں کم از کم یہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ یہ وہی احمد جاوید صاحب ہیں جن کے بارے میں ہمارے محترم شاہنواز صاحب کی رائے ہے کہ یہ مغرب کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں جو شخص کانٹ کے فلسفے سے تصوف ثابت کرے اور مغرب کے قصیدے پڑھے وہ مغرب۔ سے کتنے واقف ہونگے شاہنواز صاحب اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔۔ آلمنڈ نے کانٹ، لائبینیز، ہیگل، مارکس، نطشے اور دیگر فلاسفہ کے اسلام سے متعلق خیالات کی تحقیق پیش کر دی ہے۔

۔شاہنواز صاحب بار بار اپنے مضامین میں پاکستانی فوج، پاکستانی سیاست دان، پاکستانی جاگیرداروں کو ملک دشمن سے وطن دشمن قرار دیتے ہیں ان کا مشہور جملہ ہے کہ ''یہ سب میڈان امریکہ ہیں'' لیکن سب کو غدار، دشمن وطن قرار دینے کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام محفوظ ہاتھوں میں ہے اور پلوامہ والے واقعے کے بعد اپنے کالم میں انھوں نے لکھا کہ ہماری فوج نے ایٹمی وار ہیڈ بھارت کی طرف کر دیئے تھے سوال یہ ہے کہ شاہنواز صاحب کی تحقیق کے مطابق پاکستانی فوج امریکی پٹھو ہے اس کے جرنیل سیاست دان سب میڈان امریکہ ہیں تو پاکستانی ایٹمی پروگرام کی حفاظت کیا قطب غوث اور

ابدال کرر ہے ہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ہماری فوج اگر فوج غدار ہے امریکہ کی پٹھو ہے تو اس فوج کی قائم کردہ تین حکومتوں میں جماعت اسلامی کیوں شامل ہوئی؟ جماعت اسلامی نے یحییٰ خان کی مارشل لاء حکومت کا بھرپور ساتھ دیا، مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے 100 فی صد قومی وصوبائی اسمبلی کی نشستیں جمہوری انتخابات میں حاصل کیں لیکن فوج نے ان نتائج کو مسترد کر کے عوامی لیگ پر پابندی عائد کر کے نئے جعلی جمہوری انتخابات کرائے جس میں مسلم لیگ پہلے نمبر پر اور جماعت اسلامی دوسرے نمبر پر آ گئی ڈاکٹر مالک کی فوجی کابینہ میں جماعت اسلامی شریک ہوگئی اور فوج کے ساتھ مل کر مکتی باہنی اور بھارت سے جنگ لڑی، جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت میں جماعت اسلامی شامل رہی - مشرف جس کے بارے میں شاہ نواز صاحب کہتے ہیں کہ اس ڈرپورک، بزدل جاہل ملک دشمن شخص نے امریکہ کے ایک ٹیلی فون پر پورا ملک حوالے کر دیا____ یہ غدار وطن تھا لیکن شاہ نواز صاحب کی محبوب جماعت اسلامی جو اس ملک میں ان کی تحقیق کے مطابق____ امید کی آخری کرن ہے [ہماری رائے میں تو ہر مذہبی راسخ العقیدہ جماعت جو منہاج اہل سنت والجماعت کو تسلیم کرتی ہے ہمیشہ امید کی آخری کرن ہو گی] وہ MMA کی صورت میں مشرف کی فوجی حکومت کا حصہ بن گئی____ تو ہمارا سوال یہ ہے کہ غداروں کی حکومت سے جماعت اسلامی کے ان سیاسی اتحادوں کو کیا ہم حالت اضطرار کے تحت کوئی عمل سمجھیں کوئی مجبوری تصور کریں____ یا ہماری فوج پر شاہ نواز صاحب کے اعتراضات اور الزامات ہی بے بنیاد ہیں یا فوج اور جماعت اسلامی کی حکمت عملی میں کوئی تطبیق پیدا کریں اس معاملے میں شاہ نواز صاحب ہماری راہنمائی فرمائیں کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ کیا ان کے تجزیے غلط ہیں یا ان میں تضاد ہے؟ یا ہمارا فہم ہی ناقص ہے کہ ہم ان کے سیاسی تجزیوں کا درست تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں؟

۳۰۔ حکومت پاکستان نے کہا ہے کہ مقبوضہ کشمیر دنیا کی سب سے بڑی جیل بن چکی ہے لیکن حکومت یہ بھول گئی ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی جیل اس وقت چین کے مسلم علاقوں میں ہے جہاں لوگوں کو گھروں سے

نکال کر جیلوں میں رکھا گیا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت و اصلاح کی جا رہی ہے کشمیر کی جیل میں بھارتی ریاست نے لوگوں کے گھروں کو سب جیل قرار دے کر کرفیو لگا کر انھیں اپنے گھروں میں رہنے پر مجبور کر دیا ہے مگر ایسا کرنا جیل میں رکھنا ہے یہ ریاست کا بیانیہ ہے چین میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کچھ نہیں ہے یہ بھی ہماری پاکستانی ریاست کا بیانیہ ہے جدید ریاست اتنی عقل مند ہوتی ہے سامنے کے حقائق کو بھی بدل دیتی ہے سعودی عرب اور کئی مسلمان ملکوں نے چین کے خلاف UNO میں کسی قرارداد کی پیشگی مخالفت کرتے ہوئے بیان دیا ہے کہ چین میں مسلمانوں سے کوئی برا سلوک نہیں ہو رہا۔ ہے وہاں مسلمان بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں ___ عرب ممالک نے بھارت کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا بلکہ سعودی وزیر خارجہ اور امارات کے وزرائے خارجہ نے ستمبر ۱۹ کے پہلے ہفتے میں اسلام آباد میں عمران خان پر زور دیا کہ وہ مسئلہ کشمیر کو امت مسلمہ کا مسئلہ نہ بنائیں اسے مقامی مسئلہ رہنے دیں سوال یہ ہے کہ ۵ اگست سے پہلے کیا کشمیر میں امن و امان تھا سب کچھ اچھا تھا اس وقت پاکستانی قوم اور ریاست کیا کر رہی تھی یہ مسئلہ ۵ اگست سے پہلے مسئلہ کیوں نہ تھا ۵ اگست کے بعد اچانک مسئلہ کیسے بن گیا جناب شاہ نواز فاروقی اس موضوع پر کوئی کلام نہیں کیا؟

.حامد میر نے اپنے پروگرام میں بتایا کہ مسلم وزرائے خارجہ کشمیر کو امت مسلمہ کا مسئلہ تسلیم نہیں کرتے دوسری جانب انھوں نے یہ بھی بتایا کہ DG ISPR میجر آصف غفور نے بتایا کہ بھارتی مودی صرف کشمیر میں ظلم نہیں کر رہا بلکہ ہندوستان کے بیس کروڑ مسلمانوں کو ہندو زور زبردستی بنانا چاہتا ہے انہوں نے سوال کیا کہ یہ مسئلہ امت کا مسئلہ ہے یا نہیں (جنگ کراچی ۵ ستمبر ۲۰۱۹) ہمارا سوال یہ ہے کہ چین میں بیس لاکھ مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ امت کا مسئلہ ہے یا نہیں شاہ نواز صاحب اور پاکستان کی اسلامی جماعتوں نے چین کے مسلمانوں کو کیا امت سے الگ رکھا ہے کیا ہماری تمام اسلامی تعبیرات، تشریحات صرف علاقائیت، مقامیت، قومیت کے تناظر میں ڈھل چکی ہیں کشمیر کے مسلمان ہمارا مسئلہ ہیں مگر سری لنکا

، بنگلہ دیش، آسام چین، برما کے مظلوم مسلمان ہمارا مسئلہ کیوں نہیں ہیں جہاد صرف کشمیر کے لیے ہے ان سب ممالک کے لیے کیوں نہیں ہے قوم پرستی، قومی ریاست اور مسلم قوم پرستی نے آج ہمیں کس حال تک پہنچا دیا ہے شاہ نواز صاحب نے اس موضوع پر بھی امت کی راہنمائی نہیں کی ہم امت کا دعویٰ کرنے کے باوجود مقامیت، علاقائیت، پاکستانیت سے بلند کیوں نہیں ہو سکے قومی ریاست نے ہر مذہبی آدمی اور ہر مذہبی جماعت کی وفاداری کو مقامی، قومی علاقائی، جغرافیائی کر لیا ہے یہ قوم پرستی کی کامیابی ہے یا اسلامیت کی کامیابی شاہ نواز صاحب اس موضوع پر بھی کچھ لکھیں کہ ہم کہاں پہنچ گئے ہیں۔

۔ یہ کہنا کہ بھارت 20 کروڑ مسلمانوں کو ہندو بنایا جا رہا ہے ایک بیان ہے سوال یہ ہے کہ لیاقت نہرو پیکٹ نے کیا اس منصوبے کو ممکن بنانے میں کوئی کوئی کردار ادا کیا یا نہیں تقسیم ہند کے بعد یہ کس نے کہا تھا جو اُدھر ہے وہ اُدھر ہی رہے جو اِدھر ہے وہ اِدھر رہے لیاقت نہرو پیکٹ کے ذریعے ہندوستان میں رہنے والے تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ان کی حفاظت بقا اور ارتقاء کا بوجھ نہرو کے کاندھے پر نہایت اعتماد کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی جان عزت ایک ہندو نہرو کے سپرد کی گئی تو کسی کو شرم نہیں آئی کسی نے احتجاج نہیں کیا اگر ہندوستان میں مسلمان محفوظ تھے تو پاکستان کی کیا ضرورت تھی اگر ہندو اتنے ظالم تھے تو مسلمانوں کے لیے پاکستان کے دروازے کیوں نہیں کھولے گئے ظالم کون ہے وہ یا ہم یا دونوں؟ پاکستان کی سرحدیں ہندی مسلمانوں کے لیے ہمیشہ کے لیے بند کر دی گئی تھیں شاہ نواز صاحب نے کبھی اس سفاکی پر تنقید نہیں کی قائداعظم نے کہا تھا کہ پاکستان اس وقت بن گیا تھا جس دن پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا قائداعظم سے کسی نے نہیں پوچھا کہ جب پاکستان ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ہے تو یہ سرحدیں مسلمانوں پر کیوں بند کر دی گئی ہیں تحریک پاکستان میں مفتی محمد شفیعؒ کا تین سو صفحات کا فتویٰ تقسیم کیا گیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے پاکستان دارالاسلام اسے ووٹ دو یہ فتویٰ ستر سال کے بعد مفتی صاحب کے فتاویٰ ''جواہر الفقہ'' میں شائع ہو گیا ہے ستر سال تک قوم کو اس فتوے کا علم ہی نہیں ہوا کسی

نے لیاقت نہرو پیکٹ کے وقت ریاست پاکستان سے نہیں پوچھا کہ اس فتوے کی روشنی میں دارالاسلام کی سرحد بند نہیں کی جاسکتی تم نے قائداعظم کی جس تقریر کی بنیاد پر پاکستان کا دعویٰ کیا تھا کہ مسلمان کی تاریخ، تہذیب، اقدار، روایات، دین، معاشرت سب کچھ الگ ہے لہٰذا انہیں ایک الگ ملک کی ضرورت ہے پاکستان حاصل کرنے کے لیے قائداعظم کا طریقہ کار آفاقی اسلامی عالمی ہوگیا لیکن پاکستان اگست میں وجود میں آتے ہی مقامی، علاقائی، جغرافیائی اور قومی ہوگیا، قومی ریاست میں تبدیل ہوگیا اور قومی ریاست نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اپنے دروازے بند کردیئے کہ تم ہندوستان میں ہی رہو تو سوال یہ ہے کہ ہندی مسلمان اگر مذہبی طور پر ہندوستان میں آزاد تھے تو پاکستان کس کے لیے حاصل کیا گیا تھا شاہ نواز صاحب بار بار اپنے کالموں میں پاکستان کو ایک معجزہ قائداعظم کی شخصیت کو ایک بے مثال اور باکمال ہستی کے طور پر پیش کرتے ہیں تو وہ ان سوالوں کا جواب دیں کہ دارالاسلام پاکستان قائداعظم کی زندگی میں آفاقی عالمی اسلامی امارت سے قومی علاقائی مقامی جدید ریاست میں کیوں تبدیل ہوگیا؟ یہ کون سا معجزہ تھا اور اس معجزہ قوم پرستی کی اسلامی دلیل کیا ہے؟

۔ شاہ نواز صاحب بار ہا عمران خان اور ان کی پارٹی PTI کو پاکستان دشمن، یہودی ایجنٹ، قادیانی نواز، فوجی پٹھو قرار دیتے ہیں سوال یہ ہے کہ شاہ نواز صاحب کی جماعت اسلامی PTI یہودی جماعت کے ساتھ پانچ سال تک صوبہ خیبر پختونخوا میں اقتدار میں رہی تو کیا اس وقت PTI یہودیوں کی، لبرل سیکولر کی، اسٹیبلشمنٹ کی جماعت نہیں تھی جماعت اسلامی یحییٰ خان، ضیاء الحق اور مشرف کی فوجی آمریتوں کے ساتھ سیاسی اتحاد میں شامل رہی تو کیا ہم جماعت اسلامی کو ان سیاسی اغلاط کی بنیاد پر عسکری اشرافیہ کی جماعت اور اسلام دشمن جماعت کہہ سکتے ہیں شاہ نواز صاحب اس بارے میں قوم کی اور جماعت اسلامی کی راہنمائی فرمائیں۔

۳۴۔ جناب سراج الحق صاحب نے فرمایا ہے کہ 2018 کا الیکشن اسلام اور اسلامی تحریکوں کے خلاف

استعمال کیا گیا (جسارت ۹ستمبر ۲۰۱۹) سوال یہ ہے کہ اس الیکشن کو کس قوت نافذہ، کس ادارے نے اسلام اور اسلامی تحریکوں کے خلاف استعمال کیا؟ مولانا فضل الرحمان کا دعویٰ ہے کہ PTI کو فوج نے کامیاب کروایا وہ فوج کے خلاف تقریریں کرتے رہے انہوں نے کہا کہ اگر پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت اہم نہیں ہے تو ہمیں اس کی جغرافیائی سرحدوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے سلیم صافی کو دیا گیا انٹرویو سنسر ہوگیا مختلف کالم نگاروں کی تحریروں اور سابق فوجی افسران کے بیانات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ 1962 سے لے کر اب تک انتخابات کے نتائج فوج ہی کنٹرول کرتی ہے اور جماعت اسلامی اور جسارت کے تمام اداریوں میں ہمیشہ پاکستانی افواج کے شانہ بشانہ جدوجہد کا اعادہ کیا جاتا رہا تو سوال یہ ہے کہ اسلام کے خلاف کون ہے کون سی قوت ہے اور کہاں ہے کیا سراج الحق صاحب کا بیان محض خطابت ہے یا حقیقت بھی ہے؟ ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ سیاسی عمل میں مذہبی جماعتوں کی شرکت اسلامی انقلاب کو ممکن بنا رہی ہے یا ناممکن؟ قاضی حسین احمد سہیل وڑائچ کو انٹرویو پڑھ لیں۔

۔ جناب قاضی حسین احمد صاحب نے جنگ اخبار کے کالم میں لکھا تھا کہ انتخابات منصفانہ نہیں ہوتے اگر عادلانہ انتخابات ہوں تو تمام لوگ مذہبی جماعتوں کو ہی منتخب کریں گے وہ کراچی تشریف لائے تو ہم نے ایک پروگرام میں ان سے سوال کیا کہ اس صورتحال میں آپ انتخابی عمل میں کیوں شریک ہیں پہلے آپ انتخابات کے نظام اور اسے نافذ کرنے والوں کی اصلاح کرلیں تب اپنی قوتیں دولت طاقت سیاسی عمل میں استعمال کرلیں تو کہنے لگے کہ ہم کامیاب ہو کر تبدیلی کا کام کریں گے ہم نے عرض کیا جب آپ کی کامیابی عادلانہ انتخابات سے مشروط ہے تو یہ عدل کون فراہم کرے گا اگر آپ منتخب ہو گئے تو پھر تو مسئلہ خود حل ہو جائے گا شاہنواز صاحب اس مسئلے میں بھی جماعت اسلامی کی راہنمائی فرمائیں یہ کیا ہے؟ پہلے اصلاح ہوگی یا پہلے الیکشن ہوں گے ایسے الیکشن میں جماعت اسلامی کیسے کامیاب ہوگی؟

۔ پاکستان میں امریکی اثرورسوخ کا یہ عالم ہے کہ یو ایس سنٹرل کمانڈ کے کمانڈر نے تربیلا ڈیم کا

معائنہ کیا اور اس کے لیے دی گئی 41 ملین ڈالر کی امریکی امداد کو تربیلا کی زندگی اور صلاحیت کار میں اضافہ کرنے کے امور پر بات چیت کی DAWN نے ۸ ستمبر کو خبر دی

Centcom Commandar briefed at Tarbela on Power Generation

جو ملک اپنے ڈیم، بجلی کے لیے امریکہ کا محتاج ہو جس کی ترقی 1948 سے 2019 تک صرف اور صرف امریکی، یورپی روپے پیسے ہوئی ہے کیا وہ ملک امریکہ کی مرضی کے خلاف کوئی کر سکتا ہے شاہ نواز صاحب بار بار اسلامی تاریخ اور اسلامی تاریخ کی ترقی اور خاص طور پر سائنسی ترقی کا تذکرہ کرتے ہیں ہمارا سوال شاہ نواز صاحب سے یہ ہے کہ

الف۔ اس وقت پوری دنیا میں ترقی کا کوئی ایسا ماڈل ہے جو قرضے، سود، سٹے، بھیک ، خیرات کے بغیر کام کر رہا ہے؟

ب۔ ترکی، ایران، سعودی عرب سے لے کر امریکہ چین تک جاپان، جرمنی برطانیہ روس اور یورپی ممالک صرف اور صرف قرضوں میں جکڑے ہوئے ہیں تفصیلات کے لیے صرف ایک کتاب دیکھیے۔

N.Furguson The Great Degenration

ج۔ کیا دنیا کی کسی تہذیب، علمیت میں ترقی کی اصطلاح استعمال ہوئی ترقی کی اصطلاح کسی تہذیب میں نہیں تھی تو اسلام میں اور اسلامی تحریکوں کے لٹریچر میں کہاں سے آ گئی۔ خمینی، اربکان، اردگان ، شاہ فیصل، مہاتیر محمد سے لے کر تمام اسلامی تحریکیں ترقی کی مغربی اصطلاح کو کیوں اختیار کر چکی ہیں؟

د۔ ترقی کی اصطلاح سب سے پہلے امریکی صدر نے 1956ء میں استعمال کی G.Rist کی تحقیق کے مطابق دنیا کی کسی تہذیب میں ترقی کی اصطلاح موجود ہی نہیں تھی نہ ترقی کا عقیدہ ___ ترقی کے عقیدے کا مطلب ہے حاضر و موجود سے بے زاری ___ نفس مطمئنہ سے دست برداری ___ ھل من مزید کی کیفیت ___ شاہ نواز صاحب تین کتابوں کا مطالعہ فرمائیں اور ترقی کی اصطلاح کا استعمال ترک کر دیں۔

1.The Development Dictionary
2.History of Development
3.The Delusions of Economics

ان تینوں کتابوں کی E- Copy انھیں ارسال کی جا رہی ہیں

۔ شاہ نواز صاحب بار بار پاکستان کو اسلام کی تخلیق ثابت کرتے ہیں یہ کیسی اسلامی ریاست ہے جو اپنے پہلے دن سے لے کر آج تک امریکہ برطانیہ مغربی ریاستوں کے قرضے پر چل رہی ہے قائداعظم نے پہلا خط امریکی امداد کے لیے لکھا تھا دو کروڑ تنخواہ کے لیے مانگے تھے اس کے بدلے شمال کی سرحد پر سرخ خطرے کے خلاف امریکہ کا حلیف خادم بننے کا وعدہ کیا تھا۔

شاہ نواز صاحب خرم جاہ مراد کی کتاب ''اسلام اور مغرب'' میں ان کا لکھا گیا ترجمان القرآن کا اداریہ ''پاک امریکہ تعلقات'' پڑھ لیں۔ بہتر ہے کہ فاروقی صاحب ترجمان کا رسالہ منگوا کر اصل اداریہ پڑھ لیں۔

شاہ نواز صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ریاست پاکستان ہر روز سودی قرضے 1947ء سے لے رہی تھی ۔ جنرل یحییٰ خان، ضیاء الحق اور مشرف کے دور میں بھی یہ قرضے لے رہی تھی۔ جناب سراج الحق صوبہ خیبر پختونخواہ کی کابینہ کے وزیر خزانہ تھے تو وہ بھی IMF سے قرضے لے رہے تھے لیکن وہ ایک غیرت مند آدمی ہیں لہذا انھوں نے اپنی ایک تقریر میں قوم کو صاف صاف بتایا کہ IMF قرضے دیتا ہے تو مفت میں نہیں دیتا اپنی شرائط پر دیتا ہے اپنے اصولوں کے مطابق دیتا ہے سراج الحق صاحب نے کہا ''ایک ہے سنی سنائی بات لیکن علم الیقین اور حق الیقین کی بنیاد پر میں بات کرتا ہوں 2003-04 کے بجٹ میں ورلڈ بینک نے ہمیں پانچ ارب روپے دینے کا وعدہ کیا تھا اسکو ہم نے بجٹ کا حصہ بنایا پانچ چھ مہینے گزر گئے وہ پیسے جب نہیں ملے تو ورلڈ بینک کا کنٹری ڈائریکٹر تھا جان وال (John Wall) اس کا نام

تھا وہ پشاور آئے میں فنانس منسٹر کی حیثیت سے اس سے ملا۔ میں نے اسے بولا جان وال جو قسط آپ نے دینی تھی وہ ابھی تک نہیں ملی اس کی وجہ سے ہمارے سارے ترقیاتی کام رک گئے ہیں۔ وہ ہنس پڑا اور کہا کہ یہ جو تم نے پشاور میں خواتین کے بل بورڈ پر تصاویر تھیں وہ ہٹائیں ہیں کیا اس کے باوجود بھی آپ ہم سے پیسے لینا چاہتے ہیں؟ میں نے اس سے کہا کہ جان وال ہمارے قرضے اور خواتین کی تصاویر پر مشتمل بل بورڈ کو ہٹانے کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ وہ ہنس پڑے تو اس نے کہا کہ اگر قرض لینا ہے تو (Culture) بھی لینا پڑے گا، خارجہ پالیسی (Foreign Policy) بھی لینی پڑے گی، داخلہ پالیسی (Interior Policy) بھی لینی پڑے گی اور تعلیمی پالیسی (Education Policy) بھی لینا پڑے گی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ پیسہ ہمارا ہو اور نظریہ، عقیدہ اور ثقافت تمہاری ہو؟ ایسا ممکن ہی نہیں اس نے کہا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا یا عقیدہ اور نظریہ رکھ لو یا ہمارے پیسے رکھ لو۔ مجھے یہ یقین ہوگیا کہ یہ قرضے قوموں کو اٹھانے کے لیے نہیں بلکہ قوموں کو غلام بنانے کے لیے ملتے ہیں'' پاکستان پہلے دن سے امریکی پالیسی پر چل رہا ہے قائداعظم سے لے کر جنرل ضیاء الحق تک کے زمانے کی کی خط وکتابت شائع ہوچکی ہے شاہ نواز صاحب وہ پڑھ لیں

K.Arif: Pak America Relation [2 Voulme]

اس کتاب کی دوسری جلد کے آخر میں ان قرضوں، سود، بھیک، امداد، خیرات، صدقات، احسانات کی تفصیل بھی ہے اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ملیریا کی بیماری ختم کرنے کے لیے امریکہ نے بھاری امداد دی حالانکہ یہ ہمارے جنگلات کاٹنے، ڈیم بنانے، صنعتی انقلاب برپا کرنے اور ماحولیات تباہ کرنے کے باعث پیدا ہوئی اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی سالوں تک پاکستان کا پچاس فی صد بجٹ فوجی اخراجات پر خرچ ہوتا تھا۔ شاہ نواز صاحب یہ بتائیں کہ جو ملک قرضے سود، سٹے پر چل رہا ہے وہ جہاد کیسے کرسکتا ہے؟

یہ قرضے بابائے قوم نے لیے ہیں ان کے زمانے سے قرضوں کا نظام چل رہا ہے اگر پاکستان معجزہ ہے تو یہ کیسا معجزہ ہے کہ بابائے قوم نے امریکی صدر کے نام پہلے خط میں لکھا کہ۔ **"امداد کے لیے ہم سب سے پہلے آپ کی طرف اور پھر برطانیہ کی طرف دیکھتے ہیں۔'** برطانیہ سے تو آپ نے آزادی حاصل کی تھی جس سے آزادی لی اس کے قرضوں کی غلامی کیوں قبول کی؟ کیا شاہ نواز صاحب نے بحیثیت گورنر جنرل بابائے قوم کا حلف نامہ پڑھا ہے یا نہیں ہے؟ زاہد حسین کی کتاب **"پاکستان کیسے بنا؟"** میں وہ حلف نامہ موجود ہے اس پر بسم اللہ لکھا گیا جسے کاٹ دیا گیا حلف اُٹھایا گیا کہ میں تاج برطانیہ کا وفادار رہوں گا___ کیا اسی کا نام معجزہ اور اسلام کی تخلیق ہے کیا اسلام ایسے حلف نامے تخلیق کرتا ہے؟

شاہ نواز صاحب یہ بتائیں کہ 1947ء میں آزادی ملی تھی یا صرف Transfer of Power کی بات ہوئی تھی قائداعظم نے جو حلف اُٹھایا تھا یا برطانیہ کی غلامی کا حلف؟ قائداعظم نے امریکہ سے قرضے اور امداد کی طلب___ پہلے دن سے ہم قرضے لے رہے ہیں کیوں کہ ترقی کرنا ہے جو بات سراج الحق صاحب کو معلوم ہے کیا وہ قائداعظم نہیں جانتے تھے یہ کیسی قیادت تھی جو سراج الحق صاحب جیسا موقف قرضوں کے بارے میں نہیں رکھ سکی یہی ہمارا معجزہ ہے کیا؟

شاہ نواز صاحب بھی اکثر سہواً منشور انسانی حقوق کی بعض شقوں کو اسلامی لکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امریکہ ان حقوق کی خلاف ورزی کر رہا ہے حالانکہ امریکہ خلاف ورزی نہیں کر رہا ۔ کانٹ کی تعریف کے بعد مسلمان انسان کہلانے کے مستحق نہیں۔ حقوق انسان کے ہوتے ہیں _ اللہ، آخرت، کتاب اللہ ، رسول اللہ کو ماننے والوں کے نہیں ہوتے مسلمان کافر ہو جائیں یعنی انسان بن جائیں تو امریکہ ان کو کچھ حقوق دے گا لیکن کتاب اللہ کو ماننے والے اور خارجی ذریعہ علم سے روشنی لینے والا تو انسان ہی نہیں ۔ بعض اسلامی تحریکوں کے رویے میں نئی تبدیلی یہ ہے کہ وہ انقرہ، استنبول، جدہ، ریاض، تہران، کوالالمپور

کے ماڈل کو اسلامی ترقی اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے ماڈل کے طور پر پیش کر رہی ہیں مدینہ کا نام بھی ترقی کے ماڈل سے نکل گیا صرف عمران خان سیاست کے لیے ریاست مدینہ کا نام استعمال کر رہے ہیں اکثر اسلامی تحریکوں کے لیے اب ترکی انقلاب کی علامت ہے جو NATO ISLAMISTS ہے شاہ نواز صاحب اس موضوع پر بھی رہنمائی فرمائیں۔

نوٹ: مضمون جاری ہے قسط نمبر ۳ عنقریب جاری کی جائے گی

کے خلاف کاروائیوں ___ کی بنیاد پر ہے سوال یہ ہے کہ ان تمام کاروائیوں میں کون سی دلیل قدر مشترک جو عالمی قدر کے طور پر کام کر رہی ہے سوال یہ ہے کہ اسلامی تحریکیں اور علماء کرام اس دلیل کے خلاف آواز کیوں نہیں اُٹھا رہے جس دلیل کو پروان چڑھانے میں پاکستان اور مسلم ممالک کا سب سے بڑا ہاتھ ہے؟

۵۔ شاہ نواز فاروقی صاحب نے کہا ہے کہ پاکستان کو اب بھارت کے خلاف حتمی جہاد کا اعلان کر دینا چاہیے وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا کشمیر پر پاکستان کی جنگ بین الاقوامی برداری لڑے گی وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں جب سے بھارت نے کشمیر ہڑپ کیا ہے ہمارے حکمران دربدر پر دستک دے رہے ہیں ان کی حکمرانوں سے اپیل ہے کہ وہ اپنی ساٹھ سالہ حکمت عملی بدلیں ان کا خیال ہے پاکستان 65 کروڑ مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز ہے ان کی رائے میں مشرق وسطی کے مسلمانوں کو بھی علم نہیں کہ ان کی آزادی اور سلامتی کی ضمانت بھی پاکستان ہے شاہ نواز فاروقی صاحب امت کو انتباہ کرتے ہیں کہ پاکستان نہیں ہوگا تو پورا مشرق وسطی ، اسرائیل اور بھارت کے درمیان سینڈوچ بن جائے گا ان سے چند سوالات ہیں

ا۔ ان کا یہ کہنا کہ پاکستان برعظیم پاک و ہند کے 65 کروڑ مسلمانوں کی آخری امید ہے تو سوال یہ ہے کہ لیاقت نہرو پیکٹ کس امید پر کیا گیا تھا اس پیکٹ کے تحت تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی حفاظت کی ذمہ داری ایک ہندو نہرو کے سپرد کی گئی تھی — یہ کام مسلمانوں کی نمائندہ جماعت، جس کا نعرہ قیام پاکستان سے پہلے ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' ، مسلم لیگ نے اور پاکستانی ریاست نے کیا تھا اس پیکٹ کے بعد ہندوستان اور کشمیر کے مسلمانوں کی امیدوں کے لیے واحد سہارا وزیر اعظم ہندوستان کو کیوں بنایا گیا تھا کیا یہ پیکٹ درست تھا؟

انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ 65 کروڑ مسلمانوں کی امیدوں کے مرکز پاکستان نے ان ڈھائی لاکھ بہاریوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو بنگال میں دوقومی نظریے اور پاکستان کے پرچم کی جنگ لڑ رہے تھے لیکن اسی امیدوں کے مرکز پاکستان نے چالیس لاکھ قانونی افغانی مسلم بھائیوں کو صرف اس لیے قبول کر لیا کہ ان کے ساتھ صرف ہجرت کا ایمان نہیں ڈالر بھی آ رہے تھے پاکستان میں رہنے والے روہنگیا مسلمانوں کو پاکستان

نے آج تک شہریت نہیں دی وہ اجنبی بن کر رہ رہے ہیں جنرل ضیاء الحق نے بہاریوں کو پاکستان لانے کے مطالبے پر کہا تھا کہ یہ بہاری نہیں بھکاری ہیں ۔ کراچی میں رہنے والے پاکستانی بنگالیوں کے لیے شناختی کارڈ کے اجراء میں رکاوٹیں کھڑی کی جارہی ہیں کہ تم تو بنگالی ہو پاکستانی نہیں یہ سلوک ریاست کا ان سے ہے جو ریاست کے وفادار ہیں ۔

۶۔ شاہ نواز صاحب نے یہ بھی کہا کہ بھارت کے کشمیر پر قبضے کے بعد پاکستان امریکہ کے در پر بھیک مانگ رہا ہے یہاں سوال یہ ہے کہ کیا شاہ نواز صاحب کی تحقیق کے مطابق کشمیر کو بھارت نے 5اگست 2019 کو ہڑپ کیا یا 1947 میں ہی ہڑپ کر لیا تھا یا شملہ معاہدے کے وقت ہڑپ کر لیا تھا جب کنٹرول لائن بنائی گئی تھی کیا شاہ نواز صاحب 5اگست 2019 سے پہلے کشمیر کو آزاد، خود مختار اسلامی ملک سمجھ رہے تھے جو کالونی بن گیا لہذا اب وہ اعلان جہاد کر رہے ہیں ۔

۷۔ شاہنواز صاحب نے یہ بھی کہا کہ اسلام نے پاکستان کو تخلیق کیا اور اسلام ہی پاک بھارت کشمکش میں پاکستان کو فیصلہ کن غلبہ دلا سکتا ہے سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان انٹرنیشنل اسٹیٹ ڈسکورس کو مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ جدید رریاستی ڈسکورس میں اپنی ساورنٹی [Sovereignty] اور دوسرے ملک کی ساورنٹی [Sovereignty] کو برابر کی سطح پر تسلیم کرنے کا نام ہے سوال یہ ہے کہ قانون بین الاقوام میں قومی ریاستوں کے اس ڈسکورس کو تسلیم کرنے کے بعد جس کا اظہار لیاقت نہرو پیکٹ میں بھی کیا گیا بھلا جنوبی ایشیاء میں کون سے فیصلہ کن غلبے اور کون سے جہاد کی بات ہو رہی ہے کیا اس ڈسکورس کو قبول کرنے کے بعد جہاد ہو سکتا ہے؟

امریکہ کا افغان طالبان سے مذکرات میں بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ طالبان افغانی ساورنٹی [Sovereignty] اور دوسرے ممالک کی ساورنٹی کو تسلیم کرنے کا اعلان کریں اس شق کا مفہوم یہ ہے کہ طالبان افغانستان کی سرزمین کو دنیا کے کسی دوسرے ملک کے خلاف استعمال نہیں ہونے دیں گے یہ فیصلہ اسی اصول کا نتیجہ ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ افغان طالبان نے امریکہ کی اس احمقانہ دلیل کے جواب میں یہ بھی نہیں کہا کہ کیا لبرل

ازم بھی ہر ریاست کی ساورنٹی [Sovereignty] کو تسلیم کرتا۔ ہے دنیا میں State Sovereignty کے لیے سب سے بڑا خطرہ لبرل ازم ہے یا اسلام ہے انہوں نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ نے کس کس ریاست کی ساورنٹی کو پامال نہیں کیا کیا پاکستانی ریاست کو NATO سپلائی اور افغان مسلمانوں پر بمباری کے لیے استعمال نہیں کیا گیا؟

کیا یہ لبرل ازم کو یہ اختیار ہے کہ دنیا کی کسی بھی ریاست کی ساورنٹی کو چیلنج کر دے اس پر حملہ کرے اس پر معاشی پابندی لگائے لیکن صرف تمام اسلامی اور جہادی تحریکیں اس اصول کی پابندی کریں کہ وہ صرف اپنی اپنی ریاستوں کی ساورنٹی کو تسلیم کریں اپنے جغرافیائی علاقائی خطوں تک محدود رہیں۔

امریکہ لبرل ازم کا سربراہ ہے لہذا امریکہ کو یہ حق ہے کہ وہ UNO اور NATO کے نام پر Transnational دہشت گردی کرے لیکن جہادی اسلامی تنظیموں اور اسلامی حکمرانوں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ Transnational کاروائیاں کر سکیں۔ جہادی تحریکوں کو پہلے یہ ثابت کرنا ہے کہ ان کی جدوجہد علاقائی، قومی، مقامی ہے یا مقامی اسلام کے لیے ہے۔ ان کے کوئی عالمی مقاصد نہیں کہ وہ عالمی جہاد کے قائل ہیں کیا طالبان کی جانب سے اس اصول کو مذاکرات میں تسلیم کیے جانے کا مطلب لبرل ازم کو عالمی سطح پر واحد اجارہ دار قوت Ultimate Sovereign تسلیم کرنے کے مترادف ہے یا نہیں کیا USA مسلمانوں پر اسی طریقے سے دنیا بھر میں دہشت گردی کرتا رہے تو کیا پھر بھی طالبان کسی صورت میں افغانستان کی سرزمین کو آئندہ کبھی امریکہ یا کسی اور ریاست کے خلاف استعمال نہیں ہونے دیں گے اور ان کی تمام جدوجہد، اختیار، اقتدار، قومی، مقامی اور علاقائی ہوگا؟ طالبان امریکہ کے برابر بیٹھ کر بھی مذاکرات میں پسپا ہو گئے

USA نے جب افغانستان پر حملہ کیا تو صرف اس کی ایک دلیل دی کہ افغان سرزمین سے القاعدہ نے امریکہ کی ساورنٹی پر حملہ کیا افغانوں کی زمین استعمال ہوئی انھوں نے اسامہ کو پناہ دی پاکستان پر ڈرون حملے کی بھی یہی وجہ تھی لہذا افغانستان، پاکستان اور سلالہ پر حملہ ضروری ہے کیا اسی اصول کے تحت فلسطین کی

جہادی تحریکیں امریکہ پر حملہ کر سکتی ہیں کہ امریکہ اسرائیل کو اسلحہ دے رہا ہے اس کی زمین اسرائیل کو مضبوط ، مستحکم اور متحرک کرنے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

امریکہ نے کہا تھا کہ جہاں دہشت گرد چھپے ہوں گے اس سرزمین پر ہم حملہ کریں گے جہاں سے دہشت گردوں کی مدد ہوگی وہاں بھی حملے کریں گے پاکستان افغانستان، شام پر حملے اس اصول کے تحت ہوئے تو کیا جہادی تحریکیں بھی اسی اصول کے تحت امریکہ پر حملہ آور ہو سکتی ہیں یا نہیں شاہ نواز صاحب نے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

طالبان نے امریکہ سے یہ سوال بھی نہیں کیا کہ ایک ملک کی سرزمین کو دوسرے ملک کی سرزمین کے خلاف استعمال کرنے اور ماورائے قوم جنگوں Transnational Wars کا ذمہ دار کون ہے؟ انہوں نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد مسلم دنیا کو ہی نہیں پوری دنیا کو عالمی طاقتوں نے قومی ریاستوں میں تقسیم کیا گیا اور لیگ آف نیشنز کے وقت سے قومی ریاستوں کو Ultimate Reality کے طور پر قبول کیا گیا تو اسٹیٹ ساورنٹی کے اصول پر قائم اس نظام کو سب سے پہلے توڑنے والا ملک تو امریکہ ہے جب 9/11 کے بعد امریکہ نے پوری دنیا کو ایک ابدی میدان جنگ میں تبدیل کر دیا تو صرف اسلامی جہادی تحریکوں اسلامی حاکمیت سے ہی یہ مطالبہ کیوں ہے کہ تم اپنی جہادی اسلامی کاروائیاں صرف اپنی قومی جغرافیائی سرحدوں تک محدود رکھو طالبان نے مجاہدین کے مقدمے کو عالمی مسئلہ نہیں بنایا — امریکہ کے برابر بیٹھے مگر ہار گئے۔ انہوں نے پسپائی اختیار کی۔ کیا طالبان نے اپنے الحق سے دست بردار ہو کر لبرل ازم کے الحق کو یا امریکہ کی بالادستی کو قبول کر لیا ہے؟

ہمارا سوال شاہ نواز صاحب سے صرف یہ ہے کہ جب عالمی جہادی تحریک طالبان نے ہی عالمی جہاد سے رجوع کر لیا خود کو مقامی، علاقائی، جغرافیائی افغانی قومی خطے تک محدود کر لیا ہے اور تمام گروہوں سے صلح کا اعلان بھی کر دیا ہے تو وہ پاکستان کی قومی ریاست سے جہاد کی امید کس بنیاد پر کر رہے ہیں؟ یہ کم نظری کی انتہا نہیں ہے طالبان کے افسوسناک امن معاہدے کا تجزیہ معاہدے کی تفصیل کے بعد پیش کیا جائے گا

۸۔ ہمیں حیرت یہ ہے کہ شاہ نواز صاحب نے پاکستانی آئین کا مطالعہ بھی نہیں کیا جس کے آرٹیکل 245 میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اگر ریاست پاکستان کے خلاف کوئی ملک جارحیت کرے گا تو ریاست صرف اس جارحیت کا دفاع کرے گی۔

> **245.** Functions of Armed Forces.- 1[(1)] The Armed Forces shall, under the directions of the Federal Government, defend Pakistan against external aggression or threat of war, and, subject to law, act in aid of civil power when called upon to do so.

لہذا جب آئین پاکستان اور قومی اسمبلی نے ریاست کو جہاد کا اختیار ہی نہیں دیا نہ پاکستانی ریاست نے کبھی اپنے لیے جہاد کا اختیار طلب کیا تو شاہ نواز صاحب کس جہاد کی بات کر رہے ہیں یہ تو آئین پاکستان کے تحت ہی ایک غیر آئینی مطالبہ ہے اور شاہ نواز صاحب اس آئین کو بار بار اسلامی بھی تسلیم کرتے ہیں جبکہ آئین اسلامی نہیں ہوتا اور اس میں کوئی مذہبی اصطلاح تک استعمال نہیں ہوسکتی اسی لیے پاکستانی آئین میں قادیانیوں کے لیے ذمی، معاہد، کافر، مشرک، مرتد، ملحد زندیق کی نہیں — صرف اقلیت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ شاہ نواز صاحب نے اس طرف توجہ نہیں دی۔

۹۔ شاہ نواز صاحب نے کہا کہ USA اور UNO کو مشرقی تیمور اور دارفر کے مظلوم عیسائی فوراً نظر آجاتے ہیں مگر فلسطین، کشمیر کے مظلوم مسلمان ستر سال میں کبھی نظر نہیں آئے سوال یہ ہے کہ دنیا بھر میں اسلامی، مزاحمتی تحریکات کو دہشت گردی کے ساتھ کس نے نتھی کیا ہے عیسائیت تو بطور علمیت ختم ہو چکی ہے یا جدیدیت میں تحلیل ہو چکی ہے لہذا عیسائیت کا کہیں پیٹنا ایک مظلومیت کا ورق نہیں بن سکتا ہے لیکن جدیدیت کی اصل جنگیں اس وقت صرف گلوبل امپیریل ازم کے نام پر لڑی جارہی ہیں جس کا ہراول دستہ امریکہ اور یورپ نہیں بلکہ مسلم ریاستیں اور ان کی افواج ہیں۔ کیا شاہ نواز صاحب مصر کے حکمران جنرل سیسی کی اخوان المسلمون کے خلاف کاروائی اور بھارت کی کشمیر کے خلاف کاروائی میں کوئی فرق قائم کر سکتے ہیں کیا پاکستان نے بلوچستان کے قبائلی علاقے میں کرفیو نہیں لگایا اور لوگ لا پتہ نہیں ہوئے پاکستان کا بھارت

پر یہ اعتراض کہ وہ عام کشمیریوں اور دہشت گردوں میں فرق نہیں کرتا کیا اس فرق کو ہم نے اپنی سرحدوں میں قائم رکھا کیا طالبان اور عام قبائلی میں فرق روا رکھا گیا اگر رکھا گیا تھا تو پشتون تحفظ مومنٹ کے نام سے نیا تماشہ کیسے چل رہا ہے کیا شاہ نواز صاحب ہم کو بتانا پسند کریں گے کہ جس فوج کی سربراہی جنرل راحیل شریف کررہے ہیں وہ عالم اسلام کی حفاظت کے لیے تھی اور ڈاکٹر وہاب سوری صاحب کے بقول ترکی، سعودی عرب اور پاکستان مل کر ایک اسلامی فوج قائم کر رہے ہیں کیا شاہ نواز صاحب اس فوج تک یہ پیغام پہنچا سکیں گے کہ وہ کشمیر اور فلسطین میں جہاد کیوں نہیں کررہی۔ غیر مسلم ملک اس کا نشانہ کیوں نہیں اس کی جنگیں صرف عالم اسلام کے اندر کیوں ہیں باہر کیوں نہیں ہیں؟ شاہ نواز صاحب ایک قومی پاکستانی فوج سے جہاد کا مطالبہ کررہے ہیں مگر اس عالمی اسلامی فوج سے دشمن اسلام ممالک کے خلاف جہاد کا کیوں مطالبہ نہیں کررہے۔

ہمارے خیال میں اگر شاہ نواز صاحب ان سوالات پر غور کریں اور Forward Questioning کو ترک کر کے Reverse Questioning شروع کردیں تو ہماری رائے میں اس وقت وہ جدیدیت، ریاست، اور عالمی لبرل استعماریت کے بارے میں حقیقی آگہی خود تجربہ و تجزیے سے حاصل کرسکتے ہیں۔

۱۰۔ شاہ نواز صاحب نے لکھا ہے کہ پاکستان اور عالم اسلام نے کبھی جہاد نہیں کیا صرف جنگیں لڑی ہیں عرب اسرائیل جنگ، پاک بھارت جنگ، وغیرہ جہاد فی سبیل اللہ اور جنگ میں فرق ہے۔ انہوں نے پاکستانی فوج اور ریاست پر طنز کرتے ہوئے لکھا کہ عرصہ ہوا جہاد کا فرض افراد سے لے کر ریاست کو دے دیا گیا سب کو معلوم ہے کہ ہمارا مسئلہ اسلام اور جہاد ہے ہی نہیں ہمارے حکمران موت سے ڈرتے ہیں۔ ہمارے جرنیلوں نے بڑے ذوق وشوق سے جہاد کا حق ریاست کے حوالے کیا ہے وہ جہاد کو ریاست کے موثر ترین ہتھیار کے طور پر استعمال کریں جہاد نہیں کریں گے تو کل سب میدان حشر میں خدا کے سامنے منہ کے بل گھسیٹ کر گرا دیئے جائیں گے ، [فرائیڈے اسپیشل ۳۰ اگست ۲۰۱۹]

شاہ نواز صاحب یہ تجزیہ لکھتے ہوئے تین تاریخی حقیقتوں کو بھول گئے — 1965ء کی جنگ کے موقع پر ریڈیو پاکستان سے مولانا مودودی کی تقریر اور — انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے ڈاکٹر ضیاء الحق اور دیگر متجددین کا تحریر کردہ ''پیغام پاکستان'' کا غیر آئینی فتوی — مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کا جہاد ___ ۱۹۷۱۔

شاہ نواز صاحب لکھتے ہیں کہ پاکستان نے آج تک جہاد نہیں کیا — سوال یہ ہے کہ 1965ء کی جنگ کو شاہ نواز صاحب کے پیر و مرشد مولانا مودودی نے جہاد کیوں کہا اور پوری قوم کو یہ دعوت کیوں دی تھی کہ وہ ریاست اور فوج کے شانہ بشانہ اس جہاد میں حصہ لے — شاہ نواز فاروقی صاحب اسلام کے معاملے میں صرف مولانا مودودی کو کلی مقتدرہ Total Authority مانتے ہیں تو وہ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جہاد نہیں ہوا — کم از کم مودودی صاحب کی رائے میں جہاد ہوا — 1971ء میں مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی ڈاکٹر مالک کی عسکری کابینہ کی حصہ تھی اور مدینہ پاکستان کے مشرقی حصے کو بچانے کے لیے جماعت اسلامی نے سیاسی محاذ پر اور اسلامی جمعیت طلبا نے عسکری محاذ پر البدر اور الشمس کے نام سے بھارت اور عوامی لیگ کے خلاف جہاد کیا تھا — کیا وہ بھی شاہ نواز صاحب کی نظر میں جہاد نہیں تھا___ تو کیا قوم پرستی کی جدوجہد تھی۔ واضح رہے کہ ایوب خان نے 1960ء میں جسٹس شہاب الدین کی قیادت میں دستوری کمیشن قائم کیا۔ 1962ء میں کمیشن کی سفارشات شائع کی گئیں جسٹس شہاب الدین نے فوراً ہی اس آئین سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا مگر حکومت نے ان کا بیان شائع نہیں کرنے دیا یکم مارچ کو ایوب خان نے نئے دستور کا اعلان کیا نئے آئین میں ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان کے بجائے صرف جمہوریہ پاکستان رکھا گیا [یہ معلومات تاریخ جماعت اسلامی کے مولف محمود عالم صدیقی کے مضامین سے لی گئی ہیں جو جسارت میں شائع ہو رہے ہیں دیکھیے جسارت ۲۸ اگست ۲۰۱۹]

شاہ نواز صاحب سے ہمارا سوال یہ ہے کہ جس ملک نے خود کو اسلامی بھی نہیں کہا اس ملک کی بھارت سے 1965ء میں جنگ کو مودودی صاحب نے جہاد کیسے قرار دیا۔ جماعت اسلامی اور لبد اور الشمس نے مشرقی

پاکستان میں فوج کے شانہ بشانہ جو جنگ لڑی کیا وہ جہاد تھی یا نہیں کیوں کہ آئین تو 1962ء کا چل رہا تھا۔ 1973ء کے آئین میں پاکستان کے ساتھ اسلامی کا سابقہ اور لاحقہ استعمال کیا گیا۔ ۶۲ کا آئین تو اسلام کی قید سے آزاد تھا۔

''پیغام پاکستان'' کا فتوی انٹرنیشنل اسلاملک یونیورسٹی کے متجددین نے تخلیق کیا جس میں جہاد کا اختیار افراد سے لے کر پہلی مرتبہ ریاست کو دیا گیا — سوال یہ ہے کہ افراد کو جہاد کا حق کس نے دیا تھا؟ آزاد کشمیر پر قبضہ قبائلی علاقوں کے پٹھانوں نے کیا تھا وہ سری نگر پہنچنے والے تھے علامہ شبیر احمد عثمانی سعودی عرب سے جہاد کی حمایت کا اعلان لے کر آئے تھے لیکن جیسے ہی وہ پاکستان پہنچے لیاقت علی خان نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا___ قبائلیوں کی جنگ کیا تھی جہاد یا جنگ؟ حکومت نے مولانا مودودی پر جھوٹا الزام عائد کیا کہ وہ جہاد کشمیر کے مخالف ہیں کیوں کہ قومی ریاست تو جہاد کر ہی نہیں سکتی وہ تو صرف دفاع کرتی ہے لیکن مولانا نے اسے بھی جہاد ہی تسلیم کیا۔ مودودی صاحب نے اس الزام کی بار بار تردید کی یعنی ۴۷ میں بھی ریاست نے جہاد کیا۔

1973ء کے آئین میں ریاست نے اپنے لیے جہاد کا حق طلب ہی نہیں کیا ریاست نے اپنے لیے صرف دفاع کا حق طلب کیا جو اسے دے دیا گیا۔ آئین — منشور بنیادی انسانی حقوق سے نکلتا ہے لہذا وہ صرف سیکولر ہوتا ہے جدید ریاست کے آئین — کے بعد ریاست کا اصول یا قانون مذہبی نہیں ہوسکتا جدید ریاست اپنی اصل میں سیکولر ہے لہذا کسی ریاست کا آئین کوئی مذہبی اصطلاح قبول نہیں کرتا۔

ترکی میں نجم الدین اربکان نے ترکی سپریم کورٹ کی جانب سے اپنی حکومت کی برطرفی کے خلاف یورپین کورٹ آف ہیومن رائٹس UCHR میں اپیل کی کہ جمہوری حکومت کو برطرف نہیں کیا جاسکتا تو UCHR. نے اپیل مسترد کردی اور فیصلے میں لکھا کہ کہ اربکان ترکی کو ایک اسلامی ملک بنا رہے تھے۔ ۔انسانی حقوق کے منشور اور جمہوریت کے فلسفے کے تحت کسی جدید ریاست کا پبلک آرڈر مذہبی نہیں ہوسکتا یہ آزادی، مساوات کے عقیدے کے منافی ہے لہذا اربکان کی برطرفی بالکل درست ہے یورپی یونین کے سو سے زائد فیصلوں

میں منشور انسانی حقوق کے تحت مذہبی آزادی کی اصل حقیقت – اس کا درجہ اور اس کی حدود کا تعین کر دیا گیا ہے ہمارے شاگرد اور دوست جناب علی صاحب نے ہائیڈل برگ سے PHD کے مقالے میں ان فیصلوں پر ایک باب لکھا ہے وہ دیکھ لیجیے اور UCHR. کی ویب سائٹ پر ترکی والا فیصلہ پڑھ لیں

Rafah vs Turkey

ہمیں افسوس ہے کہ شاہ نواز صاحب نے ان تمام حقائق کو نظر انداز کر دیا ہے شاہ نواز صاحب ایک نہایت مخلص، صاحب ایمان، اور غیرت مند مفکر ہین لیکن ان کے نتائج فکر سے ہمیں اتفاق نہیں ہے – کشمیر، عالم اسلام، اور شام کے موضوع پر ہمارے محترم دوست جناب اوریا مقبول جان صاحب بھی کم و بیش وہی موقف رکھتے ہیں جو شاہنواز صاحب کا ہے لہذا ان کے فکر پر بھی ہمارے وہی سوالات ہیں جو شاہ نواز صاحب سے کیئے گئے امید ہے وہ ان سوالات کا جواب دیں گے۔

۱۱۔ شاہ نواز صاحب کا تجزیہ بتاتا ہے کہ عالم اسلام گزشتہ سو سالوں میں بار بار اس لیے شکست کھاتا رہا کہ وہ جہاد کی بجائے جنگ کرتا رہا اگر عالم اسلام جہاد کو اختیار کرتا تو اسرائیل، بھارت، امریکہ سب کو شکست ہوتی اصل مسئلہ جنگ اور جہاد کی اصطلاح، روحانیت، علمیت سے مسلم ممالک کی لاتعلقی ہے ہمارے خیال میں یہ تجزیہ بھی درست نہیں ہے کیوں کہ بہت سی قوموں نے اپنے قومی، مقامی، علاقائی مفاد کے لیے امریکہ جیسے ملک سے جنگیں لڑیں اور کامیاب ہوئے کیوبا، ویت نام، ہوچی منہ، کاسترو اس کی ایک مثال ہیں گیلی پولی کے معرکے میں مصطفے کمال اتاترک نے جو سیکولر تھا اسلام کا دشمن تھا اللہ تعالی کو گالیاں دیتا تھا اس نے مغرب کے ممالک کو عبرت ناک شکست دی۔ برنارڈ لیوئس نے لکھا ہے کہ گزشتہ دو سو سالہ تاریخ میں – اتاترک کی فتح ___ مسلمانوں کی پہلی فتح تھی – ایک سیکولر لبرل اسلام دشمن مسلمان بھی غیرت اور جرات کے جذبے سے سرشار ہو تو وہ قوم پرستی، وطن پرستی کے لیے لڑ سکتا ہے اور کامیاب بھی ہو سکتا ہے مسلم حکمران اگر غیرت مند ہوتے تو وہ جنگ کر کے بھی اتاترک کی طرح کامیابی حاصل کر سکتے تھے۔

شاہ نواز صاحب نے لکھا ہے کہ عرصہ ہوا جہاد کا حق افراد سے لے کر ریاست کو دے دیا گیا ان کا یہ تجزیہ بھی

درست نہیں ہے کیونکہ ریاست کے آئین میں دفاع کی اصطلاح موجود ہے جہاد کی اصطلاح سرے سے موجود نہیں انفرادی جہاد کی حقیقت یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد قبائلی علاقے کے مجاہدین نے قائداعظم کے حکم پر کشمیر پر قبضہ کرلیا تھا اور اس جدوجہد کو قبائلیوں نے جہاد کے عنوان سے موسوم کیا تھا۔

1965ء میں ریاست نے جہاد کا اعلان نہیں کیا تھا لیکن مولانا مودودی نے اسے جہاد قرار دیا تھا لہذا پاکستانی ریاست نے نجی جہاد کے ان اعلانات پر اعتراض نہیں کیا اور اس قسم کے نجی جہاد کی سرپرستی کی۔ ریاست کی جانب سے 1947ء سے لے کر 2000 تک ہونے والے نجی جہادوں کے راستوں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی گئی یہ بھی ایک حکمت عملی تھی۔

چین میں 20لاکھ مسلمانوں کو تربیت کے نام پر قید خانوں میں رکھا گیا ہے تاریخ انسانی میں اتنی بڑی تعداد کو قید کرنے کی کوئی مثال نہیں ملتی اس پر پاکستان اور عرب ممالک کا کیا ردعمل ہے شاہ نواز صاحب نے اس ظلم پر پاکستانی ریاست کو چین سے تعلقات ختم کرنے اور جہاد کرنے کی دعوت کیوں نہیں دی؟ برما نے روہنگیا مسلمانوں کو ملک بدر کردیا یہ کام چین کی ہدایت پر ہوا جس صوبے میں روہنگیا مسلم آباد تھے وہ زرخیز اور مادی معاشی لحاظ سے مالا مال خطہ ہے چین وہاں ترقیاتی کام کررہا ہے - چین اور برما کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم پر پاکستان کا عالم اسلام کا اور پاکستان کی اسلامی جماعتوں کا کیا ردعمل رہا؟ شاہ نواز صاحب اس بارے میں امت کی راہنمائی فرمائیں کہ یہ سب کیا سیاست ہے؟ ترکی اور سعودی عرب نے چین میں مسلمانوں پر ظلم کے خلاف UNO میں کوئی قرداد پیش کی؟ بھارت وہی کررہا ہے جو چین نے اور برما نے اور شام نے کیا ہم سب کیوں خاموش رہے تب عالم اسلام کی فوج کے سربراہ راحیل شریف سے کسی نے جہاد کا مطالبہ کیوں نہیں کیا؟ جب اسلامی فوج سے مطالبہ جہاد نہیں کیا جارہا تو پاکستانی قومی ریاست سے جہاد کا مطالبہ ایک غیر آئینی مطالبہ ہے دوسرے معنوں میں غیر اسلامی مطالبہ ہے کیونکہ تمام مذہبی جماعتوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ 1973ء کا آئین عین اسلامی ہے تو اسلامی آئین کی شق 245 میں دفاع کا ذکر ہے جہاد کا نہیں لہذا جہاد کا مطالبہ اس آئین کی روشنی میں غیر اسلامی ہے اور غیر آئینی بھی شاہ نواز صاحب فرمائیں کہ وہ

اس معاملے میں کیا کہتے ہیں؟

۱۲۔ 1980ء میں افغان روس جنگ کے موقع پر ریاست نے مذہبی جماعتوں کی جانب سے اعلان جہاد کی سر پرستی کی اور پاکستان سے جانے والے نجی مجاہدین کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی اسی طرح لشکر طیبہ، جماعت الدعوۃ اور جیش محمد کے مسعود اظہر اور پروفیسر حافظ سعید صاحب کی سر پرستی گئی۔ مسعود اظہر اور ان کی جماعت کو تین مرتبہ بھارت کی جانب سے دہشت گرد قرار دینے کی قرارداد کو چین نے ویٹو کیا حیرت کی بات یہ ہے کہ ریاست نے جیش محمد اور جماعت الدعوۃ کو خود ہی دہشت گرد قرار دے دیا۔ ایران نے آج تک یمن کے حوثی باغیوں، شام میں جنگ کرنے والے ایرانی فدائین اور حزب اللہ کو کبھی دہشت گرد تنظیم قرار نہیں دیا اور کبھی ان کی حمایت سے ہاتھ نہیں اُٹھایا ہم تو ایران جیسی جرات کا مظاہرہ کرنے سے قاصر ہیں شاہ نواز صاحب اس سلسلے میں قوم کی راہنمائی فرمائیں کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ ہم کون ہیں؟ کیا کرر ہے ہیں؟ ہم اتنے منتشر اور بکھرے ہوئے کیوں ہیں؟

۱۳۔ کیا شاہ نواز صاحب اس بات سے واقف نہیں کہ عالم اسلام اور بہت سے اسلامی مفکرین شعوری وغیر شعوری طور پر ژی ژیک کی طرح ہیگل کے جدلیاتی تصور Dilectical Idea سے متاثر ہیں۔ ہیگل کہتا ہے کہ ہر آنے والا دور پچھلے دور سے بہتر ہوتا ہے ہر عہد کا ایک اپنا سچ ہوتا ہے جو صرف اس دور کے لیے ہوتا ہے دوسرے معنوں میں سچ تاریخ کی پیداوار ہے یعنی اسیر تاریخ ہوتا ہے اس اصول کے تحت کوئی کسی کا مخالف دشمن نہیں رہ سکتا۔ تاریخ کے سفر میں —— تاریخ کے بہاؤ میں آخر کار سب بہہ جاتے ہیں سب مذاہب سب مخالف ایک ہی ہو جائیں گے۔ مستقبل میں سب ایک راستے ایک الحق ایک سچ کی طرف گامزن ہوں گے لیکن یہ تمام اسلامی مفکرین یہ بھول گئے ہیں کہ اسلام کا ایک اصول کسی حالت میں Westren Dilectical Discourse میں سمویا نہیں جا سکتا — یہ اصول یہ عقیدہ جہاد ہے جو اسلام کی چوٹی ہے اسلامی علمیت ارادہ عقیدے مابعد الطبیعات کی روح، عطر، اور خلاصہ ہے کیوں کہ جہاد کسی Critical Thinking کا نام نہیں۔ جہاد الیکشن لڑنے، جہالت ختم کرنے، تعلیم پھیلانے، غربت ختم کرنے

، کرپشن ختم کرنے، مکھی مچھروں کو مارنے کی مہم چلانے کا نام نہیں۔ جہاد معرکہ حق و باطل ہے یہ خیر و شر کی جدو جہد ہے یہ ایمان و کفر کا معرکہ ہے یہ اللہ کے بندوں اور شیطان کے حواریوں کی ابدی جنگ ہے جہاد کا مطلب اسلام اور اسلام کا حقیقی مطلب جہاد کے سوا کچھ نہیں۔ جہاد کے عقیدے کے بغیر اسلام نہیں ___ اسی لیے جہاد کا خاتمہ کرنے کے لیے مرزا غلام احمد کو پیدا کیا گیا اور عہد حاضر کے مرزائی جاوید غامدی نے اپنی کتاب میزان میں اعلان کیا ہے کہ عیسائیوں، یہودیوں، کافروں کے خلاف جنگ کا حق صرف رسول اللہ ﷺ کو تھا آپ ﷺ کے وصال مبارک کے بعد یہ جہاد قیامت تک ختم ہو گیا۔

۱۴۔ شاہ نواز صاحب کو یہ پتہ نہیں کہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں نے 2013ء میں لاہور میں مشترکہ اعلامیہ تیار کیا جسے سراج الحق صاحب نے جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع میں پڑھ کر سنایا اس میں یہ کیوں لکھا گیا تھا کہ تمام اسلامی عالمی تحریکیں صرف اور صرف پُرامن جمہوری جدو جہد پر یقین رکھتی ہیں۔ اس اعلامیے کا کیا مطلب تھا؟ جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل اور بعد میں امیر جماعت اسلامی مقرر ہونے والے سید منور حسن نے حافظ موسیٰ بھٹو کے نام اپنے خط میں تحریر کیا تھا کہ دنیا کہ ہر حصے میں جہاں جہاں بھی جہاد ہو رہا ہے جماعت اسلامی کے لوگ اس میں حصہ لے رہے ہیں (خط کتاب میں شائع ہو چکا ہے) تو ہمارا سوال صرف یہ ہے کہ جب عالمی، استعماری طاقتوں کے خلاف عالمی اسلامی تحریکوں نے جہاد کو تشدد قرار دیا تشدد سے اعلان برات کیا اور صرف پرامن جدو جہد کو اپنا راستہ بتایا تو وہ لوگ جو جہاد میں اپنی جانیں قربان کر رہے تھے ان لوگوں پر مجاہدین پر اور ان کے لواحقین پر اس اعلان سے کونسی شب ستم نازل ہوئی ہوگی؟ جب عالمی اسلامی تحریکیں ہی جہادی جدو جہد کو پرتشدد کہہ رہی ہیں اور جہاد سے رجوع کر کے پرامن جدو جہد کو اصول کے طور پر قبول کر رہی ہیں تو پاکستانی ریاست سے جہاد کا مطالبہ کیا معانی رکھتا ہے ؟ اسلامی تحریکوں کے اس اعلامیے میں ردعمل کی پرتشدد تحریکوں اور حقیقی جہادی، انقلابی، احیائی، اسلامی تحریکوں کے درمیان کوئی فرق تک بیان نہیں کیا گیا ___ ایک عمومی بیانیے [General Narrative] کے ذریعے تمام جہادی تحریکوں کو شعوری یا غیر شعوری پر غلط قرار دے دیا گیا۔ شاہ نواز صاحب اس فیصلے کو غلط سمجھتے ہیں یا

ان تحریکوں کی اجتہادی غلطی یا ایک نئی حکمت عملی تا کہ نئی جہادی جدو جہد کے لیے صفوں کو از سر نو منظم کیا جائے ؟

۱۵۔ شاہ نواز صاحب نے باجوہ صاحب کا وہ بیان نہیں پڑھا جو سندھ کے نوجوانوں کے GHQ کے دورے پر شائع ہوا۔ باجوہ صاحب نے کہا کہ پاکستان کا مستقبل جمہوریت اور میرٹ سے ہی وابستہ ہے خود کو ایمان داری سے نہ دیکھا گیا تو کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا انہوں نے کہا کہ جب میں امریکہ گیا تو کہا گیا کہ آپ کی فوج نے بہت اچھا کام کیا ملک سے دہشت گردوں کا خاتمہ کیا [جنگ کراچی ۴ ستمبر ۲۰۱۹ء] سوال یہ ہے کہ دہشت گردوں کو ہم کیوں پیدا کرتے ہیں؟ پاکستان کے شروع کے ایام میں بلوچستان میں ریاست کے خلاف بغاورت ہوئی جو کچل دی گئی، ریاست قلات ناراض ہوئی بھٹو دور میں - بلوچ پہاڑوں پر چلے گئے مشرف دور میں بگٹی کے قتل کے بعد بلوچستان میں پھر ریاست کے خلاف بغاوت ہوئی بھٹو کی پھانسی کے بعد سندھ پی پی اور قوم پرستوں کی بغاوت کا نشانہ رہا۔ جہادی تحریکیں فوج کی حامی تھیں پھر اچانک ان میں سے کچھ گروہ فوج سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے ان سے معاہدے ہوئے اور جنگیں ہوئیں نواز شریف کارگل کے بعد ریاست کے خلاف کھڑے ہو گئے کراچی میں مہاجرین ریاست سے جنگ لڑ رہے ہیں تحریک لبیک یا رسول اللہ ریاست کی باغی ہو گئی مشرقی پاکستان نے ریاست سے بغاوت کی اور الگ ہو گیا۔ پشتون قومی مومنٹ پٹھانوں کے تحفظ کے لیے ریاست سے لڑنے کے لیے نکل آئی ۔ پاکستان کا ہر صوبہ ہر قوم ریاست سے لڑنے پر آمادہ ہے ___ شاہ نواز صاحب باجوہ صاحب کے بیان کی روشنی میں ان سوالوں کے جواب دیں جو ہم نے تاریخ پاکستان سے ان کی خدمت میں پیش کیے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کا جہاد صرف داخلی ہے خارجی نہیں کیا یہ بات درست ہے؟

۱۶۔ شاہ نواز صاحب، اوریا مقبول جان صاحب اور طارق جان صاحب بیس سال سے لبرل اور سیکولر مفکرین سے صرف ایک نکتے پر لڑ رہے ہیں کہ بانی پاکستان کیسا پاکستان چاہتے تھے لبرل سیکولر عناصر گیارہ اگست 1947ء کی تقریر اور چند دوسرے بیانات پیش کر کے ثابت کرتے ہیں کہ قائد اعظم ایک سیکولر لبرل آئین

پاکستان چاہتے تھے گیارہ اگست کی تقریر اس کی تائید کرتی ہے اور لیاقت نہرو پیکٹ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ شاہنواز صاحب، اوریا صاحب اور قائداعظم کی کئی تقریروں کے اقتباسات سے ثابت کر دیتے ہیں کہ بابائے قوم صرف اور صرف اسلامی پاکستان چاہتے تھے ظاہر ہے دونوں طرف سے جو دلائل پیش کیے جا رہے ہیں وہ صداقت پر مبنی ہیں دونوں جانب قائداعظم کے بیانات ہی استدلال کی بنیاد ہیں۔

ادارہ مطالعہ تاریخ پنجاب کے زاہد حسین کی مرتبہ کتاب ''پاکستان میں ملائیت اور فرقہ واریت کا آغاز'' میں قائداعظم کی بعض ایسی تقریروں کے حوالے موجود ہیں جو جہاد اور اسلام سے متعلق بالکل نئے حوالے ہیں اس کتاب میں قائداعظم کی گیارہ ستمبر کی تقریر کے خلاف مونا شبیر احمد عثمانی صاحب کا ایک تفصیلی بیان بھی موجود ہے۔ قائداعظم مسلم لیگ کا نام بدلنا چاہتے تھے مگر شدید مخالف کے باعث وہ نام بدل نہ سکے کشمیر پر حملے کا خطرہ پیدا ہوا تو انھوں نے یونیورسٹی گراؤنڈ پنجاب کی تقریر میں پوری قوم کو جہاد کی دعوت دی۔ زاہد حسین کا استدلال یہ ہے کہ قائداعظم کے وہ بیانات جو مذہب کے حق میں - اسلام اور جہاد کی حمایت میں دیئے گئے وہ ملاؤں کی طاقت سے خوف کے باعث دیئے گئے۔

ہمارا سوال شاہ نواز صاحب، اوریا صاحب، اور طارق جان صاحب سے صرف یہ ہے کہ ہمارے لیے حجت قطعی ___ محمد علی جناح ہیں یا ہمارے قائداعظم خاتم المعصومین ختمی مرتبت رسالت مآب ﷺ ہیں ___ ہم قرآن سنت حدیث کے احکامات ماننے کے پابند ہیں یا قومی ریاستوں کے قائداعظم کے اقوال کے پابند ہیں؟ قائداعظم کے اقوال کو رسالت مآب ﷺ کے احکامات کی روشنی میں پرکھا جائے گا یا قائداعظم کے اقوال ہی حجت اور نص صریح ہیں یہ بحث ہی بے فائدہ، بے کار اور لاحاصل ہے کہ قائداعظم کیا چاہتے تھے اصل بات یہ ہے کہ اللہ، اللہ کا رسول ﷺ اور مسلمان کیا چاہتے ہیں۔

ان تینوں محترم و مکرم حضرات سے ہمارا سادہ سا سوال ہے کہ اگر یہ تینوں حضرات ترکی کے شہری ہوتے تو کیا وہ ترکی میں سیکولرازم کی حمایت میں مضامین لکھتے کہ ترکی کے قائداعظم سیکولرازم، لبرل ازم، اور جدیدیت چاہتے تھے ظاہر ہے یہ تینوں صاحبان ایمان ترکی کے قائداعظم کے اقوال کو رد کر دیتے اور ترکی کو ایک اسلامی

امارت، خلافت، دولت میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ۔ اس قسم کے مباحث کے نتیجے میں — قرآن اور سنت ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور قائداعظم کے بشری بیانات جو اغلاط اور خطاؤں سے پُر ہیں نص صریح کا درجہ پا لیتے ہیں بحث کا یہ منہاج سیکولر ہے ۔ اور ہمارے اسلامی مفکرین اسلام پر کامل یقین اعتبار اور اعتماد کے باوجود سہواً اس سیکولر منہاج کو رواج دینے — میں مصروف ہیں ایک مسلمان کے لیے حجت، نص صریح، حکم قطعی صرف اللہ اور اسکے رسول اور امت کے اجماع سے ثابت حکم ہے اس کے سوا ہر فرد کا حکم ، بیان، چار ماخذات دین کی روشنی میں پرکھا جائے گا اور اسی کی روشنی میں قبول ورد ہوگا — یہ امت پاکستان میں اور پوری دنیا میں اسلام چاہتی ہے اور یہاں اسلام ہی کو غالب کرنا مقصود اور مطلوب ہونا چاہیے لہذا اس بحث کا کامل انحصار قائداعظم کے اقوال پر رکھنا غلط طریقہ ہے۔

کم سنی کے نکاح کے مسئلے پر بیرسٹر اعتزاز احسن اور عدنان کاکاخیل صاحب کے جنگ میں شائع ہونے والے مضامین کا منہج بھی یہی ہے جس کا شکوہ ہم اوپر کر چکے ہیں — یعنی سیکولر منہج — سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کم سنی کا نکاح ایک غیر اسلامی اصطلاح ہے یہاں اسلامی اصطلاح استعمال کی جائے پاکستانی قوانین میں بالغ اور نابالغہ کی شرعی اصطلاح استعمال کرنے کی بجائے کمسنی کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے مغرب کے تمام ممالک میں کم سن زنا کاری کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ ان کی مقرر کردہ Age of Consent میں پہنچ جائے ___ اسلام میں زنا نہیں ہو سکتا نکاح سکتا ہے۔

ملالہ یوسفزئی جو ایک بالغ عورت تھی اسے بھی لبرل میڈیا نے ایک کم سن بچی کے طور پر پیش کیا اعتزاز احسن اور عدنان کاکاخیل صاحب نے قائداعظم کے اقوال سے ہی اپنا مقدمہ مزین کیا ۔ ایک نے کہا کہ بابائے قوم کم سنی کی شادی کے خلاف تھے دوسرے نے کہا کہ وہ کمسنی کی شادی کے حامی تھے اور ثبوت یہ پیش کیا کہ بابائے قوم نے خود کم سن لڑکی سے شادی کی ۔ بحث کا یہ منہج سیکولر، دنیاوی اور بالکل غلط ہے۔

نکاح کا تعلق بالغ، بلوغت اور ولی سے ہے بالغہ اور غیر بالغہ کے نکاح کی شرائط مختلف ہیں اعتزاز احسن سیکولر لبرل منہاج علمی میں کھڑے ہو کر اعتراض کر رہے ہیں اور عدنان صاحب بھی اسلامی منہاج علمی کو استعمال

کرتے ہیں کہیں سیکولر لبرل منہاج اور قائداعظم کے اقوال کو استعمال کرتے ہیں ۔ علمی دنیا میں یہ غیر علمی رویہ ہے۔ سائنس کے ایک منہاج کی دلیل دوسرے منہاج میں معتبر نہیں ہر مناہج کی دلیل الگ ہوتی ہے فلسفے میں ایک مکتب فکر میں کھڑے ہو کر آپ اس کے مخالف دوسرے مکتب فکر کی دلیل استعمال نہیں کر سکتے دو متضاد مخالف مناہج علمی کو سائنس اور فلسفے میں اکھٹا کرنا غیر علمی کام سمجھا جاتا ہے۔ دینیات اور فلسفے میں اس رویے کو اصطفائیت Electicism کہتے ہیں یہ رویہ ان فلاسفہ میں پایا جاتا ہے جن میں ذہنی اپج کی کمی ہو۔ سائنس میں دو مختلف اور متضاد منہاج [Paradigm] کو ملانے کا رویہ Idea of Incommensureability کہلاتا ہے۔

کوہن کے مطابق [Thomas S.kuhn] کے مطابق سائنس کے ایک منہاج [Paradigm] سے دوسرے منہاج [Paradigm] میں منتقلی کی کوئی عقلی دلیل نہیں دی جا سکتی۔ دوسرے معنوں میں ایک منہاج [Paradigm] کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کرنے کا عمل ایسا ہی ہے جیسے کوء ایک شخص ایک مذہب کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کر لے۔ چامر [A.F.Chalmers] اپنے انداز میں کوہن کا موقف یوں بیان کرتا ہے:

> The Change of allegiance on the part of individual scientists from one paradigm to an incompatible is likended by Kuhn to a "gestalt switch" or a "religious conversion".There will be no purely logical argument that demonstrates the superiority of one paradigm over another and that thereby compels a rational scientist to make th e change.
>
> (A.F.Chalmers,What is thing called Science? p.96)

ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے اکثر مسلم مفکرین اور بعض علماء بھی جوشِ خطابت میں یہی کام انجام دے رہے ہیں امید ہے شاہ نواز فاروقی صاحب ان مباحث کو اپنے موثر اور سادہ پیرائے میں عام فہم بنا کر دینی حلقوں کی راہنمائی فرمائیں گے۔

۱۷۔ شاہ نواز صاحب ریاست سے قطعی جہاد کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن اپریل 2019ء میں مفتی منیب الرحمان صاحب کے کالم کے مطابق ___ مفتی تقی عثمانی صاحب اسی ریاست کے دو بڑے لوگوں کی موجودگی میں یہ سوال اٹھا رہے تھے کہ ریاست ہمیں بتا دے کہ ہم علماء کون ہیں اور ریاست کی نظر میں ہماری حیثیت کیا ہے ہم دہشت گرد ہیں؟ اصلاح کرنے والے ہیں ؟تعلیم دینے والے ہیں؟ کون ہیں ہم؟ جس ریاست میں علماء کی حیثیت کا تعین ستر سال سے نہیں ہو سکا شاہ نواز صاحب اس ریاست میں جہاد کا مطالبہ کیسے کر رہے ہیں؟ اسلام شریعت اسلامی احکامات کے نفاذ اور نفوذ کی واحد ایجنسی پوری اسلامی تاریخ میں صرف علماء ہی رہے ہیں۔ شاہ نواز صاحب صرف یہ بتا دیں کہ پاکستانی ریاست میں علماء کہاں کس ادارے میں ہیں ایجنسی کے بغیر شریعت کا نفاذ اور اطلاق کیسے ہو سکتا ہے ریاست سے جہاد کا مطالبہ کرنے سے پہلے اس اسلامی حکومت میں علماء کو وہ مقام و مرتبہ حاصل ہونا چاہیے جو خلافت عثمانیہ تک علماء کو حاصل تھا شاہ نواز صاحب نے اس موضوع پر امت کی راہنمائی نہیں کی آخر کیوں؟

۱۸۔ چین اور سعودی عرب میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر مذہبی اور دیگر اسلامی مفکرین کچھ نہیں لکھ رہے اس کی کیا وجہ ہے؟ سعودی عرب کا لبرل ازم سیکولر ازم توحید کے ماننے والوں کو کیوں نظر نہیں آ رہا — سعودی عرب میں کیا ہو گیا ہے اور کیا ہو رہا ہے یہ امت کا مسئلہ ہی نہیں ہے اس قدر عظیم تغیر پر خاموشی کے کیا معنی ہیں پاسبان حرم — حرم کی علمیت، مقصدیت اور عقیدے سے دست بردار ہو رہا ہے اور امت خاموش ہے؟ آخر کیوں؟ سرزمین حرم سے لبرل ازم کی حمایت کا مطلب کیا اسلامی علمیت کا صریح انکار نہیں ہے؟ وہاں علماء کرام کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اسلامی تحریکوں کا ردعمل صرف خاموشی کیوں ہے؟ شاہ نواز صاحب اس مسئلے پر بھی اسلامی تحریکوں کی راہنمائی کریں۔

۱۹۔ مسئلہ کشمیر 1965ء کے بعد پہلی مرتبہ 51 سال کے بعد 2019ء میں UNO میں اُٹھایا گیا ہے یہ ہمارا رویہ ہے بھارت نے 1971 میں انٹرنیشنل لائن آف کنٹرول کو عبور کر کے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا مکتی باہنی کی عسکری جدوجہد کی عسکری حمایت کی پاکستانی فوج کو عبرت ناک شکست دی ایک لاکھ فوجیوں کو قیدی بنایا ___ جب بھارت بغیر کسی وجہ کے ہمارے ملک پر حملہ کر کے ملک چھین سکتا ہے تو مسئلہ کشمیر میں ہم انتظار کیوں کر رہے ہیں شاہ نواز صاحب نے اپنے مضمون میں جہاد کشمیر 1948ء جو شاید نجی جہاد تھا اور 1971ء میں بھارت کے حملے کو موضوع سخن ہی نہیں بنایا آخر کیوں؟

۲۰۔ ہمارا سوال شاہ نواز صاحب سے یہ بھی ہے کہ ایران، سعودی عرب، پاکستان، شام، ترکی، سب کا نشانہ باغی مسلم گروہ ہی کیوں ہوتے ہیں کفار کے خلاف جنگ کیوں نہیں ہوتی جنگ اسلامی ملکوں سے ہی کیوں لڑی جاتی ہے برنارڈ لیوئس نے لکھا ہے کہ اسلامی تاریخ میں تمام امارات، خلافتیں، بادشاہتیں جہاد کے لیے دارالحرب کی طرف کوچ کرتیں تھیں ان کا مرکز، ہدف اسلامی مما لک نہیں کفار ہوتے تھے۔ جدید قومی ریاستوں نے یہ ہدف کیوں بدل دیا؟ اسلامی مما لک کی فوجیں اپنے ہی ملکوں کو تسخیر و فتح کرنے میں کیوں مصروف ہیں؟ کفار ان سے کیوں محفوظ ہیں؟

۲۱۔ مختلف اسلامی جماعتوں اور جماعت اسلامی نے جہاد کشمیر کی دلیل قرآن میں سورہ النساء کی ایک آیت سے دی ہے کہ اللہ تم سے پوچھے گا کہ تم نے مظلوم مسلمانوں کی مدد کیوں نہیں کی؟ سوال یہ ہے کہ اگر دلیل قرآن کی یہی آیت ہے تو کیا قرآن کی اس آیت میں مسلمان سے مراد صرف کشمیر کے مسلمان ہیں یا چین، برما، فلسطین، یمن، سری لنکا، کردستان، بوسنیا، روس، افغانستان، کے مسلمان اس آیت میں شامل ہیں یا نہیں ___ جہاد کو صرف علاقائی، قومی، رنگ دینا کیا قرآن کا تقاضہ ہے یا ان مذہبی جماعتوں کی اجتہادی غلطی؟

۲۲۔ پیغام پاکستان میں کہا گیا کہ جہاد صرف ریاست کرے گی کوئی گروہ فرد نہیں یعنی جہاد کا فتویٰ بھی ریاست ہی دے گی لیکن 5 اگست کے مسئلہ کشمیر کے بعد تحریک لبیک پاکستان و دیگر جماعتیں کشمیر کے جہاد

کا فتوی دے رہی ہیں اور مسلسل جہاد کا اعلان کر رہی ہیں لیکن ریاست کسی سے نہیں کہہ رہی کہ تم کون ہو فتوی دینے والے؟ جہاد فرد، جماعت، گروہ نہیں ریاست کرے گی تم سب خاموش رہو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ نجی جہاد جو ریاست کے مفاد میں اس پر ریاست کو اعتراض نہیں ہوتا شاہ نواز صاحب اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

تاریخ اجراء ۷ ستمبر ۲۰۱۹ء

مقالاتِ جامعی

جلد پنجم

مرتبہ

ڈاکٹر محمد علی جنید

کرف

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش